تحریکِ آزادئ ہند

اور

مُسلمان

حصہ دوم

جو مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم اور اضافہ پر مشتمل ہے

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ای، شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور (پاکستان)

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

میری اس کتاب کا حصہ اول اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے جو در اصل تین اجزاء پر مشتمل تھا۔

۱۔ پہلے وہ مضامین جو ۱۹۳۷ء میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول" کے نام سے ابتداءً شائع ہوئے تھے اور پھر ایک مدت تک اسی نام سے کتابی صورت میں شائع ہوتے رہے۔

۲۔ وہ مضامین جو میں نے ۱۹۳۸ء میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم" کے نام سے شائع کیے تھے اور وہ بھی ایک مدت تک اسی نام سے شائع ہوتے رہے۔

۳۔ میری کتاب "مسئلہ قومیت" کے بعض حصے جو ۱۹۳۹ء میں لکھے گئے تھے۔ ان سب کا موضوع ہندوستان کے مسلمانوں کو ان خطرات سے آگاہ کرنا تھا جو ملک کے تمام باشندوں کو ایک قوم فرض کر کے ایک لادینی جمہوری قومی ریاست میں ضم کر دینے سے ان کے دین، ان کی تہذیب اور ان کی انفرادیت کو لاحق ہو سکتے تھے۔ اگرچہ اب وہ دور گزر چکا ہے اور حالات بدل گئے ہیں، لیکن بہرحال ان مضامین کی ایک تاریخی اہمیت تھی، اس لیے ان کو "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" حصہ اول کے نام سے از سر نو شائع کیا گیا۔

اب اسی کتاب کا یہ دوسرا حصہ شائع کیا جا رہا ہے جو دو اجزاء پر مشتمل ہے،

۱۔ پہلے وہ مضامین جو مئی ۱۹۳۹ء سے اپریل ۱۹۴۱ء تک لکھے گئے تھے اور مسلمان اور موجودہ

سیاسی کشمکش حصہ سوم کے نام سے اُسی زمانے میں شائع ہو چکے تھے۔ ان میں سے ہر مضمون کی تاریخ اشاعت درج کر دی گئی ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کیا بات کن حالات میں کہی گئی تھی۔

۲۔ وہ مضامین جو سیاسی کشمکش حصہ سوم کی اشاعت کے بعد اسی موضوع سے تعلق رکھنے والے مسائل پر ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک لکھے گئے۔ یہ سب مضامین اگرچہ رسالہ ترجمان القرآن میں اپنے اپنے وقت پر شائع ہوتے رہے تھے لیکن ان کو کہیں یکجا مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ اب پہلی مرتبہ ان کو مرتب کر کے اس کتاب میں ان کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اور ان میں سے بھی ہر مضمون کی تاریخ اشاعت درج کر دی گئی ہے تاکہ ہر بات کو اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا اور سمجھا جا سکے۔

چونکہ یہ مضامین ———— خصوصاً اس کتاب کے جزو اول کے مضامین ———— برسوں سے میرے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے کے لیے خوب خوب استعمال ہوتے رہے ہیں اور ان کی عبارتوں کو سیاق و سباق سے الگ کر کے عجیب عجیب معنی پہنائے جاتے رہے ہیں، اس لیے میں نے ترتیب و نظر ثانی کے وقت ان کی عبارات میں کوئی تغیر نہیں کیا ہے۔ اگر کسی چیز کی تشریح کرنے یا کسی چیز کا اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو اسے حاشیہ کی صورت میں درج کیا ہے۔ اور قدیم و جدید حواشی کے درمیان فرق کرنے کے لیے قوسین میں قدیم یا جدید کے الفاظ لکھ دیے ہیں، تاکہ کوئی غلط فہمی بھی پیدا نہ ہو اور کوئی یہ بھی نہ کہہ سکے کہ معترضین کے اعتراضات سے بچنے کے لیے عبارتوں میں رد و بدل کر دیا گیا ہے۔

یہ بھی ایک تاریخی دستاویز ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ میں ۱۹۳۹ء سے تقسیم ہند کے وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں سے کیا کہتا رہا ہوں، اور تقسیم کے بعد پاکستان کے مسلمانوں کو میں نے اسلام کے اصل نصب العین کی طرف توجہ دلانے کے لیے ۱۹۴۷ء میں کس طرح اپنی کوششوں کا آغاز کیا۔ نیز گزشتہ دس سال کے دوران میں پیش آنے والے حالات کو نگاہ میں رکھ کر ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ جو کچھ میں نے اس

وقت لکھا تھا وہ حق تھا یا نہیں۔ معترضین کے پیش کردہ اقتباسات، جو زیادہ تر سیاق و
سباق سے الگ نکال کر اور مسئلہ کی سیاق کو بھی نظرانداز کر کے پیش کیے گئے ہیں، کسی
شخص کو صحیح اور منصفانہ رائے قائم کرنے میں مدد نہیں دے سکتے۔ میری اصل جلدیں
پوری تاریخی ترتیب کے ساتھ بے کم و کاست اس کتاب میں ناظرین کے سامنے موجود
ہیں۔ انہیں پڑھیں اور جو رائے قائم کرنا چاہیں کریں۔

لاہور
یکم نومبر ۱۹۷۲ء

ابوالاعلیٰ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مقدمہ طبعِ اوّل

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے میرے مضامین کے دو مجموعے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔[1] اب اسی سلسلہ کا یہ تیسرا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ بظاہر پہلے دونوں مجموعوں سے اس تیسرے مجموعہ کا اختلاف اتنا زیادہ ہے کہ ایک شخص پہلی نظر میں یوں محسوس کرے گا کہ میں نے حصہ دوم کے بعد سے یکایک اپنی پوزیشن بدل دی ہے اور خود اپنی بہت سی کہی ہوئی باتوں کی تردید کرنے لگا ہوں۔ لیکن دراصل ان تینوں مجموعوں میں ایک نصب العین کی طرف تدریجی ارتقاء ہے جس کی توضیح یہاں کر دینا چاہتا ہوں تاکہ ناظرین کو کسی قسم کا خلجان پیش نہ آئے۔

یہ بات تھوڑے سے غور و تامل سے ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ایک پرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کا کام کسی نئی تحریک کی ابتداء کرنے کی بہ نسبت زیادہ دشوار اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ نئی تحریک پیش کرنے والے کا راستہ تو بالکل صاف ہوتا ہے۔ اُسے صرف اُن لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے جو

---

[1] اب یہ دونوں مجموعے "تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان" حصہ اوّل کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ "مسئلہ قومیت" مستقل کتاب کی صورت میں بھی مل سکتی ہے (جدید)

اُس تحریک سے بیگانہ ہوتے ہیں، اُس کو محض اپنے اصول و مقاصد کی تبلیغ کرنی ہوتی ہے۔ پھر یا تو لوگ اُس کی دعوت کو رد کر دیتے ہیں یا قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن جو کسی پرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنا چاہے اُس کے لیے صرف یہی ایک کام نہیں ہوتا کہ بیگانوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرے، بلکہ اسے یگانوں پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ وہ اُن لوگوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا جو پہلے سے اُس تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں اور بہر حال بیگانوں کی بہ نسبت اُس سے قریب تر ہیں۔ اُس کو سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انحطاط کا عمل اُن کے اندر کہاں تک ہو چکا ہے اور اصل تحریک کا اثر کس حد تک اُن میں باقی ہے۔ پھر اُسے یہ فکر کرنی پڑتی ہے کہ جس حد تک بھی وہ دُور نکل گئے ہیں اس سے آگے نہ جانے پائیں، اور جو کچھ اثر اُن کے اندر باقی ہے وہ محفوظ رہے۔ اُن کی حیثیت اُس تحریک کے حق میں بالکل اُس سرمایہ کی سی ہوتی ہے جو کسی شخص کے پاس بچا کھچا باقی رہ گیا ہو، اور ظاہر ہے کہ ایک عقلمند آدمی کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ جو کچھ اس کا ہے وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ لہٰذا اس کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ اس تحریک کے ساتھ لوگوں کی وابستگی جیسی کچھ بھی سردست ہے اُس کو کم از کم اُسی حد پر برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور اس کو مزید اضمحلال سے روکے۔ تحفظ کی اس تدبیر میں کسی حد تک کامیاب ہو جانے کے بعد اس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ انہیں موجودہ حالت پر نہ ٹھیرنے دے بلکہ اصل تحریک کی طرف ان کو کھینچنے کی کوشش کرے اور کسی دوسری چیز کو ان کا نصب العین اور ان کی کوششوں کا مرکز و محور نہ بننے دے۔ اتنے مرحلوں سے گزر کر پھر کہیں اس کے لیے دعوتِ عام کا موقع آتا ہے اور وہ اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے ایک نئی تحریک پیش کرنے والے کا کام شروع ہوتا ہے۔

چونکہ میرے پیشِ نظر تحریکِ اسلامی کا احیاء ہے اس لیے مجھے بھی اُسی تدریج کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرنی پڑی ہے جس کی طرف اوپر

اشارہ کیا گیا ہے۔ "ترجمان القرآن" کی زندگی کے ابتدائی چار سال اس کوشش میں صرف ہوئے کہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں گمراہی کی جو جو شکلیں پیدا ہو گئی ہیں ان پر گرفت کی جائے اور اسلام سے جو روز افزوں بُعد ان میں پیدا ہو رہا ہے اُسے روکا جائے۔[1] ابھی یہ کوشش جاری تھی کہ ۱۹۳۷ء میں یکایک یہ خطرہ سامنے آ گیا کہ ہندوستان کے مسلمان کہیں اُس وطنی قومیت کی تحریک کے شکار نہ ہو جائیں جو آندھی اور طوفان کی طرح ملک پر چھائی چلی جا رہی تھی۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ہم موجودہ ظالمانہ نظام حکومت[2] کے خواہ کتنے ہی مخالف ہوں، اور ہمارے دل میں اس کے پنجے سے نکلنے کی خواہش چاہے کانگریسی حضرات سے بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، مگر ہم کسی طرح بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ جو لوگ اس وقت تک تھوڑے یا بہت اسلام کے حلقۂ اثر میں ہیں اُن کو ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک اپنی رابطۂ عوام (Mass Contact) کی تدبیروں سے، اور اپنی وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کے ذریعہ سے، اور اپنے سیاسی و معاشی تفوق کے زور سے اپنے اندر جذب کر لے، اور ان کے نظریات اور ان کی زندگی کو اتنا متغیر کر دے کہ ایک دو پشتوں کے بعد ہندوستان کی آبادی میں اسلام اتنا ہی اجنبی ہو کر رہ جائے جتنا جاپان یا امریکہ میں ہے۔[3] اس خطرہ کو جس چیز نے اور زیادہ پریشان کن بنا دیا وہ یہ تھی کہ محض انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے لالچ میں مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کا ایک سب سے زیادہ با اثر طبقہ وطنی قوم پرستی کی تحریک کا معاون بن گیا اور اس نے انگریز دشمنی کے اندھے جوش میں اس چیز کی طرف سے

---

[1] میری کتاب "تنقیحات" اسی کوشش کا آئینہ ہے۔ (قدیم)

[2] مراد ہے انگریزی حکومت جو اس وقت برصغیر ہند و پاکستان پر مسلط تھی۔ (جدید)

[3] اس کا پس منظر سمجھنے کے لیے میری کتاب "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" حصہ اول ملاحظہ فرمائیں۔ (جدید)

بالکل آنکھیں بند کر لیں کہ اس تحریک کا رُخ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کس
طرح اثر انداز ہوگا۔[1] لہٰذا اس خطرے کا سدِّباب کرنے کے لیے میں نے "مسلمان اور
موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ ۳۷ء کے آخر میں اور
پھر دوسرا سلسلہ ۳۸ء کے آغاز میں شائع کیا۔ ان تحریروں میں میرے پیشِ نظر صرف یہ
چیز تھی کہ مسلمان کم از کم اپنی مسلمانیت کے موجودہ مرتبے سے نیچے نہ جانے پائیں
اور اپنے تشخّص کو گم نہ کریں۔ اس سلسلے میں میں نے ان کے "اسلامی قومیت" کا
احساس بیدار کرنے کی کوشش کی، ان کو اس جمہوری لادینی نظامِ حکومت کے خطرات
سے آگاہ کیا جو واحد قومیت کے مفروضے پر ہندوستان میں قائم کیا جا رہا تھا، ان
آئینی تحفظات اور "بنیادی حقوق" کی حقیقت واضح کی جن پر اعتماد کر کے مسلمان
اس مہلک جمہوری دستور کے جال میں پھنسنے کے لیے آمادہ ہو رہے تھے، اور ان
کے سامنے "مشابہ دارالاسلام"[2] کا نصب العین پیش کیا تاکہ کسی نصب العین کے
موجود نہ ہونے سے جو یاس اور اضمحلال کی سی پراگندگی ان کے اندر پیدا ہو گئی ہے وہ
بھی دور ہو اور ان کو نظر جمانے کے لیے ایک ایسا مطمحِ نظر بھی مل جائے جو نہ تو
اصل اسلامی سمت سے ہٹا ہوا ہو اور نہ اتنا زیادہ بلند ہو کہ اس کی بلندی کو دیکھ کر
ان کی ہمتیں پست ہو جائیں۔

اُس وقت یہ کرنے کا کام مقدم تھا اس لیے میں نے آزادی، قومیت، قومی
تہذیب، حکومتِ خود اختیاری، اقلیت و اکثریت وغیرہ کے متعلق رائج الوقت
تعریفات کے غلط ہونے پر بحث سے قصداً احتراز کیا، اور ان الفاظ کے جو مفہومات
ذہنوں میں راسخ تھے ان کو جوں کا توں قبول کر کے اُسی زبان میں گفتگو کی جس کو لوگ

---

[1] مراد ہے علماء کا وہ گروہ جو اس وقت کانگریس کا ساتھ دے رہا تھا۔ (جدید)

[2] یعنی ہندوستان اگر پورا دارالاسلام نہ بن سکے تو دارالاسلام سے مشابہ ایک ایسا ملک بن
جائے جس میں ان کا اسلامی تشخّص برقرار رہ سکے۔ (جدید)

کہہ سکتے تھے۔ اسی طرح میں نے مطلوبِ اصلی سے بحث کرنے کے بجائے حالتِ واقعی ہی تک اپنی بحث کو محدود رکھنا زیادہ مناسب سمجھا تاکہ دونوں چیزوں کو ایک وقت میں پیش کرنے سے ذہن پراگندہ نہ ہو جائیں اور ایک ہی چھلانگ میں مقصدِ بعید تک پہنچنے کی کوشش کہیں مقصدِ قریب کے بھی ہاتھ سے جانے کی موجب نہ ہو جائے۔

یہ کام جس غرض کے لیے کیا گیا تھا اللہ کے فضل و کرم سے وہ پچھلے دو تین سال میں حاصل ہو چکی ہے اور اب اس امر کا کوئی خطرہ باقی نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کسی وطنی قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دیں گے یا اپنے آپ کو کسی ایسے جمہوری نظام میں ختم کریں گے جو اس قومیت کے مفروضہ پر تعمیر کیا گیا ہو۔ یہ جو کچھ ہوا کسی انسانی کوشش سے نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہوا۔ اسی کی مہربانی سے متعدد اسباب ایسے پیدا ہوئے جن کی بدولت مسلمان اس خطرے سے بچنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس سلسلہ میں جن جن لوگوں کو اس نے تھوڑی یا بہت خدمت کی توفیق بخشی ان کے لیے فخر کا مقام نہیں بلکہ شکر کا مقام ہے۔

اس مرحلے کے طے ہو جانے کے بعد اب میرے سامنے دوسرا سوال یہ تھا کہ آیا مسلمانوں کو اسی نتیجہ پر مطمئن ہو جانے دیا جائے جو حاصل ہو چکا ہے یا ان میں مزید بے چینی پیدا کر کے انہیں اسلام کے اصل نصب العین کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی جائے؟ آیا مسلمانوں کو سیاست و اجتماع کے انہی غلط تصورات میں مبتلا رہنے دیا جائے جو مغربی جاہلیت سے انہوں نے سیکھے ہیں یا ان کے سامنے اسلام کے اجتماعی و سیاسی تصورات کو صرف علمی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ایک عملی مطمحِ نظر کی حیثیت سے بھی پیش کر دیا جائے؟ آیا مسلمانوں کو محض اپنی انفرادیت کے سنبھالنے ہی میں لگا رہنے دیا جائے یا انہیں یہ بتایا جائے کہ تمہاری انفرادیت مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک عظیم تر مقصد کے لیے مطلوب ہے؟ یہ سوال سامنے آتے ہی میرے ضمیر نے قطعی فیصلہ صادر کیا کہ پہلی شق غلط ہے اور صرف دوسری شق ہی صحیح ہے۔

چنانچہ اگر کوئی دوسرا سبب پیش نہ آتا تب بھی یہ کام کرنا ہی تھا جو میں نے کیا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے ساتھ دو مزید وجوہ ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے مجبور کر دیا کہ پچھلے مجموعہ کی اشاعت کے فوراً بعد ہی اُن مضامین کا سلسلہ شروع کر دوں جن کا مجموعہ اس وقت ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔

پہلی وجہ یہ تھی کہ اس نئی تحریک کے دَور میں عامۂ مسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبہ کے تحت اپنی قوم کے دُنیوی مفاد کے لیے کام کر رہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے اور اُس قدرِ قلیل کا بھی کوئی دخل رہنمائی میں نہیں ہے۔ یہ براہِ راست نتیجہ ہے علماء کرام کی اُس غلط سیاسی روش کا جس پر وہ ابھی تک اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔ اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی عام مسلمانوں کا اعتماد علمائے دین سے ہٹ کر اس شدت کے ساتھ غیر دیندار اور ناواقفِ دین رہنماؤں پر نہیں جاتا تھا۔ میرے نزدیک یہ صورتِ حال اسلام کے لیے وطنی قومیت کی تحریک سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں[1]) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر ضم ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رَل مِل جائے۔[2]

---

[1] یہ اُس وقت کی کیفیت تھی جب یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ (جدید)

[2] یہ بات جب لکھی گئی تھی تو لوگوں کو بہت ناگوار ہوئی تھی۔ لیکن اب ۱۹۶۰ء کے پاکستان میں جو حالت ہے اسے سب دیکھ رہے ہیں۔ (جدید)

دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے اس تحریک کے اندر داعیۂ دینی کے بجائے داعیۂ قومی کو بہت زیادہ کارفرما دیکھا۔ اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں، لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جُز آتا کم اور قوم پرستانہ جُز اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ صدیہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولتمند مسلمان اینگلو انڈین طوائفات کے ہاں جاتے ہیں حالانکہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں! اس حد کمال کو پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری برتنا میرے نزدیک گناہ عظیم ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ مستحکم جماعتی زندگی پیدا کرنے کے لیے افراد میں بہرحال کوئی ایک مشترک وفاداری پیدا کرنا لازمی ہے، خواہ وہ خدا کی وفاداری ہو یا قوم کی یا وطن کی۔ اس لحاظ سے جن لوگوں کو محض جماعتی استحکام مطلوب ہے اُن کے لیے تو یہ امر کسی تشویش کا باعث نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں میں خدا کے بجائے قوم کی مشترک وفاداری سے یہ مقصد حاصل ہو، لیکن ہم خدا پر ایمان رکھنے والوں کو آخر کس زمین میں پناہ اور کس آسمان کے نیچے سر چھپانے کی جگہ ملے گی اگر ہم بھی خدا کے ان بندوں کو خدا کے بجائے کسی اور کی مشترک وفاداری پر مجتمع ہوتے دیکھتے رہیں اور کچھ نہ بولیں۔

یہ ہیں وہ محرکات جن کے تحت اس مجموعے کے مضامین لکھے گئے ہیں۔ میں نے ان مضامین میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں پر اور کہیں کہیں اُن کے لیڈروں پر بھی صاف صاف تنقید کی ہے، مگر خدا شاہد ہے کہ کسی شخصیت یا کسی پارٹی سے مجھ کو کوئی ذاتی عداوت نہیں ہے۔ میں صرف حق کا دوست اور باطل کا دشمن ہوں۔ جس چیز کو میں نے حق سمجھا ہے اس کے حق ہونے کی دلیل بیان کر دی ہے اور جسے باطل سمجھا ہے اس کے خلاف پر بھی دلائل بیان کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی

شخص مجھ سے اختلاف رکھتا ہو اور وہ دلیل سے میری رائے کی غلطی واضح کر دے تو میں اپنی رائے سے واپس لے سکتا ہوں۔ رہے وہ حضرات جو صرف یہ دیکھ کر کہ کچھ ان کی پارٹی یا ان کی محبوب شخصیتوں کے خلاف کہا گیا ہے غضبناک ہو جاتے ہیں اور پھر اس سے بحث نہیں کرتے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ حق ہے یا باطل، تو ایسے لوگوں کے غیظ و غضب کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ میں نہ ان کی گالیوں کا جواب دوں گا اور نہ اپنے طریقہ ہی سے ہٹوں گا۔

لاہور

محرم ۱۳۹۰ھ (فروری ۱۹۷۱ء) — ابوالاعلیٰ

تعارفِ مقصد

قوانینِ فطرت سب کے سب بلا استثناء دائمی و عالمگیر ہیں۔ یہ آگ جو آج سے لاکھوں برس پہلے جس قانون کی تابع تھی اسی کی تابع آج بھی ہے اور اسی کی تابع قیامت تک رہے گی۔ زمانہ کے تغیرات کا اس پر کوئی اثر نہیں۔ روشنی اور حرارت کے لیے جو قانون دنیا کے ایک حصہ میں ہے وہی دوسرے حصہ میں بھی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا کہ مشرق میں حرارت کی ماہیت و کیفیت کچھ اور ہو اور مغرب میں کچھ اور، شمال میں روشنی ایک رفتار سے چلے اور جنوب میں دوسری رفتار سے۔ اشیاء کے بننے اور بگڑنے، بڑھنے اور گھٹنے، پیدا ہونے اور فنا ہو جانے کے لیے جو قوانین مقرر ہیں ان کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے۔ ان میں کوئی رعایت، کوئی لاگ لپیٹ، کوئی جانب داری نہیں پائی جاتی۔ فطرت کا کسی کے ساتھ کوئی پیار رشتہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ وہ کسی کی دوست اور کسی کی دشمن نہیں۔ کسی پر مہربان اور کسی پر نامہربان نہیں۔ جو آگ میں ہاتھ ڈالے گا، جل جائے گا۔ جو زہر کھائے گا، مر جائے گا۔ جو غذا کھائے گا، قوت اور نشوونما پائے گا۔ فطرت کے حدودِ فرمانروائی میں یہ ممکن نہیں کہ دیا سلائی کی رگڑ سے ایک کے لیے تو آگ کا شعلہ پیدا ہو اور دوسرے کے لیے پانی کی دھار۔

انسان جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے وہ بھی اسی فطرت کا ایک رخ ہے جو ساری کائنات پر جاری ہے۔ لہٰذا انسانی فطرت کے قوانین بھی فطرتِ کائنات کی طرح دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ زمانہ کے تغیرات سے مظاہر میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جائے، حقائق میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ ظلم اور رحم میں جو فرق آج سے دس ہزار برس پہلے تھا وہی آج بھی ہے اور قیامت تک رہے گا۔ ظلم اور عدل کی جو حقیقت دو ہزار برس قبل مسیح تھی وہی دو ہزار برس بعد مسیح بھی ہے۔ جو چیز حق ہے وہ چین میں بھی ویسی ہی حق ہے جیسی امریکہ میں ہے، اور جو چیز باطل ہے وہ کالے کے لیے بھی اسی طرح باطل ہے جس طرح گورے کے لیے ہے۔ انسان کی سعادت و شقاوت اور فلاح و خسران کے لیے فطرت کا قانون قطعاً بے لاگ ہے۔ اس میں کسی شخص، کسی قوم، کسی نسل کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ اسبابِ سعادت اور اسبابِ شقاوت سب کے لیے یکساں ہیں۔ جو شقاوت کے اسباب فراہم کرے گا وہ محض اس بنا پر سعادت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا کہ اس کا تعلق کسی خاص ملک یا نسل یا قوم سے ہے، اور اسی طرح جو سعادت کے اسباب فراہم کرے گا وہ بھی محض اس بنا پر اپنے کسب کے ثمرات سے محروم نہ رکھا جائے گا کہ وہ فلاں نسل سے تعلق رکھتا ہے یا فلاں نام سے موسوم ہے۔

فطرتِ انسانی کے اسی دائمی، عالمگیر اور بے لاگ قانون ہی کا دوسرا نام "اسلام" ہے۔ اس کو انسان پر منکشف کرنے والا وہی فاطرِ کائنات ہے جس نے انسان کی اور سارے جہان کی فطرت بنائی ہے۔ یہ کسی قوم پرست کا تخیل نہیں ہے جو ساری دنیا کو اپنی قوم کے مفاد و مصالح کی نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ کسی طبقاتی لیڈر کی فکر بھی نہیں ہے جو سارے معاملات پر ایک طبقہ کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتا ہو۔ فی الجملہ یہ کسی انسان کے اجتہاد کا نتیجہ نہیں ہے کہ کسی خاص عہد، کسی خاص ماحول کا اور کسی خاص شخص یا گروہ کی دلچسپیوں کا شکنجہ ہو۔ یہ تو درحقیقت رب العالمین کی ہدایت سے ماخوذ ہے، اور رب العالمین وہ ہے جس کی نگاہ میں سب انسان

یکساں ہیں۔ وہ انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھتا ہے نہ کہ ہندی اور جرمن اور
اٹالین کی حیثیت سے، یا مزدور اور کسان اور سرمایہ دار کی حیثیت سے۔ اس کو
اشخاص اور اقوام سے دلچسپی نہیں بلکہ محض انسان سے ہے۔ اس لیے وہ دیانت،
اخلاق اور مدنیت فاضلہ کے جتنے اصول بتاتا ہے وہ سب کے سب ہر قسم کی عصبیتوں
سے پاک ہیں۔ اُن میں بحیثیت مجموعی تمام انسانوں کی فلاح و بہبود اور زندگی کے ہر
مرحلے میں ان کی کامیابی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ وہ فطرت کے تمام دوسرے قوانین کی
طرح عالمگیر ہیں۔ ان کا کسی شخص یا قوم کے ساتھ کوئی مخصوص رشتہ نہیں ہے جو کسی دوسرے
شخص یا قوم کے ساتھ نہ ہو سکتا ہو۔ جو کوئی بھی ان اصولوں کو قبول کرکے ان کے مطابق
عمل کرے گا، فلاح پائے گا، خواہ وہ ہندی ہو یا حبشی، آریہ نسل سے تعلق رکھتا ہو یا سامی
نسل سے، امریکہ میں رہتا ہو یا ایشیا میں۔ اور جو ان اصولوں سے انحراف کرے گا
نقصان اُٹھائے گا، خواہ وہ کسی پیغمبر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام کے انہی عالمگیر اصولوں پر انسانی جماعت کی تعمیر نو کرنا ہر اس شخص کا فرض ہے
جو اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے۔ اور چونکہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اس لیے یہی
ہماری تمام کوششوں کا مقصد اصلی ہے۔

مگر جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد سب سے پہلے اپنے وطن کو اور بالآخر تمام
دنیا کو دار الاسلام بنانا ہے تو اس سے ایک ناواقف آدمی اس غلط فہمی میں پڑ جاتا
ہے کہ جس طرح ہر جوشیلا قوم پرست زمین میں اپنی قوم کا غلبہ اور تسلط چاہتا ہے اسی
طرح یہ لوگ بھی اپنی قوم کو غالب اور حکمران دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی قوم
میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے "مسلمانوں کی حکومت" ان کا نصب العین بن گیا ہے۔
یہی ہندوؤں میں پیدا ہوئے ہوتے تو مونجے اور ساورکر بنتے* جرمنی میں پیدا
ہوئے ہوتے تو ہٹلر اور گوئرنگ کے مذہب میں شامل ہوتے۔ کسی اطالوی کی آغوش

* یہ دونوں اُس زمانے میں ہندوستان کے نہایت متعصب ہندو لیڈر تھے۔ (جدید)

بحث میں ہم لیتے تو سوشلزم کی صورت اختیار کرتے۔

یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ "دارالاسلام" کو "دارالمسلمین" کا ہم معنی سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ دونوں میں حقیقتہً بڑا فرق ہے۔ جو لوگ نسل کی وجہ سے "دائرۂ اسلام" میں داخل ہیں اور معاشرت کے اعتبار سے مسلمانوں میں شمار کیے جاتے ہیں، وہ اگر غیر اسلامی طریقوں پر حکومت کریں، تو ان کی حکومت مسلمانوں کی حکومت تو ضرور کہلائے گی کہ تعلق سے اس کے حکمران گروہ ہیں، مگر ایسی حکومت اسلامی حکومت ہرگز نہ ہوگی اور اس پر صحیح معنوں میں "دارالاسلام" کا اطلاق ہو سکے گا۔ حاشا وکلا، ہمارا نصب العین ایسی "مسلمان حکومت" کا قیام ہرگز نہیں ہے۔ اگر اس حیثیت سے ہم اپنی قوم کی بڑائی چاہیں، اور اگر ہمارا مقصود یہ ہو کہ محض فوجی طاقت سے مسندِ حکومت پر قبضہ کر کے زمین کی دولت اور فرماں روائی کے مزے کو اپنی قوم کے لیے مخصوص کر لیں تو خود اسلام ہی سب سے پہلے آگے بڑھ کر ہم کو ظالم اور مفسد ٹھیرائے گا کیونکہ وہ صاف کہتا ہے کہ:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔ (القصص - ۸۳)

"آخرت میں عزت کا مقام ہم نے صرف انہی لوگوں کے لیے رکھا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

دراصل جو چیز ہمارے پیش نظر ہے وہ مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ "اسلام کی حکومت" ہے۔ یعنی اسلام کی حکومت جو مجموعہ ہے دیانت، اخلاق اور خشیتِ خدا کے عالمگیر اصولوں کا۔ یہ اسلام یہودی یا کسی کے باپ دادا کی میراث نہیں ہے۔ اس کا کسی سے کوئی خاص رشتہ نہیں۔ جو ان اصولوں پر ایمان لائے اور ان پر عمل کرے وہی مسلم کہلاتا ہے۔ وہ اگر نسل کے اعتبار سے چمار یا بھنگی بھی ہو تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسندِ خلافت پر بیٹھ سکتا ہے، وہ اگر نکٹا حبشی غلام بھی ہو تو عرب و عجم کے شرفاء اور سادات کا امام بن سکتا ہے۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے [illegible] خاندان میں

اسلام چاہتا ہے وہ اگر آج ان معنوں سے منحرف ہو جائیں تو اسلام میں ان کی کوئی حیثیت
باقی نہیں رہتی۔ اور اگر ایک جو شخص ہندو یا عیسائی یا پارسی تھا، شرک اور بت پرستی، شراب
نوشی اور سود اور قمار بازی میں مبتلا تھا، وہی اگر آج اسلام کی فطری صداقتوں کو مان کر ان
کا پابند ہو جائے تو اس کے لیے اسلام میں عزت اور بزرگی کے اونچے سے اونچے مراتب
تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔

اس مختصر توضیح سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہمارا مقصد ایک قوم پر دوسری قوم کی برتری
نہیں ہے، بلکہ نظام تمدن کو ان اصولوں پر مرتب کرنا ہے جو ہمارے ضمیر و ایمان کے
مطابق صحیح ہیں۔ اس پہلو کو اگر ایک بار بھی چھوڑ دیتے تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کس
کے پاس آخر وجوہ اعتراض کیا ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص یا گروہ کسی مسلک کا تنقیدی یا تحقیقی مطالعہ کر کے اس
امر کا اطمینان حاصل کر لیتا ہے کہ اسی میں انسانیت کی فلاح اور انسانی صلاحیتوں و تعلقات
کی بہتری کمال درجہ پر موجود ہے تو اس کے اندر فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے
کہ جس اجتماعی زندگی سے خود اس کا تعلق ہے، جس سوسائٹی کے ساتھ اس کی زندگی و
موت وابستہ ہے، جس حصۂ انسانیت کے ساتھ وہ تمدنی، سیاسی اور معاشی تعلقات
میں جکڑا ہوا ہے، سب سے پہلے اسی کے نظام حیات کو اس مسلک کے مطابق بنانے
کی کوشش کرے۔ اسے اپنے اس پسندیدہ مسلک کے صحیح و مفید ہونے کا جتنا
زیادہ یقین ہوگا اور اس کے دل میں حب انسانیت یا حب وطن کا جذبہ جتنا زیادہ قوی
ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ اپنے ابنائے نوع یا ابنائے وطن کو اس مسلک حق کے فوائد
سے بہرہ مند کرنے کے لیے بے چین ہوگا جس میں وہ ان کی فلاح و بہبود اور کامرانی و
خوشحالی مضمر دیکھتا ہے۔ اور اتنی ہی زیادہ شدت کے ساتھ وہ ان مسلکوں کی حکمرانی
کا مخالف ہوگا جن کو وہ پورے یقین کے ساتھ غلط اور نقصان دہ سمجھتا ہے۔ یہ عین انسانی
فطرت کا مقتضا ہے اور اس میں کوئی بات خلاف حب وطن [illegible] نہیں
ہے۔ بلکہ خلاف حب وطن تو یہ بات ہے کہ کوئی جس مسلک کو ایمانداری کے ساتھ

ورجب خارج ہوتا ہے اس کو خاموشی کے ساتھ مسجدوں میں یا اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور جن طریقوں کو وہ ایمانداری کے ساتھ نقصان رساں سمجھتا ہو انہیں اپنے بلکہ قوم کی زندگی پر مسلط ہونے دے۔

جن لوگوں نے مغرب کے جمہوری نظام کا مطالعہ کیا اور اسے اپنے نزدیک برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے نظام تمدن کو مغربی ڈیموکریسی کے نمونہ پر ڈھالیں۔ جن لوگوں نے سوشلزم کا مطالعہ کیا اور اسے برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کی اجتماعی تعمیر نو (Social Reconstruction) مارکسی اشتراکیت کے طریقہ پر ہو۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ان کے لیے کوئی حجت ایسی نہیں پیش کی جاسکتی ہے کہ ان کے ایمان و اعتقاد کا مقتضا یہی ہے؟ لیکن ان کے اس اقدام کو کوئی شخص خلاف حب وطن یا خلاف حب انسانیت کہہ سکتا ہے؟ کیا ان کے حق میں یہ راست بازی ہوگی کہ وہ جس مسلک کو اپنے ابنائے جنس کے لیے سعادت و فلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں اس کو رائج کرنے کی جدوجہد نہ کریں اور کسی ایسے نظام زندگی کی حکمرانی کو گوارا کریں جو ان کے نزدیک باشندگان ملک کو پستی اور بدحالی کی طرف لے جانے والا ہو؟ اگر بالفرض ملک کی آزادی اور اقوام عالم کے درمیان اہل وطن کی عزت بڑھنے کا امکان کسی شخصی استبدادی حکومت کے قیام یا سرمایہ دارانہ نظام کے بقا میں ہو، تو کیا کسی سچے جمہوریت پسند یا کسی راست باز اشتراکی سے آزادی اور وطن کی عزت کے نام پر اپیل کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے مسلکوں کو چھوڑ کر اس طریقے کو قبول کر لیں؟ اور کیا ان دونوں کو اس قسم کی اپیل سن کر واقعی ہتھیار ڈال دینا چاہیے؟

بالکل یہی پوزیشن ہماری بھی ہے۔ ہم کو جو چیز "اسلام" کی حمایت کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ بعینہ وہی ہے جو دوسرے لوگوں کو "جمہوریت" اور "اشتراکیت" کے نعرے بلند کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ہم نے برسوں اسلام کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ کیا۔ ہم نے اس کی اعتقادی اساس، اس کے نظریہ حیات، اس کے اصول اخلاق، اس کے نظام تمدن، اس کے قوانین معاشرت و معیشت، اس کے

اخلاق، سیاست، طرزِ حکومت، غرض اس کی ایک ایک چیز کو جانچا اور پرکھا۔ ہم نے دنیا کے دوسرے اجتماعی نظریات اور تمدنی مسلکوں کو کھنگال کر دیکھا اور اسلام سے ان کا تقابل کیا۔ اس تمام مطالعے اور تحقیق و تنقید نے ہمیں اس امر پر پوری طرح مطمئن کر دیا کہ انسان کے لیے حقیقی فلاح و سعادت اگر کسی مسلک میں ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہر مسلک ناقص ہے۔ کسی دوسرے مسلک کی اخلاقی بنیاد صالح اور مستحکم نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں انسان کی شخصیت کا ارتقاء (Development of Personality) ہموار اور صحیح نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں اجتماعی انصاف (Social Justice) اور حیوانی و انسانی تقاضات کا صحیح توازن (Balance) نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں فطرتِ انسانی کے تمام پہلوؤں کی متناسب رعایت نہیں۔ اسلام کے سوا کوئی مسلک دنیا میں ایسا موجود نہیں جو انسان کو حقیقی آزادی سے ہمکنار کرتا ہو، اسے عزت کے بلند ترین مقام کی طرف لے جاتا ہو، اور ایک ایسا اجتماعی ماحول پیدا کرتا ہو جس میں ہر شخص اپنی قوت و استعداد (Capacity) کے مطابق اخلاقی، روحانی اور مادی ترقی کے انتہائی مدارج تک پہنچ سکے اور ساتھ ہی اپنے دوسرے ابنائے جنس کے لیے بھی ایسی ہی ترقی میں مددگار ہو۔

یہ اطمینان اور یقین حاصل ہو جانے کے بعد ہمارے لیے دیانت داری کا تقاضا کیا ہے؟ کیا بالکل وہی نہیں جو ہمارے جمہوریت پسند یا اشتراکیت پسند ابنائے جنس کے لیے ہے؟ جس مسلک اجتماعی کو ہم پوری دیانت کے ساتھ انسانیت کے لیے درست سمجھتے ہیں، کیا ہم پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ اپنے ملک اور اپنے ابنائے نوع کی اجتماعی زندگی کو اسی مسلک کے مطابق منظم کرنے کی جدوجہد کریں؟ جو چیز جمہوریت پسندوں اور اشتراکیت پسندوں کے لیے حق ہے وہ ہمارے لیے کیوں غیر حق ہے؟

— اسلام کے متعلق ہماری یہ رائے کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ ہم مسلمان گھر میں پیدا ہوئے ہیں، اور اسلام کے حق میں ایک طرح کا پیدائشی میلان رکھتے ہیں۔ اپنے

دوسرے رفقاء کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا کیا حال ہے، مگر اپنی ذات کی متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کو جس صورت میں میں نے اپنے گرد و پیش کی مسلم سوسائٹی میں پایا، میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ تنقید و تحقیق کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہی تھا کہ اس بے روح مذہبیت کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا جو مجھے میراث میں ملی تھی۔ اگر اسلام صرف اسی مذہب کا نام ہوتا جو اس وقت مسلمانوں میں پایا جاتا ہے تو شاید میں بھی آج ملحدوں اور لامذہبوں میں جا ملا ہوتا، کیونکہ میرے اندر نازی فلسفہ کی طرف کوئی میلان نہیں ہے کہ محض جبلت قومی کی خاطر اوہام پرستی کے چکر میں پڑا رہوں۔ لیکن جس چیز نے مجھے الحاد کی راہ پر جانے یا کسی دوسرے اجتماعی مسلک کو قبول کرنے سے روکا اور از سر نو مسلمان بنایا وہ قرآن اور سیرت محمدیؐ کا مطالعہ تھا۔ اس نے مجھے انسانیت کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ اس نے آزادی کے اس تصور سے مجھے روشناس کیا جس کی بلندی تک دنیا کے کسی بڑے سے بڑے لبرل اور انقلابی کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے انفرادی حسن سیرت اور اجتماعی عدل کا ایک ایسا نقشہ میرے سامنے پیش کیا جس سے بہتر کوئی نقشہ میں نے نہیں دیکھا۔ اس کے تجویز کردہ لائحہ زندگی ([illegible]) میں مجھے ویسا ہی کامل درجہ کا توازن ([illegible]) نظر آیا جیسا کہ ایک سالمہ ([illegible]) کی بندش سے لے کر اجرام فلکی کے قانون جذب و کشش تک ساری کائنات کے نظم میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی چیز نے مجھے قائل کر دیا کہ یہ نظام اسلامی بھی اسی حکیم کا بنایا ہوا ہے جس نے اس جہان رنگ و بو کو عدل اور حق کے ساتھ بنایا ہے۔

پس در حقیقت میں ایک نو مسلم ہوں۔ خوب جانچ کر اور پرکھ کر اس مسلک پر ایمان لایا ہوں جس کے متعلق میرے دل و دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لیے فوز و فلاح کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے۔ میں صرف غیر مسلموں ہی کو نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اس دعوت سے میرا مقصد اس نام نہاد

مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے جو خود ہی اسلام کی راہ سے بہت دور ہٹ
گئی ہے۔ بلکہ یہ دعوت اس بات کی دعوت ہے کہ ان تمام ظلم و طغیان کو ختم کریں جو دنیا
میں پھیلا ہوا ہے۔ انسان پر سے انسان کی خدائی کو مٹا دیں اور قرآن کے نقشہ پر ایک
نئی دنیا بنائیں جس میں انسان کے لیے بحیثیت انسان کے شرف و عزت، حریت
اور مساوات ہو، عدل اور احسان ہو۔

بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان میں حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر
لی ہے جس کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ کا نام سنتے ہی ایک شخص کا ذہن فوراً ووٹ بڑھانے
کی کوشش اور سیاسی غلبہ (Domination) کی خواہش اور اسی قبیل کی بہت سی
دوسری چیزوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک طرف جمہوری طرز حکومت کے
قیام نے سیاسی طاقت اور اس کے تمام ضمنی فوائد کو ووٹوں کی کثرت پر منحصر کر دیا ہے۔
دوسری طرف مسلمانوں کی پوزیشن یہاں کچھ ایسی ہے کہ ان کی جانب سے اپنے مسلک
کو پھیلانے کی کوئی کوشش اس شبہ سے بچ نہیں سکتی کہ یہ حوصلہ مند (Ambitious)
قوم اس راستے سے سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ان شبہات کو تقویت
پہنچانے میں خود مسلمانوں کا اپنا بھی کافی حصہ ہے۔ ان کے بہت سے علماء تک
نے تبلیغ تبلیغ کا شور کچھ اس طرح بلند کیا کہ گویا یہ محض ایک سیاسی حربہ ہے جسے اس
جمہوری دور میں صرف اس غرض کے لیے استعمال کرنا چاہیے کہ اپنی قلت تعداد کے
پیچیدہ مسئلے کو حل کیا جائے۔ اس چیز نے اسلام کے راستے میں ایک شدید قسم
کا سیاسی تعصب حائل کر دیا ہے۔ سوشلزم، کمیونزم، فاشزم یا اور کسی ازم کی
تبلیغ کی جائے تو لوگ اس کو محض اس کے ذاتی اوصاف (Merits) کے لحاظ سے
دیکھتے ہیں اور اگر ان کے دماغ کو وہ اپیل کرتا ہے تو اسے قبول کر لیتے ہیں۔ مگر
"اسلام ازم" کا نام سنتے ہی لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ تو
ملک کی ایک ایسی قوم کا مسلک ہے جو پہلے یہاں حکومت کر چکی ہے اور بس
جمہوری دور میں قلیل التعداد ہونے کی وجہ سے اپنے ووٹ بڑھانا چاہتی ہے

تاکہ نمائندہ مجالس کی نشستوں اور دفتری ملازمت کی کرسیوں پر قبضہ کرے۔ یہ
خیال آتے ہی دل و دماغ پر قومی تعصب کے قفل پڑ جاتے ہیں اور انسانی احساسات
کے لحاظ سے جانچنے پرکھنے کا سوال ہی خارج از بحث ہو جاتا ہے۔

ہمیں ان حالات کا بڑے صبر کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑے گا۔ نیکی اور صداقت
کی راہ میں ہمیشہ مشکلات حائل ہوتی رہی ہیں۔ شیطانی راہیں آسان ہوا کرتی ہیں
اور حق کی راہ بہرحال موانع سے لبریز رہتی ہے۔ محض صبر، راستی اور خالصتاً
لوجہ اللہ کام کرنے سے ہم مسلمانوں کے دل بھی بدل سکتے ہیں اور غیر مسلموں
کے دل بھی۔ جب ہماری سعی و جہد میں خدا کی خوشنودی اور بنی نوع انسان کی
خیر خواہی کے سوا کسی دنیوی غرض کا شائبہ تک نہ ہوگا تو لوگوں کے دل خود بخود
اس حقیقت کا ادراک کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے کہ اسلام کسی نسل اور
قوم کی میراث نہیں ہے بلکہ ایک انسانی مسلک ہے جس کا تعلق تمام انسانوں
سے ویسا ہی عام ہے جیسا ہوا اور پانی کا تعلق سب سے ہے۔ اس میں ہر
انسان دوسرے انسان کے ساتھ برابر کا شریک ہو سکتا ہے۔ یہ جس طرح مسلمانوں
کی چیز ہے اسی طرح تمہاری بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ اگر نیکی اور تقویٰ اور اتباعِ دین
الٰہی کی اطاعت میں تم نسلی مسلمانوں سے بڑھ جاؤ تو امامت تم کو ملے گی، تقدم
اور شرف تم کو حاصل ہوگا، خلافت کے امین تم ہو گے اور نسلی مسلمان پیچھے رہ جائیں
گے۔ یہاں برہمنیت اور نسل پرستی نہیں ہے کہ عزت و شرف اور قوت و
اقتدار پر کسی خاص گروہ کا دوامی اجارہ ہو۔ یہاں ایک قوم پر دوسری قوم
کے غلبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ اسلام کی یہ حقیقت [illegible] نہیں
ہے کہ ایک غلام[۱] یا چھوٹی قوم کے [illegible] اس کی [illegible] جائے
گی زندگی کی متاع میں اسے برابر کا حصہ دیا جائے۔ اسلام میں تو برابری نہیں بلکہ

۱؎ اچھوت تو دور کی بستی ہے [illegible] ۔ (مرتب)

۲؎ اس زمانے میں ہندو [illegible] تحریک [illegible] ۔ (مرتب)

اوصاف ذاتی کے لحاظ سے ایک شخص زیادہ صاحب عزت و برتر ہو سکتا ہے، لیکن پیدائش
کی وجہ سے آدمی آدمی میں کوئی امتیاز نہیں۔ کسی شخص کی راہ میں اس کے پیشے یا
اس کی زیست کی وجہ سے کوئی رکاوٹ حائل نہیں۔ تم اپنے کیرکٹر اور اپنے کردار کے
زور سے جہاں تک آدمی کی طاقت پہنچ سکتی ہے جا سکتے ہو۔ فرش سے عرش تک تمہاری
ترقی کی راہ میں کوئی روک نہیں۔

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بھی کھٹکتا ہے کہ اسلام تیرہ چودہ صدی پہلے کا
ایک مذہب ہے، اس کو آج ایک فکری و اخلاقی اور تمدنی و سیاسی تحریک کی حیثیت
سے زندہ کرنے کا کیا جواز ہے!

جو لوگ دور سے کسی چیز کو محض سرسری نظر ہی سے دیکھ کر رائے قائم کر لیتے
ہیں ان کی رائے عموماً غلط ہوا کرتی ہے۔ ایسی ہی غلطی یہ لوگ بھی کر رہے ہیں۔
انہوں نے قرآن کا غائر نظر سے مطالعہ نہیں کیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر
تحقیقی نظر نہیں ڈالی۔ اس لیے محض قیاسی مفروضات کی بنا پر یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اسلام
اب سے تیرہ سو برس پہلے کی ایک مذہبی تحریک تھی جو اس زمانے کے عرب میں تمدنی حالات
میں تو شاید مفید ثابت ہوئی ہو گی مگر اب حالات بہت بدل چکے ہیں اس لئے زمانۂ حال میں یہ پرانا
مسلک کیونکر مفید ثابت ہو گا —— اس غلط فہمی کے پیدا ہونے اور جڑ پکڑنے میں خود
مسلمانوں کے اپنے طرز عمل کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔ انہوں نے خود بھی اسلام کے مقتضا
نہیں کیا اسے ایک تحریک ([illegible]) کے بجائے محض زمانۂ سلف کی ایک مذہبی
میراث بنا رکھا —— حالانکہ ایک سلیم الفطرت آدمی اگر اپنے ذہن سے تاریخی اور سیاسی
تعصبات اور مبنی بر مفروضات کو نکال کر اسلام کا بے لاگ مطالعہ کرے تو اس پر یہ حقیقت
آسانی سے منکشف ہو سکتی ہے کہ اسلام کسی خاص زمانے کی مذہبی تحریک نہیں ہے جس کی بنیاد

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ہندوستان کے ملک میں چھوت چھات کہیں ہندو قوم سے الگ نہ ہو جائیں لیکن
علاوہ اسلام قبول کر کے وہ حیثیت ہندو معاشرے میں تھی وہ بدستور ان کی رہی۔ (مترجم)

وقتی اور مکانی حالات پر ہو، بلکہ ایسے امور کا مجموعہ ہے جو انسانی فطرت کے حقائق پر مبنی ہیں اور عاد عو قوانین فطری کے ساتھ کامل موافقت (Harmony) رکھتے ہیں۔ انسان کے معتقدات اور خیالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں، مگر اس کی فطرت ہر حال میں جوں کی توں رہتی ہے۔ زمانہ خواہ کتنے ہی پلٹے کھائے، بہرحال کائنات فطرت کے حقائق اور قوانین میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو فطری اصول طلوعِ اسلام کے وقت انسانی زندگی کے لیے صحیح تھے وہی اس بیسویں صدی عیسوی میں بھی صحیح ہیں اور وہی ۵۰ ویں صدی عیسوی میں بھی منزلِ سعادت کی طرف انسان کی رہنمائی کے لیے کافی ہوں گے۔ تغیر جو کچھ بھی ہوگا ان عصری امور میں نہیں بلکہ نئے نئے حالات پر ان کے انطباق (Application) میں ہوگا جو اسلام کی اصطلاح میں اس کا نام اجتہاد ہے، یعنی اصول کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر قانون کی اسپرٹ کے مطابق نئے حالات پر منطبق کرنا۔ اور یہی اجتہاد ہی وہ چیز ہے جو نظام اسلامی کو ایک متحرک (Dynamic) نظام بناتا ہے اور اس کے قوانین کو حالات و ضروریات کے مطابق مرتب (Adapt) کرتا رہتا ہے۔

(ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۴۱ء)

تحریکِ اسلامی کا تنزّل

دنیا میں جب کوئی تحریک کسی اخلاقی یا اجتماعی یا سیاسی مقصد کو لے کر اٹھتی ہے
تو اس کی طرف وہی لوگ رجوع کرتے ہیں جن کے ذہن کو اس تحریک کے مقصد و اس کے
اصول اپیل کرتے ہیں، جن کی طبیعتیں اس کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں، جن کے دل
گواہی دیتے ہیں کہ یہی تحریک صحیح اور معقول ہے، اور جو اپنے نفس کی پوری آمادگی کے
ساتھ اس کو چلانے اور دنیا میں قائم کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے سوا باقی تمام
لوگ جن کی طبیعت کی ساخت اس تحریک کے مقصد اور اصولوں سے مختلف ہوتی ہے،
پہلے ہی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس کے دائرے میں آنے والے لائے
نہیں جاتے بلکہ خود آتے ہیں۔ انہیں کوئی چیز مجبور کر کے خواہ مخواہ اس میں داخل نہیں کر
دیتی، اور کوئی طاقت انہیں لا کر اس میں چھوڑ جاتی ہے، جیسے کوئی کسی اندھے کو جنگل میں
لے جا کر چھوڑ دے اور اسے کچھ پتہ نہ ہو کہ میں کہاں ہوں اور کس لیے لایا گیا ہوں۔
بلکہ وہ سب جانچ کر پرکھ کر، بوجھ کر، پورے شعور اور کامل قصد کے ساتھ آتے ہیں اور
جب آجاتے ہیں تو اس کے مقصد کو اپنا مقصد بنا کر کام کرتے ہیں کیونکہ وہی مقصد ان
کے دل و دماغ کو اپیل کرتا ہے۔ اس کے اصولوں کو وہ اپنے اصول بنا کر چلتے ہیں
کیونکہ ان اصولوں کو صحیح و برحق سمجھ کر ہی وہ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں۔ اور

کے لیے اس تحریک کو چلانا زندگی کا مشن بن جاتا ہے کیونکہ جو چیز ان سے ان کا پچھلا
مسلک و مشرب چھڑاتی ہے اور ان کو اس نئے مسلک کی طرف کھینچ کر لاتی ہے وہ دراصل
ان کے قلب و ذہن کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ یہی مسلک حق اور درست ہے۔ دراصل اس
تحریک میں ان پر حق منکشف ہوتا ہے۔ اس کا انکشاف ہی ان کو اس تحریک کی طرف
کھینچتا ہے۔ اور انکشافِ حق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو کبھی اس مقام پر نہیں
ٹھیرنے دیتا جہاں وہ انکشاف سے پہلے تھا، بلکہ وہ اسے کشاں کشاں اس مقام کی
طرف کھینچے لے جاتا ہے جدھر حق کی روشنی اسے نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ
کسی تحریک کی صداقت کے معترف ہو کر اسے قبول کرتے ہیں ان کی زندگیوں کا رنگ
بدل جاتا ہے۔ وہ پہلے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ ان سے ایسی باتوں کا ظہور
ہوتا ہے جن کی توقع عام حالات میں انسان سے نہیں کی جاتی۔ وہ اپنے اصول کی خاطر
دوستیوں اور خونی و نسبی رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے اصول پر اپنی پوزیشن
سے منافع اور اپنی ہر چیز کا نقصان گوارا کرتے ہیں، حتیٰ کہ قید و بند کی تکلیفوں اور موت کے
خطرات تک سے بے پروا ہو جاتے ہیں۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ ان کی عادات
بدل جاتی ہیں، ان کے خصائل میں تغیر آ جاتا ہے، یہاں تک کہ ان کی شکل، صورت،
لباس، خوراک اور عام طرزِ زندگی پر بھی اس کے اثرات ایسے نمایاں ہوتے ہیں کہ
گرد و پیش کے لوگوں میں وہ اپنی ہر ادا سے الگ پہچان لیے جاتے ہیں۔ ہر شخص ان
کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ وہ جا رہے ہیں فلاں تحریک کے حامی۔

ہر تحریک کی ابتداء یوں ہی ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں سے وہ جماعت بنتی
ہے جو اسے چلانے کے لیے اٹھتی ہے۔ اس کے مقاصد اور اس کے اصول خود ہی
آدمیوں کی اس بھیڑ میں سے، جو دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، اپنے مطلب
کے آدمی چھانٹ لیتے ہیں اور صرف انہی لوگوں کو اس تحریک کے دائرے میں لاتے
ہیں جنہیں اس سے مناسبت ہوتی ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا دور آتا ہے۔ جو لوگ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں

ان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد بھی اُسی مسلک پر اُٹھے جس کو خود انہوں نے حق
پاکر قبول کیا ہے۔ اس غرض کے لیے وہ اپنی نئی نسلوں پر تعلیم و تربیت، گھر کی زندگی اور باہر
کے ماحول سے اس قسم کے اثرات ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے خیالات، اخلاق،
عادات اور خصائل سب کے سب اسی مسلک کے رنگ میں رنگ جائیں اور اسی کے اصولوں کے مطابق ڈھل
جائیں۔ اس میں انہیں ایک حد تک کامیابی ہوتی ہے، مگر بس ایک حد تک ہی ہوتی ہے۔
پوری کامیابی ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم و تربیت اور سوسائٹی کے
ماحول اور خاندانی روایات کو طبائع کے ڈھالنے میں بہت کچھ دخل حاصل ہے مگر فطرت،
دماغ کی ساخت، مزاج کی پیدائشی افتاد بھی ایک اہم چیز ہے اور حقیقت میں دیکھا
جائے تو بنیادی چیز وہی ہے۔ فطرۃً ہر دنیا میں ہر قسم کے آدمی، ہر مزاج، ہر رجحان،
ہر ساخت کے آدمی ہمیشہ سے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جس طرح اس تحریک کے ظہور کے وقت
ہر طرح کے آدمی دنیا میں موجود تھے، اور ان سب نے اس کو قبول نہیں کر لیا تھا بلکہ
صرف وہی اس کی طرف کھنچے تھے جو اس سے ذہنی مناسبت رکھتے تھے، اسی طرح
بعد میں بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ سب لوگ جو اس تحریک کے حامیوں کی نسل سے
پیدا ہوں گے انہیں لازماً اس تحریک سے مناسبت ہی ہوگی۔ ان میں ابوجہل اور ابولہب
بھی ہوں گے، عمرؓ اور خالدؓ بھی ہوں گے، اور ابوبکرؓ بھی ہوں گے۔ جس طرح آذر کے گھر
میں ابراہیم حنیف پیدا ہو سکتا ہے، اسی طرح نوحؑ کے گھر میں "عمل غیر صالح"[1] بھی پیدا
ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق یہ امر لازمی ہے کہ اس سوسائٹی سے
باہر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اپنے مزاج کی افتاد اور اپنی طبیعت کے رخ
کے لحاظ سے اس کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور خود اس کے اندر بہت سے آدمی
ایسے پیدا ہوں جو اس کے ساتھ کوئی مناسبت نہ رکھتے ہوں۔ پس یہ ضروری نہیں کہ تعلیم و تربیت

---

[1] قرآن مجید میں حضرت نوحؑ کے نافرمان بیٹے کو "عمل غیر صالح" قرار دیا گیا ہے۔
(ہود۔ آیت ۴۶)

کلمہ تمام جو تحریک کے ابتدائی یعنی آئندہ نسلوں کے لیے قائم کرتے ہیں وہ ان کی پوری نئی پود کو اس کے مسلک کا حقیقی متبع بنا دے۔

اس غرض کے تحت بالعموم تحریک کو اس کے بنیادی اصولوں پر برقرار رکھنے کے لیے دو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

ایک یہ کہ جو لوگ تعلیم و تربیت اور اجتماعی ماحول کی تاثیرات کے باوجود نااہل نکلیں، تطہیر* کے ذریعے سے ان کو جماعت سے خارج کر دیا جائے، اور اس طرح جماعت کو غیر مناسب عناصر سے پاک کیا جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ تبلیغ کے ذریعے سے جماعت میں ان نئے لوگوں کی بھرتی کا سلسلہ جاری رہے جو اپنی افتادِ طبع اور ذہنیت کے اعتبار سے اس تحریک کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور جن کو اس کے اصول و مقاصد اسی طرح اپیل کریں جس طرح ابتدائی پیرووں کو انہوں نے اپیل کیا تھا۔

یہ اور صرف یہی دو صورتیں ایسی ہیں جو کسی تحریک کو زوال سے اور کسی جماعت یا پارٹی کو انحطاط سے بچا سکتی ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ ان دونوں تدبیروں کی اہمیت سے غافل ہوتے جاتے ہیں۔ جماعت کے باہر سے نئے لوگوں کو اندر لانے کی کوشش کم ہونے لگتی ہے۔ جماعت کی افزائش کے لیے تمام تر نسلی افزائش ہی پر اعتماد کر لیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ اس طرح جماعت کے اندر پیدا ہوتے ہیں ان میں سے نااہل لوگوں کو خارج کرنے میں بھی خونی رشتوں، معاشرتی تعلقات اور دنیوی مصلحتوں کی رکاوٹ حائل ہوتی جاتی ہے۔ طرح طرح کے حیلوں سے جماعتی مسلک میں ایسی گنجائشیں نکال جاتی ہیں کہ ہر قسم کے رطب و یابس اس میں سما سکیں۔ اور اس مسلک کی اتنی توسیع کر دی جاتی ہے کہ ہر سمت سے اس کے

---

* موجودہ زمانے کی تحریکوں میں اسی چیز کو (Purge) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور تمام جماعتیں نامناسب آدمیوں کو اپنی صفوں سے خارج کرتی رہتی ہیں۔ بلکہ جماعت کے اصولوں سے علانیہ منحرف ہو جانے والوں کو قتل تک کر دیا جاتا ہے۔ (مترجم)

زنا، رشوت، جُوا اور ایسی سب چیزیں ان کے لیے جائز ہو چکی ہیں۔ حلال اور حرام کی تمیز
سے یہ صرف خالی الذہن ہی نہیں بلکہ اپنی زندگی کے کسی معاملہ میں بھی ان کو یہ معلوم کرنے کی
پروا نہیں ہوتی کہ خدا کا قانون اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ خیالات، اقوال اور اعمال میں
ان کے اور ایک کافر اور مشرک کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ مگر ان کا شمار بھی
"مسلمانوں" ہی میں ہوتا ہے۔ غرض اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں
آپ کو بھانت بھانت کا "مسلمان" نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ
شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں
قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے کیونکہ چڑیا گھر میں ہے۔

پھر لطف یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام سے انحراف کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ
ان کا نظریہ اب یہ ہو گیا ہے کہ "مسلمان" جو کچھ بھی کرے وہ "اسلامی" ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ
اسلام سے بغاوت بھی کرے تو وہ اسلامی بغاوت ہے۔ یہ بینک کھولیں تو اس کا نام
"اسلامی بینک" ہوگا۔ یہ انشورنس کمپنی قائم کریں تو وہ "اسلامی انشورنس کمپنی" ہوگی۔ یہ
جاہلیت کی تعلیم کا ادارہ کھولیں تو وہ "مسلم یونیورسٹی"، "اسلامیہ کالج" یا "اسلامیہ اسکول"
ہوگا۔ ان کی کافرانہ ریاست کو "اسلامی ریاست" کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ ان
کے فرعون اور نمرود "اسلامی بادشاہ" کے نام سے یاد کیے جائیں گے۔ ان کی جاہلانہ
زندگی "اسلامی تہذیب و تمدن" قرار دی جائے گی۔ ان کی موسیقی، مصوری اور بُت تراشی
کو "اسلامی آرٹ" کے معزز لقب سے ملقب کیا جائے گا۔ ان کے زندقہ و دہریت و الحاد
کو "اسلامی فلسفہ" کہا جائے گا۔ حتیٰ کہ یہ سوشلسٹ بھی ہو جائیں گے تو "مسلم سوشلسٹ" کے
نام سے پکارے جائیں گے۔ ان سارے ناموں سے آپ آشنا ہو چکے ہیں۔ اب
صرف اتنی کسر رہ گئی ہے کہ "اسلامی شراب خانہ"، "اسلامی قحبہ خانہ" اور "اسلامی قمار خانہ"
جیسی اصطلاحوں سے بھی آپ کا تعارف شروع ہو جائے۔ مسلمانوں کے اس طرزِ عمل
نے اسلام کے لفظ کو اتنا بے معنی کر دیا ہے کہ ایک کافرانہ چیز کو "اسلامی کفر" یا "اسلامی
مسیحیت" کے نام سے موسوم کرنے میں بھی کسی کو تناقض فی الاصطلاح (Contradiction in Terms)

بھی شک نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر کسی دکان پر آپ خنزیری قسموں کی ڈھلی گوشت ۔ ؟
ذراتی سودیشی جھنڈا، کا بورڈ لگا دیکھیں یا کسی جماعت کا نام مومنین کا جتھا دیکھیں
تو شاید آپ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکے گی۔

جب مزاج کی ذہنیتوں کا یہ حال ہے تو قومی مقاصد اور قومی پالیسی کا اس سے متأثر
ہوئے بغیر رہنا محال ہے۔ آج مسلمانوں کے اخباروں اور رسالوں میں، مسلمانوں
کے جلسوں اور انجمنوں میں، مسلمان پڑھے لکھے طبقوں میں آپ ہر طرف کس چیز کی پکار
سنتے ہیں؟ یہی ہی نا کہ سرکاری ملازمتوں میں ہمیں جگہیں ملیں۔ غیر الٰہی نظام حکومت
چلانے کے لیے جس قدر پرزے درکار ہیں ان میں سے کم از کم اتنے پرزے ہم پر
مشتمل ہوں۔ تشریع ساز مجلسوں (Legislatures) کی نشستوں میں کم از کم اتنا تناسب
ہمارا ہو۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ[1] میں کہے کہ کتنے فی صدی حصہ ہمارا ہو
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ[2] میں مطالب جتنا ہمارا ہی
ہے۔ یہی ملی سیاسی پروگرام ہے۔ یہی کام اسلامی مقاصد ہے۔ یہی مقصد پر مسلمانوں
کی قومی سیاست گھوم رہی ہے۔ یہی گروہ عملاً اس وقت مسلم قوم کی پالیسی کو کنٹرول کر
رہا ہے۔ حالانکہ ان چیزوں کو نہ صرف یہ کہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اس کی عین ضد
ہیں۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ ہوتا تو کیا
اس کا نقطۂ نظر یہی ہوتا؟ کیا کوئی اجتماعی اصول کی تحریک اور کوئی ایسی جماعت جو اپنے
اصول پر دنیا میں حکومت قائم کرنے کا داعیہ رکھتی ہو، کسی دوسرے اصول کی حکومت میں اپنے
پیروؤں کو کل پرزے بننے کی اجازت دیتی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سنا ہے کہ انگریزوں
نے چیمبرلین کے نظام میں اشتراکی حصول کا سوال اٹھایا ہو؟ یا فاشسٹ گروہ کا دل
میں اپنی زندگی کے اسٹیٹ پر اشتراکیت کی ہندوستانی شہنشاہیت کا ہو؟ اگر تعصبی کمیونسٹ

---

[1] جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں (المائدہ۔ آیت ۴۴)

[2] جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں (النساء۔ آیت ۷۶)

یہ پُر زور درخواست کرتی ہے کہ وہ مسلم لیگ کے مرکزی حصّے پر عمل درآمد کرنے کے بعد جو نتائج سامنے آئے ہیں اور جو حالات پیدا ہوئے ہیں ان کی روشنی میں ہندوستان کے مستقبل کے آئین کے مسئلے پر از سرِ نو غور کیا جائے۔

مسلم لیگ یہ واضح کر چکی ہے کہ ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کو ایک خاص نمایاں مقام حاصل ہے۔ اور وہ بجا طور سے اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہندوستان کی قومی زندگی، یہاں کی حکومت اور ملک کے نظم و نسق میں با عزت مقام حاصل کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا تاکہ آزاد ہندوستان میں ان کا مقام محفوظ ہو اور وہ اپنے مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی حقوق کی طرف سے مطمئن ہو کر اکثریت رکھنے والی قوم کے ساتھ اشتراک کر سکیں۔ لیکن حالات میں جو تغیر پیدا ہوا ہے، بالخصوص اس جدید آئین کے نفاذ کے بعد جو ایک نام نہاد پارلیمنٹری جمہوریت کے طرزِ حکومت پر وضع کیا گیا ہے، حالات نے جس قسم کا پلٹا کھایا ہے اس کا گذشتہ دو سال کے کچھ عرصے میں یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ اس صوبائی آئین نے بلا شک و شبہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ہندو اکثریت کی ایک دائمی اور مستقل حکومت قائم کر دی ہے۔ اور مختلف کانگرسی صوبوں کی حکومتوں کے تحت مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یہاں تک کہ ہر روز یہ کانگرسی حکومتیں مسلمانوں کے مذہبی حقوق اور کلچر کو مٹانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان اس بات کے خواہاں ہیں کہ ہندوستان کے باشندوں کو دولتِ مشترکہ کا نشانہ بنایا جائے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ مسلمانوں نے بار بار ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ہرگز مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر ہندو اکثریت کی حکومت قائم نہیں ہونے دیں گے۔ اور مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بننے نہیں دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے کسی بھی دستور کے سخت خلاف ہیں جس سے جمہوریت اور پارلیمنٹری نظامِ حکومت کی آڑ میں ہندوستان پر اکثریت کی حکومت قائم ہو۔ اس ملک کے لیے جس میں مختلف قومیں آباد ہوں اور جو ایک قومی مملکت نہیں ہے، اس ملک میں اس قسم کا پارلیمنٹری نظامِ حکومت ہرگز موزوں نہیں۔

نسلی مسلمانوں کے لیے دو راہیں

عمل، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، بہرحال اس کی صحت کے لیے دو چیزیں شرط لازم ہیں:

پہلی شے خود شناسی ہے۔ آپ کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ آپ کیا ہیں، اور جو کچھ آپ ہیں اس ہونے کے مقتضیات کیا ہیں۔ پھر اگر اس تحقیق سے آپ پر کوئی ایسی حقیقت منکشف ہو جس سے آپ راضی نہ ہوں، یعنی آپ کی یہ خواہش ہو کہ جو کچھ آپ ہیں وہ نہ رہیں بلکہ کچھ اور ہو جائیں، تب بھی آپ کے لیے لازم ہے کہ اس "کچھ اور" کا تعین کریں اور جو کچھ بھی آپ ہونا چاہتے ہیں اس کے مقتضیات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

دوسری شے قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادی ہے۔ آپ کو بہرحال یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ جو کچھ آپ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں، یا کچھ اور بننے کے خواہش مند ہیں۔ پھر اس فیصلہ کی رو سے جو کچھ بھی آپ ہونا چاہیں اس ہونے کے مقتضیات کا بار اٹھانے کے لیے آپ کو تیار رہنا چاہیے۔ اس سے زیادہ خطرناک بات کسی شخص یا گروہ کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ ایک حیثیت سے چمٹا رہے اور دوسری حیثیت کا اظہار کرتا ہو، یا کبھی اس حیثیت سے چمٹ جائے اور کبھی اس حیثیت کی طرف لپکے۔ مگر دونوں میں سے کسی ایک کے مقتضیات بھی پورے کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اس تذبذب اور تردد

پیش کر دیا جائے، اور انہیں مشورہ دیا جائے کہ ان میں سے کسی مسلک کو اختیار کریں۔

میں نے ترجمان القرآن میں "قوم" اور "جماعت" کے اصولی فرق کی بحث کسی اور مقصد کے لیے چھیڑی تھی[1]۔ اس بحث میں میں نے قرآن اور حدیث کی شہادت سے یہ ثابت کیا تھا کہ "مسلمان" کی اصطلاح جس گروہ کے لیے وضع کی گئی ہے، وہ دراصل ایک "قوم" نہیں ہے بلکہ ایک "جماعت" ہے۔ اب میں وہ تفصیل کے ساتھ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "قوم" ہونے اور "جماعت" ہونے کے خصوصیات و نتائج میں کیا فرق ہے۔ مجھے اور کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ آپ کو قوم کے بجائے جماعت بننے پر مجبور کرے۔ آپ کو پورا اختیار ہے کہ جو چاہیں بنیں۔ البتہ جو خدمت ہم انجام دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ کے ذہن کی الجھن اور نظر کے دھندلے پن کو دور کر دیں، تاکہ آپ دونوں حیثیتوں کا صحیح موازنہ کر لیں، اور آپ پر یہ واضح ہو جائے کہ جن حیثیتوں کے جمع کرنے کی کوشش میں آپ لگے ہوئے ہیں وہ اصول و مقصد اور نتائج کے اعتبار سے بالکل الگ ہیں۔

ایک گروہ میں قومیت کا احساس دراصل تاریخی اثرات اور تہذیبی روایات کے تسلسل سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی جب کچھ لوگ ایک طویل مدت تک ایک قسم کے تخیلات، تصورات اور ایک قسم کے معاشرتی طور طریقوں کے ساتھ باہم متفق اور دوسرے گروہوں سے ممتاز ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل اس ورثہ کو اپنے اندر مستحکم کرتی چلی جاتی ہے، تو ان میں اپنے مستقل اجتماعی وجود کا احساس پیدا ہو جاتا ہے جسے "قومیت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چند عادتیں اور رسمیں ہوتی ہیں جن سے وہ مانوس ہو گئے ہیں۔ چند تعصبات ہوتے ہیں جن سے انہیں محبت ہوتی ہے اور جن کی ترجمانی ان کا لٹریچر کیا کرتا ہے۔ انہی چیزوں کے مجموعہ کو ان کی قومی تہذیب کہا جاتا ہے۔ اس میں قطعاً

---

[1] ملاحظہ ہو "قومیت" [illegible] نمبر ۲۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "مسئلہ قومیت"۔ یہ مضامین پہلے ماہنامہ ترجمان القرآن میں شائع ہوتے تھے، بعد میں ان کو کتابی صورت میں [illegible] کر دیا گیا۔ (مرتب)

نظرانداز کر دیا جائے۔

اس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ جس طرح دوسری قوموں میں قوم پرستی (Nationalism)
پیدا ہوئی ہے اسی طرح ان میں بھی ہو، یہ بھی نازی اور جرمنی اور جاپان کی طرح جہاد اور عشق
کی دعوتوں کا استعمال کریں، ان کی تنظیم بھی فاشستی اصولوں پر کی جائے۔ یہ بھی انتخاب طبیعی
(Natural Selection) اور بقائے اصلح (Survival of the Fittest) کے نظریہ
کے مطابق اپنے آپ کو بھیڑیے کی طرح "صالح" ثابت کریں اور غیر صالح قوموں کو ہڑپ کرنا
شروع کر دیں۔ یہ بھی "مستعد" قوموں کے زمرے میں شامل ہو جائیں، جس طرح ممکن ہو دنیا
میں غلبہ حاصل کریں۔ اور اسی دنیا کی ہو رہیں، اسی زمین پر بیٹھے بیٹھے جنت کا تصور
[illegible] کا لطف پیدا کریں۔

قومیت کا نظریہ اختیار کر لینے کے بعد آپ کے لیے یہ سب کچھ درست ہو
جاتا ہے۔ مگر خوب جان لیجیے کہ اسلام کو اس قومیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسلام
کو نہ کسی نسل گروہ سے دلچسپی ہے، نہ وہ کسی جماعت کی مصنوعی عصبیت اور حدود سے
لگاؤ رکھتا ہے، نہ وہ دنیا کے معاملات کو چند اشخاص یا جماعتوں کی منفعت کے نقطۂ نظر
سے دیکھتا ہے، وہ اس سے بیزار ہے کہ انسانیت جن گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ان کے
اندر اپنے نام سے ایک اور گروہ کا اضافہ کرے، نہ وہ انسانی جماعتوں کو جانور بنانا
چاہتا ہے کہ ایک دوسرے کے بالمقابل تنازع للبقاء (Struggle for Existence) کے
میدان میں اتریں اور انتخاب طبیعی کے امتحان میں شریک ہوں۔ یہ سب کچھ غیر اسلامی
ہے۔ لہٰذا اگر یہ آپ کی قومیت اور یہ آپ کی قومی تہذیب ہے، اور یہ آپ کے قومی
مقاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا کوئی اور نام تجویز فرمائیں۔ اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو
حق نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام آپ کی اس قومیت اور قومی تہذیب سے تبری کرتا ہے۔ اور
میں نہیں سمجھتا اسلام ہی کا نام استعمال کرنے پر آپ کو اصرار کیوں ہو؟ "مسلمان" کے معنی و
مفہوم سے تو آپ کو کوئی بحث ہے ہی نہیں۔ آپ کو تو اپنی قومیت کے لیے بس ایک
نام چاہیے۔ سو اس غرض کے لیے جو نام بھی وضع کریں گے وہ آپ کی شخصیت اجتماعی

حیثیت پر اسی طرح دعوت کرنے لگے گا جس طرح اب عام مسلمان کر رہا ہے۔ آخر اس
قسم کی قومیت میں آخر کیا خصوصیت ہے جس کے لیے لفظ مسلمان کا استعمال کرنا
ضروری ہو؟

اس نام کو باقی رکھنے کی ضرورت صرف اسی لیے نہیں ہے کہ آپ کے یہ نظریات
جن پر آپ اپنی قومیت کی بنا رکھ رہے ہیں، اسلام کے خلاف ہیں، بلکہ اس کی ضرورت
اس لیے بھی ہے کہ ان نظریات کے ساتھ آپ جو کچھ کریں گے وہ اسلام کے لیے رسوائی و
بدنامی کا موجب ہوگا۔ دنیا آپ کی حرکات کو دیکھ کر سمجھے گی کہ اسلام ہی کچھ ایسا ہوگا۔ اور یہ
چیز اس کو اسلام سے اور زیادہ دور پھینک دے گی۔ آپ اپنے قومی مفاد کی حفاظت کے لیے غیر اسلامی
طریقوں سے کام لینے کی کوشش کریں گے، اور دنیا یہ سمجھے گی کہ شاید یہ اسلام کی تعلیم
ہے کہ جو بھی مقصد پیش نظر ہو اس کے لیے تم ہر ایک آلہ کاٹنے کے لیے تیار
ہو جاؤ۔ آپ اپنے قومی مفاد کی خاطر ہر اس منصب کو حاصل کرنے کی کوشش کریں
گے جو کسی مسلمان یا بہت سے مسلمانوں کو کسی طرح سے حاصل ہو سکتا ہو، اور دنیا اس
تماشہ کو اسلام کی طرف منسوب کرے گی۔ آپ انتہائی بے اصولی کے ساتھ کبھی ایک چیز
کی حمایت کریں گے اس لیے کہ وہ آپ کے مفاد کے مطابق ہے، اور کبھی اسی چیز کی مخالفت
کریں گے اس لیے کہ وہ آپ کے مفاد کے خلاف ہے۔ کبھی ایک پارٹی سے ملیں گے اور
کبھی اسی پارٹی سے لڑیں گے، یہی وجہ ہے کہ آپ کے اور ان کے درمیان اصولی اتفاق
پیدا ہوتا ہے نہ اختلاف، اس لیے کہ آپ کے پیش نظر اصول نہیں، قومی مفاد ہے۔ یہ
بے اصولی جو آپ کے کیرکٹر سے ظاہر ہوگی، دنیا سمجھے گی کہ ایسا ہی کیرکٹر اسلام پیدا کرتا
ہے۔ آپ قومی مفاد کی خاطر ہر راستہ پر چلیں گے۔ فاشزم کے اصول، کمیونزم کے
نظریات بھی اختیار کریں گے، نالائق سرمایہ داری اور مستبدانہ شخصی ریاستوں کے
دامن میں بھی پناہ لیں گے، انگریز اور ہندو دونوں یا جس کے آستانہ پر بھی
فائدہ کا امکان پیش نظر آئے گا اس کی طرف سجدہ ریز ہوں گے، اور یہ سارے داغ
آپ کے توسط سے اسلام کے دامن پر لگتے چلے جائیں گے۔ اسلام نے صدیوں میں جو

جب جماعت کے لیے ہیں اُن کا کم از کم یہ مطالبہ تو ہو، چاہیے کہ آپ اس طرح اس کی رسوائی کا سامان کریں۔

لیکن اگر آپ کو اسلام سے واقعی محبت ہے اور حقیقت میں آپ مسلمان ہی رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ جان لینا چاہیے کہ اسلام یہودیت اور ہندو قوم کی طرح ایک نسلی مذہب نہیں ہے جو ایک نسل کو بہشت بناتا ہو بلکہ وہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک ہے۔ ایک جہانی نظریہ (World Theory) اور ایک عالمی تصور (Universal Idea) ہے۔ وہ ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس مسلک اور نظریہ میں تصور کرے کرلے، اور دنیا کے سامنے عملاً اس کا نقشہ پیش کرے، اور جس قوم کے جو جو لوگ اس کو قبول کرتے جائیں انہیں اپنی جماعت میں شامل کر کے چلا جائے، یہاں تک کہ قوموں کے درمیان تفریق کی دیواریں مسمار ہو جائیں۔ اس کے نزدیک اسلامی صرف وہ چیز ہے جو اس کے مسلک اور اس کے نظریہ کے مطابق ہو، اور جو چیز اس کے خلاف ہو اُس کو وہ اپنانے سے صاف انکار کرتا ہے خواہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا وقتی مفاد اس سے وابستہ ہو۔ لہٰذا اگر آپ اسلام کے مسلک کی طرفداری اور اس کو دنیا میں حکمران بنانے کے لیے جدوجہد کریں تب تو یقیناً آپ اسلامی جماعت اور مسلمان گروہ ہوں گے، ورنہ اپنے لیے یا اپنے مفاد کے لیے جدوجہد کرنے کی صورت میں اسلام سے آپ کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ آپ کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ کام اپنے لیے کریں اور نام اسلام کا لیں۔

مسلک اسلام کی اس جہانی و عالمی حیثیت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ایک عالمگیر مسلک اور جہانی نظریے کے مقتضیات کیا ہوتے ہیں۔

(۱) وہ مختلف پارٹیوں میں سے ایک پارٹی بن کر رہنے پر قانع نہیں ہوتا، بلکہ اس کی فطرت کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ بس وہی ایک ہو۔ وہ مقابل کی کسی طاقت کو اپنا شریک و سہیم بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ مصالحت (Compromise) کرنا اس کے لیے مہلک ہوتا ہے۔ وہ سودا نہیں کرتا، غالب ہونا چاہتا ہے۔

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ[1]

ثانیاً، وہ شخص یا جتھوں یا قوموں کے نقطۂ نظر سے مسائل کو نہیں دیکھتا بلکہ اصولی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اسے اس امر سے غرض نہیں کہ فلاں شخص یا فلاں طبقہ یا فلاں گروہ کا مفاد کس چیز میں ہے۔ اس کو انسان سے بحث ہوتی ہے اور وہ اُن مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے جو بحیثیت انسان کے انسان کے لیے حل طلب ہوں، قطع نظر اس سے کہ کس کو کیا ملتا ہے اور کس سے کیا چھنتا ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ[2]

ثالثاً، اس کے پیش نظر وقتی یا مقامی مقصد نہیں ہوتے بلکہ ایک دائمی اور جہانی مقصود ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں زندگی کا جو نظام اُس کے اصول کے خلاف قائم ہے اُس کو توڑ ڈالے اور اپنے اصول کے مطابق مستقل طور پر ایک نظام قائم کرے۔

رابعاً، وہ ایسی قومیت کے تنگ دائرے میں بند ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو نسل اور تاریخی روایات پر قائم ہو۔ اس کی کامیابی کے لیے تو لازمی شرط ہی یہ ہے کہ اپنے عہد کے تمام انسانوں میں سے بہتر اور صالح تر افراد کو اپنی تنظیم کی طرف کھینچ لائے اور اُن کی قابلیتوں سے کام لے۔ اگر وہ کسی خاص قوم کی ذاتی اغراض کا حامی ہو جائے تو ظاہر ہے کہ دوسری قوموں کے لیے اس کی اپیل قطعاً غیر مؤثر ہو جائے گی۔

خامساً، کسی خاص قوم کی روایتی تہذیب اور اس کی رسوم و عادات سے ایسا لگاؤ نہیں ہوتا بلکہ ہر عہد میں تمام عالمِ انسانی نے اپنی عقل و فکر و تجربے سے جو حقائق — نظریات نہیں بلکہ حقائق — دریافت کیے ہوں، یا اپنی سعی و عمل سے جو صالح نتائج پیدا کیے ہوں، اُن سب کو وہ اپنے تجویز کردہ نظامِ اجتماعی میں اپنے اصول کے مطابق اس طرح جذب کرتا ہے کہ وہ اس نظام کے عنصری اجزاء (نہ کہ درآمد شدہ اشیاء) بن جاتی ہیں۔

---

[1] تاکہ وہ اس دینِ حق کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

[2] تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے نکالا گیا ہے (آل عمران ۱۱۰)

مدعا اس کی کامیابی کے لیے صرف یہ ثابت کر دینا کافی نہیں ہے کہ وہ بجائے خود حق ہے اور اس میں انسان کے لیے فلاح ہے۔ بلکہ اپنے مقصود کو پہنچنے کے لیے وہ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کے اصولوں کو ایک انقلابی تحریک کی بنیاد بنایا جائے، جس پر ایمان رکھنے والے اس تحریک کے ذریعہ سے ایک ایسی جماعت کی تنظیم اور آخر کار اس کے نظریات ایک اسٹیٹ کے لیے بنیادی قانون بن جائیں۔

یہ اسلام کے مقتضیات ہیں اور یہی مسلمان ہونے کے مقتضیات بھی ہیں۔ اب اگر آپ "اسلامی جماعت" بن کر کام کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی اُس قومی پالیسی پر نظرثانی کرنا ہوگی جس پر آپ اب تک چلتے رہے ہیں، اور اُسے بالکلیہ بدل کر ان مقتضیات کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔

آپ کو اپنے ذہن سے قومی مفاد کا تصور نکال دینا پڑے گا اور اس کی جگہ اسلام کے اصول اور اس کے نصب العین کو دینی ہوگی۔ آپ کو قومی اور مقامی تعصبات سے قطع نظر کرنا ہوگا اور اپنی نظر اس ایک مقصد پر جمادینی ہوگی کہ اسلام کے اصول دنیا میں حکمران ہوں۔ اس غرض کے لیے آپ کو دنیا بھر سے لڑنے کے لیے تیار ہونا پڑے گا اور کسی ایسی پالیسی سے جو آپ کے اصول سے منافی ہو، آپ کسی شرط پر بھی سودا نہ کرسکیں گے۔ آپ کو سختی کے ساتھ ایک اصولی جماعت بننا پڑے گا۔ اُن تمام لوگوں کو اپنے سے الگ کرنا ہوگا جو آپ کے اصول کو نہ مانتے ہوں، اور سب قوموں میں سے ان عناصر کو چن چن کر اپنے ساتھ ملانا ہوگا جو ان اصولوں کو ماننے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کو ان اغراض چھوڑ دینی ہوں گی۔ اپنے اصولوں سے ہٹ کر آپ کوئی ایسا کام نہ کرسکیں گے خواہ اس میں کتنا ہی بڑا شخصی یا قومی فائدہ ہو۔ آپ کو ایک ایسی جماعت بننا پڑے گا۔ جو اپنے اصولوں کے لیے لڑنے والی ہو، جس کا مقصد اپنی "قومی حکومت" (National State) قائم کرنا نہ ہو بلکہ اپنے "اصولوں کی حکومت" (Ideological State) قائم کرنا ہو۔

یہی جماعت جب آپ بن جائیں گے تو آپ کو اپنی قیادت میں تغیر کرنا ہوگا۔ اس وقت آپ کے قائد صرف وہ لوگ ہوسکیں گے جو اسلام کے اصول کو ٹھیک ٹھیک جانتے ہوں

اور سب سے زیادہ وسائل کا اجتماع کر لینے والے ہوں۔ ایک قوم کا لیڈر ہر وہ شخص ہو سکتا ہے
جو قوم کا فرد ہو۔ مگر ایک جماعت کا لیڈر صرف وہی ہو سکتا ہے جو جماعت کے مسلک کا
سب سے بڑا علمبردار ہو۔ مسلمانوں کی قومی تنظیم میں تو اسلام کے مسلک سے ہٹے ہوئے لوگ
صفِ اول میں بھی جگہ پا سکتے ہیں، مگر جماعتی تنظیم میں ان کا مقام سب سے پچھلی صفوں میں
ہوگا، بلکہ شاید ان میں سے بیشتر لوگ کسی صف میں بھی جگہ نہ پائیں گے۔

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ [1]۔ آپ پر دونوں راستے واضح ہو چکے ہیں۔
اب ان کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ کر کے بھی دیکھ لیجئے تاکہ ان میں سے کسی ایک کا
انتخاب کرنے میں آسانی ہو۔

اگر آپ محض ایک ایسی قوم ہوں جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہو، تو
آپ کی حیثیت ایک عام چٹان کی سی ہوگی، اور آپ کے مقابلہ میں دوسری بہت سی قومیں
ایسی ہی چٹانوں کی صورت میں موجود ہوں گی۔ آپ کا اور ان کا تصادم اسی طرح ہوگا جس
طرح چٹانوں کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔ ایک چٹان دوسری چٹان میں سے اپنا
راستہ نہیں بنا سکتی، نہ ایک چٹان کے اندر گھس سکتی ہے۔ ان کے درمیان صرف دو
ہی صورتیں ہیں۔ یا تو ہر ایک چٹان اپنی اپنی جگہ بیٹھے پر قانع ہو یا ایک چٹان دوسری
چٹان پر چڑھ جائے اور اس سے ٹکرا کر اسے توڑنے اور پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرے۔ پہلی صورت
میں آپ محدود ہو کر رہ جاتے ہیں، اور دوسری صورت میں آپ کے لیے وسعت کا امکان
تو ہے، مگر اسی طرح کی وسعت جیسی نیشنلسٹ اٹلی اور نازی جرمنی حاصل کر رہا ہے،
اور اس سے پہلے امپیریلسٹ برطانیہ حاصل کر چکا ہے۔ اس طرح کی وسعت حاصل کر کے
آپ دنیا میں بس ایک مفسد قوم کا اضافہ کر دیں گے جو زمین میں کچھ مدت تک فتنہ پھیلائے
گی اور بالآخر اپنے کیے کی سزا پائے گی۔

بخلاف اس کے اگر آپ اسلامی مفہوم کے مطابق ایک ایسی اصولی جماعت ہوں جو

---

[1] ہدایت کا راستہ گمراہی کے راستے سے الگ نمایاں ہو گیا۔

محض ایک عالمگیر مسلک اور ایک جہانی نظریے کے لیے جدوجہد کرتی ہو، اور جس میں ہر شخص
آپ کے اصول قبول کر کے مساوی حقوق اور مساویانہ حیثیت کے ساتھ شریک ہو سکتا ہو تو
آپ ایک جامد پتھر کی طرح نہ ہوں گے بلکہ ایک نامیاتی جسم (Organic Body) کی مانند
ہوں گے۔ آپ کی شکل اس درخت کی سی ہوگی جو ہر طرف اپنے گرد و پیش سے غذا جذب
کرتا ہے اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت میں آپ ایک عالمگیر قوت (World Force)
ہوں گے۔ آپ دنیا کو اپنے لیے نہیں بلکہ اصولوں کے لیے فتح کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور
اگر واقعی آپ کے اصول عالم انسانی کو اپیل کرنے والے، اور عالم انسانیت کی مشکلات کا حل
کرنے والے ہیں ـــــ جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں ـــــ تو دنیا خود اپنے آپ کو
مسخر ہونے کے لیے آپ کے سامنے پیش کر دے گی۔ آپ کے شخصی یا قومی مفاد میں کوئی عالمگیر
کشش نہیں ہے۔ اس کی طرف آپ دعوت دیں گے تو دنیا اس کی طرف خود کبھی نہ کھنچے گی بلکہ
آپ کو زبردستی اسے کھینچنا پڑے گا۔ لیکن اسلام کے اصولوں میں عالمگیری کی طاقت ہے۔
دنیا ان کی طرف خود کھنچے گی بشرطیکہ آپ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے اصولوں کے لیے لڑیں اور
مریں۔ آپ کے سامنے اشتراکیت کی مثال موجود ہے۔ وہ ایک عالمگیر طاقت صرف اس لیے
بن چکی ہے کہ اشتراکی لوگ اشتراکیوں کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ اشتراکیت کے اصول کے
لیے جہاد کرتے رہے۔ لیکن اگر وہ اشتراکیت کے لیے جہاد کرنا چھوڑ دیں اور ہر قوم کے اشتراکیوں
کو صرف اپنے قومی مفاد کی فکر لگ جائے تو آپ دیکھیں گے کہ اشتراکیت کی عالمگیری ختم ہو
جائے گی۔

(ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۳۹ء)

پیش نہ آتی۔ اس کے بعد اکثریت و اقلیت کا سوال ہی پیدا ہوتا۔ اپنے قول میں مست نسبت کی فکر نہ کرتے بلکہ آگے بڑھ کر میدان جیتنے کی تدبیریں سوچتے۔

کثرت و قلت کا سوال صرف قوموں ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ جماعتوں کے لیے نہیں۔ جو جماعتیں کسی صاف و صریح نظریہ اور جاندار اجتماعی مقصد کو لے کر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں۔ اور قلت تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف ۲۰ لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی۔ مگر اس نے ۱۶ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف ۴ لاکھ ارکان پر مشتمل ہے اور روم پر مارچ کرتے وقت ۳ لاکھ تھی۔ مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالویوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے۔ اگر قدیم زمانہ کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے کہ وہ زمانہ گزر گیا اور حالات بدل گئے۔ لیکن یہ تازہ مثالیں آپ کے اسی زمانہ کی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت تعداد بھی حکمران ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس طرح جہاد کرے جس طرح ایک اصول اور مسلک رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے۔ اور محض روٹی کے لیے لڑنے کے بجائے ایسے اصولوں کے لیے لڑے جو لوگوں کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے والے اور انسانی توجہات کو اپنی جانب کھینچنے والے ہوں۔

اسلام کے اصول اس غرض کے لیے بہترین پروگرام دے سکتے ہیں اور اس پروگرام کو لے کر اگر مسلمان جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو چند سال میں حالات کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ لیکن یہاں مسلمانوں کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ نہ اسلام کو جانتے ہیں، نہ اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پہچانتے ہیں، نہ ان کو اس تعمیم کی خبر ہے جو اسلام کی قوت تسخیر میں چھپی ہوئی ہے۔ ان کے سامنے [illegible]

---

* ۱۹۳۹ء کے اعداد و شمار ہیں۔ (مرتب)

سے زیادہ جہاں تک ہو سکتی ہے وہ یہی ہے کہ یا تو اپنے آپ کو قلیل التعداد دیکھ کر مختلف
قوموں کی طرف ڈھلنے کی فکر کریں، یا اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ہمارے لیے دوسروں
کے پیچھے چلنے اور اپنے آپ کو غیر مسلموں کی قیادت کے حوالے کر دینے کے سوا کوئی
زندگی نہیں ہے۔

دنیا میں اس وقت جتنی جماعتیں برسر اقتدار ہیں ان میں کسی جماعت کی تعداد اقلیت
سے متجاوز نہیں ہے۔ مثلاً روسی کمیونسٹ پارٹی اس وقت سب سے بڑی جماعت ہے،
مگر جیسا کہ ابھی میں نے بیان کیا اس کے ارکان ۲۲ لاکھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس
لحاظ سے اگر دیکھا جائے کہ کمیونسٹ نظریہ و مسلک کے حامیوں کی تعداد صرف
ایک ملک میں آٹھ کروڑ اور دنیا بھر میں چالیس کروڑ یا اس سے زیادہ ہو اس کو تمام کرۂ زمین
پر حکمران ہونا چاہیے۔ یہ نتیجہ ضرور ظاہر ہوتا، اگر ان لوگوں میں جماعتی احساس پیدا ہوتا
اور انہیں اپنی جماعت کے مشن کا شعور نصیب ہوتا، اور یہ اس مشن کے لیے سعی و جہد
پر کمربستہ ہوتے۔ لیکن جس چیز نے اس عظیم الشان تعداد کو بالکل بے اثر، معطل اور ناکارہ بنا دیا
ہے وہ اسی احساس و شعور اور اسی ارادہ کے عمل کا فقدان ہے۔ مختلف قسم کی شیطانی قوتیں
اس جماعت کو چمٹ گئی ہیں اور پیہم اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ کسی طرح یہ اپنے آپ
سے واقف نہ ہونے پائے، اور اس کو کبھی اتنا ہوش ہی نہ آنے پائے کہ اپنی زندگی کے
مشن کا خیال کر سکے۔ آپ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ہندوستان
کے مسلمانوں کی حالت کا اندازہ کیجیے۔ ہر جگہ آپ کو یہی نظر آئے گا کہ ایک نہ ایک
شیطان اس قوم کی جان کا روگ بنا ہوا ہے اور پوری مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں لگا ہوا
ہے۔ جہاں مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ ابھی دلچسپی باقی ہے وہاں یہ شیطان
مذہبیت کا جامہ پہن کر آتے ہیں اور دین کے نام سے ان مسائل پر بحثیں چھیڑتے اور
نزاعیں برپا کراتے ہیں، جو بسا اوقات سر پھٹول تک نوبت پہنچا دیتے ہیں جن کی
دین میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس طرح مسلمانوں کا سارا مذہبی جوش انہی کی تخریب
میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اور جہاں مذہب کی طرف سے کچھ سرد مہری پیدا ہو گئی ہے

شکایات

ناظرین "ترجمان القرآن" میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں:

"آپ کی نظر میں نہ صرف لیڈر ہیں، نہ عوام میں کوئی اس قابل ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے یا کہلانے کا مستحق ہو، نہ موجودہ دور کی سیاسی کشمکش میں ان نام نہاد مسلمانوں کی بہبودی کی جدوجہد مستحسن ہے۔ پھر براہ خدا یہ بتائیے کہ یہ مسلمان کس نام سے پکارا جائے اور اس پر جو ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں ان سے بچنے کے لیے کسی تدبیر کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ یہ سچ ہے کہ دور حاضر کے مسلمان بُرے ہیں۔ مذہب کی پابندی نہیں کرتے۔ لیکن تو کیا انہیں ڈوبتا ہی چھوڑ دیا جائے؟ ..... کیا جس وقت تک سب راہ راست پر نہ آجائیں اس وقت تک نہ اپنے آپ کو کوئی مسلمان کہے نہ ان کی بہتری کے واسطے انہی جیسے مسلمانوں کی طرف سے کوئی جدوجہد کی جائے؟ ...... ڈوبتے ہوئے سے یہ کہنا کہ تو گہرے پانی میں گیا ہی کیوں تھا اور تو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں ہے سراسر خلاف انسانیت ہے۔ ضرورت تو اس کی ہے کہ اسے نکالنے کی کوشش کی جائے اور ہر ممکن تدبیر اس کی جان بچانے کی عمل میں لائی جائے۔"

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں:

"آپ کی روش میرے لیے اور مجھ جیسے خیالات رکھنے والے بہت سے دوسرے لوگوں کے لیے سخت وجہ پریشانی بن گئی ہے۔ جب تک آپ نیشنلسٹ مسلمانوں یا کانگریس سے تعاون کرنے والے مسلمانوں کے طرزِ عمل پر تنقید کرتے رہے، ہم نے یہ سمجھا کہ آپ ہندوستان میں مسلمانوں کی انفرادیت برقرار رکھنے کے حامی ہیں اس لیے اُن لوگوں سے اختلاف رکھتے ہیں جن کے رویہ سے آپ کو خوف ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی ہستی گم ہو جائے گی۔ مگر اب آپ نے اُن دوسرے گروہوں کے لیڈروں پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی ہے جو اسی انفرادیت کے تحفظ کے لیے کوشاں ہیں، یعنی مسلم لیگ اور خاکسار تحریک۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟ ہندوستان میں اگر مسلمانوں کو زندہ رہنا ہے تو بہرحال یہ ضروری ہے کہ وہ کسی مرکز پر جمع ہوں، ایک منظم گروہ بنیں، کسی قیادت کے تحت حرکت کریں۔ اسی مقصد کے لیے جو کوشش کی جاتی ہے اس سے آپ کا اختلاف کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر آپ مذہبیت کا احیاء چاہتے ہیں تو یہ بھی تب ہی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک اجتماعی نظام بن جائے۔ لیگ بُری یا بھلی جیسی بھی ہے، جماعت تو بن رہی ہے، اس کا ساتھ دیجیے۔ پھر مذہبی احیاء کے لیے بھی کوشش کر لیجیے گا۔ لیکن آپ کی روش سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی نجات و بہبود کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں ان میں سے کسی کا بھی ساتھ آپ دینا نہیں چاہتے۔"

یہ دو خط منجملہ ان بہت سے شکایتی خطوط کے ہیں جو پچھلے دنوں مجھے وصول ہوئے ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک بہت بڑا گروہ اسی طرز پر سوچ رہا ہے اور ان خطوط میں دراصل اسی طرزِ خیال کی نمائندگی کی گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے اوپر آپ تنقید کرنا اور اپنی کمزوریوں کا جائزہ لینا کوئی خوش آیند چیز نہیں ہے۔ میں بھی اس کام کو خوش دلی سے نہیں کرتا۔ بڑا تلخ گھونٹ، زہر کا گھونٹ ہے جسے حلق سے اتارتا ہوں، اور اسی طرح اس تلخی کو محسوس کرتا ہوں جو میرے دوسرے بھائی اس کے اندر پاتے ہوں گے۔ اس احساس کے باوجود میرا ضمیر تقاضا کرتا ہے کہ اس تلخی سے بچنے کے بجائے اسے گوارا کرنا چاہیے۔ تلخی تو واقعہ میں موجود ہے۔ تغافل کا فائدہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے احساس کو حقیقی اور واقعی تلخی کے ادراک سے معطل کر لیا جائے۔ دوسروں کی چیرہ دستیوں اور جارحانہ کارروائیوں پر شکوہ سنج ہونا اور اپنی کمزوریوں اور غلطیوں سے صرف غفلت برتنا بلکہ ان کے لیے جواز و استحسان کے دلائل ڈھونڈنا بہت خوش گوار چیز ہے جس سے دل خوب بہلتا ہے، مگر اس کی حیثیت مارفیا کے انجکشن کی سی ہے۔ یہ ایک چٹکلہ ہے جس کے نشہ میں مریض سو جاتا ہے مگر وہ اندرونی خرابیاں دور نہیں ہوتیں جن کے سبب سے بیرونی آفات کو اس پر تسلط حاصل ہوتا ہے۔ میرے بھائی چاہتے ہیں کہ میں بھی انہیں اسی چٹکلے کی خوراکیں دیا کروں۔ ان کی خواہش ہے کہ جس خیالی جنت میں وہ بس رہے ہیں، جن سرابوں سے وہ چشمۂ آب حیوان پانے کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں، اور جن غلط فہمیوں کا دلفریب طلسم انہوں نے اپنے گرد و پیش بنا رکھا ہے، ان سب چیزوں کو جوں کا توں رہنے دوں۔ بلکہ اگر ہو سکے تو خود بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں جن کے سر ان چیزوں کا سہرا جاتا ہے اور امت کی سب سے بڑی خدمت بنا ہوا ہے۔ اس خدمت کے فوائد بھی مجھے معلوم ہیں، مگر میں مجبور ہوں کہ مجھے محبوب دشمن کے بجائے مخلص دوست بننا زیادہ مرغوب ہے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

مسلمانوں کا اتحاد، مسلمانوں کی فلاح و بہبود، مسلمانوں کی تنظیم، مسلمانوں کی جمعیت و مرکزیت، مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی، یہ وہ چیزیں ہیں جن کا ذکر بار بار زبان

پہنا تا ہے۔ میں بھی یہ دعویٰ کرتا ہوں، وہ بھی کرتا ہے، بکر بھی کرتا ہے، اور ہر ایک شخص جو
اس گروہِ مسلمین میں شامل ہے، انہی الفاظ سے اپنے مقصد کے اظہار میں کام لیتا ہے۔
مگر اس کے باوجود ہمارے عمل کی راہوں میں اختلاف ہے۔ ایک کسی طرف جا رہا ہے،
دوسرا کسی اور طرف، تیسرا کسی اور طرف۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ محض اتفاقی امر ہے؟
یا اس کی تہ میں کوئی بنیادی سبب ہے جسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی؟

میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان الفاظ مشترک ہیں مگر معنی و
مفہوم میں اختلاف ہے۔ ایک ہی لفظ ہے "مسلمان"، لیکن میں اس سے کچھ اور مراد لیتا
ہوں، اور دوسرے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے سعادت، فلاح و بہبود، تنظیم،
جمعیت، مرکزیت، ترقی و خوشحالی اور ہر ایک چیز جو لفظ "مسلمان" کی نسبت سے
بولی جاتی ہے، ہمارے درمیان مختلف المعنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی الجھن کے سبب سے
غلط فہمیاں واقع ہو جاتی ہیں، اور جب لوگ اسے سلجھانے سے عاجز رہ جاتے ہیں تو
شکایت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تم کو مسلمانوں کے سعادت و فلاح و
بہبود اور ترقی و خوشحالی وغیرہ سے ہمدردی نہیں۔ جمعیت بن رہی ہے، مرکزیت
پیدا ہو رہی ہے، مگر تم اس کی مخالفت کرتے ہو۔ مسلمانوں کی بہتری کے لیے کام ہوتا
ہے اور تم اس میں روڑے اٹکاتے ہو۔ حالانکہ ایک شخص ان الفاظ کا اطلاق جن
مخصوص و متعین چیزوں پر کرتا ہے دوسرے کے نزدیک ان پر یہ الفاظ منطبق ہی نہیں
ہوتے، ورنہ ظاہر ہے کہ کون کافر ہوگا جس کو فلاحِ مسلمین وغیرہ سے دشمنی ہو۔
آئیے ذرا تحقیق کر کے دیکھیں کہ اس الجھن کی نوعیت کیا ہے۔

مطلق اور مقید کا فرق ایک ایسی واضح چیز ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ جب
ہم کوئی ایسا لفظ بولتے ہیں جس میں اطلاق اور عموم ہو تو اس کے استعمال میں وسعت
ہوتی ہے۔ اور جب اسے مقید کر دیا جاتا ہے تو اس قید کا لحاظ کیے بغیر اس لفظ کا
استعمال صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً جب ہم "ترقی" بولتے ہیں تو اس کا استعمال ہر رنگ پر ہوگا
کوئی چیز خواہ سیاہی میں ترقی کرے، سفیدی میں یا سرخی میں، بہرحال ہم کہیں گے

کہ اس کا رنگ گہرا ہو رہا ہے۔ مگر جب رنگ کے ساتھ ہم سفید کی قید لگا دیں تو سپید،
سُرخ یا سبز اور دوسرے رنگ کی چیزوں پر ہم اس لفظ کا اطلاق نہ کر سکیں گے۔ اور سیاہی یا
سرخی میں ترقی کرنے کو سپید رنگ کی ترقی کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح مثال کے طور پر لفظ
"قافلہ" کو لیجیے۔ ہر قافلہ جو کسی طرف جا رہا ہو، اس لفظ سے موسوم ہو سکتا ہے۔ جس
طرف بھی وہ بڑھے اس کی پیش قدمی کو قافلہ کی پیش قدمی کہا جا سکتا ہے۔ ہر شخص اس کا
ممبر قافلہ بن سکتا ہے۔ ہر گاڑی پر وہ سفر کر سکتا ہے۔ ہر قسم کا زادِ سفر اس کا زادِ سفر ہو سکتا
ہے۔ غرض اس کے معنی ہر سفر کی وسعت ہے ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو متعلق ہی
ہوگی۔ لیکن جب مثلاً عزمِ پشاور کی قید سے مقید کر کے "قافلہ پشاور" کہہ دیا جائے تو یہ وہ
عموم باقی نہیں رہ سکتا جو محض قافلہ ہونے کی صورت میں تھا۔ "قافلہ پشاور" کا اطلاق صرف
اُسی قافلہ پر ہوگا جو عازمِ پشاور ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جا تو رہا ہو مدراس یا بمبئی کی طرف
اور کہا جائے قافلۂ پشاور۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو، پشاور کی قید سے
مقید ہو جائے گی۔ مثلاً قافلۂ پشاور کی پیش قدمی کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ پشاور کی سڑک پر چل
رہا ہے۔ اگر وہ کسی دوسری سڑک پر بڑھ رہا ہو تو اسے قافلۂ پشاور کی پیش قدمی نہیں
کہا جا سکتا۔ بلکہ اسے پیش قدمی کے بجائے رجعت کہا جائے گا۔ کیونکہ وہ دوسرے راستہ پر
وہ جتنے قدم بھی چلے گا، پشاور کی سمت سے دُور ہوتا چلا جائے گا۔ اس کا ممبر قافلہ بھی
صرف وہی ہو سکتا ہے جو پشاور کا راستہ جانتا ہو۔ دوسرے راستوں کے علم میں کوئی
شخص خواہ کتنا ہی ماہر ہو، اگر وہ پشاور کی راہ سے ناواقف ہے تو بہرحال وہ قافلۂ پشاور
کا ممبر نہیں بن سکتا۔ اسی پر دوسرے امور کو بھی قیاس کر لیجیے۔

اب دیکھیے کہ الجھن کس طرح پیش آتی ہے۔ مختصر ہی کی مثال کو لے لیجیے۔ ایک
قافلہ کا نام تو ہے "قافلہ پشاور"۔ مگر آپ یا تو پشاور کی قید کو فضول کر کے محض قافلہ
سمجھ لیتے ہیں۔ یا آپ کو پشاور کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ یا آپ کا خیال یہ ہے کہ اس
قافلے کے لوگ جب ایک دفعہ "قافلۂ پشاور" کے نام سے موسوم ہو چکے ہیں تو اب یہ
پشاور کے سوا جس رُخ پر چاہیں سفر کریں بہرحال انہیں کہا جائے گا "قافلۂ پشاور" ہی۔

بخلاف اس کے میں قافلہ بہت اور کو اس کے اصل معنی میں لیتا ہوں اور پشاور کی قید کو نظرانداز
کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قافلے کے بارے
میں جتنی گفتگو ہوتی ہے میرے اور آپ کے درمیان بات بات پر تصادم واقع ہوتا ہے۔
جب تک بات مجمل رہتی ہے ہم متفق رہتے ہیں۔ قافلے کے منتشر مسافروں کو جمع کیا جائے،
انہیں دوسرے قافلوں میں گم نہ ہونے دیا جائے، رہزنوں سے ان کی حفاظت کی جائے،
ان کے لیے زاد راہ درکار ہے، انہیں ایک میر قافلہ کی ضرورت ہے، ان کو منظم طور پر
تیز رفتاری سے منزل کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے، یہ سب باتیں مبہم اور مجمل الفاظ میں
جب تک کہی جاتی ہیں، میں اور آپ دونوں ان سے اتفاق کرتے ہیں۔ مگر جب انہی
چیزوں کے تعین کا وقت آتا ہے تو آپ کے اور میرے خیالات میں بعد المشرقین پایا
جاتا ہے۔ ایک شخص اٹھتا ہے وہ اس قافلے کے لوگوں کو جمع کر کے بمبئی کی طرف چلنا
شروع کر دیتا ہے، دوسرا اٹھتا ہے اور کلکتہ کی طرف چل پڑتا ہے، تیسرا اٹھتا ہے اور کسی
اور طرف کا رخ کرتا ہے۔ آپ ہر میر قافلہ کے جھنڈے کو دیکھ کر زندہ باد کا نعرہ لگاتے
ہیں اور پکارتے ہیں کہ چل پڑا "پشاوری قافلہ"۔ میں اس پر اعتراض کرتا ہوں کہ یہ جمعیت
اور یہ پیش قدمی قافلہ پشاور کی جمعیت اور پیش قدمی تو نہیں ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ منتشر
مسافر جمع تو ہو رہے ہیں اور حرکت قافلہ بن کر ہو رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب
کچھ بجا اور درست، مگر محض جمع ہونے اور حرکت قافلہ بن جانے کا نام تو قافلہ پشاور بننا
نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ دیکھو کتنی اچھی، تیز رفتار، شاندار گاڑی ہے جس پر یہ قافلہ
جا رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کی بیان کردہ صفات سے انکار نہیں، مگر یہ گاڑی جا
کدھر رہی ہے؟ اگر اس کا رخ پشاور کی طرف نہیں ہے تو قافلہ پشاور کے لیے مفید
نہیں، اس صورت میں اس کی تیز رفتاری اور زیادہ خطرناک ہے کیونکہ وہ روز بروز قافلہ
کو اس کی منزل مقصود سے دور تر لے جاتی رہے گی۔ آپ کہتے ہیں کہ صاحب قافلہ
بننے اور گاڑی چلنے تو دو، پھر پشاور کی سڑک بھی لے ہی لیں گے۔ میں عرض کرتا ہوں
کہ جب تک عزم پشاور طری ہے اور دوسرے راستوں پر آپ گامزن ہیں، اس

وقت تک کے لیے نام تبدیل فرما لیجیے۔ مجھے آپ کی گاڑی چلنے پر اعتراض نہیں جو اس پر
ہے کہ آپ چاہیں تو بمبئی یا مدراس یا کلکتہ کی طرف، مگر نام آپ کا قافلۂ پشاور ہی رہے۔ جیسا آپ
کہتے ہیں کہ حضرت پشاور کی سڑک تو بڑی پُر شور گزرا ہے۔ اس وقت اُدھر جانا تو محال ہے
لہٰذا سر دست تو قافلۂ پشاور کو دوسرے آسان راستوں ہی پر چلنے دو۔ میں گزارش کرتا
ہوں کہ میں نے آپ کو پُر شور گزرنے والے راستے کی طرف گھسیٹنے پر اصرار کب کیا تھا؟ میرا مقصد
تو صرف یہ ہے کہ قافلۂ پشاور کا پشاور کے سوا دوسری سمت میں چلنا، پھر قافلۂ پشاور
ہی رہنا شک تعریفات ہے۔ آپ اس تناقض کو دور فرمائیں۔

اس تمام بحث میں بجائے نتائج مرتب ہونے کے جناب مُخَیَّلَہ کا تعلق جانتے ہیں اور
اس کے تمام متعلقات کو تہہ سے اُدھیڑ دیتے ہیں۔ اور میں مُخَیَّلَہ کو مُخَیَّلَہ ہی سمجھ
کر بات کرتا ہوں۔ اگر آپ اپنے ذہن کو صاف کریں اور یہ بات سمجھ لیں کہ مطلق قافلہ
اور قافلۂ پشاور میں کیا فرق ہے تو کوئی اُلجھن پیش نہیں آ سکتی۔ لیکن آپ سیدھی
سمجھ کی بات اختیار کرنے کے بجائے گفتگو کا رُخ کچھ دوسری ہی باتوں کی طرف پھیر
دیتے ہیں۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ تم قافلہ کے جسم اور اس کی تنظیم اور اس کی
پیش قدمی کے مخالف ہو۔ حالانکہ میں نے اجتماع و تنظیم اور پیش قدمی سے کس کا انکار کیا تھا؟
کبھی آپ سوال کرتے ہیں کہ اگر یہ قافلۂ پشاور نہیں تو اسے اور کس نام سے یاد کیا جائے؟
حالانکہ اس کا نام تجویز کرنے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میری بات تو صاف ہے۔ اگر
یہ پشاور کی سڑک پر ہے تو قافلۂ پشاور ہے۔ اور اگر اس پر نہیں ہے تو اپنے لیے
جو نام چاہے تجویز کر لے۔ بہرحال اس پر قافلۂ پشاور کا نام راست نہیں آتا۔ آپ چاہیں
تو اس امر پر بحث کر لیجیے کہ جس سڑک پر یہ جا رہا ہے، وہ پشاور کی سڑک ہے یا نہیں۔
مگر یہ اصول آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو اس سڑک پر نہ ہو وہ قافلۂ پشاور نہیں ہے۔
پھر آپ ہمدردی کا سوال چھیڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمدردی اور بے ہمدردی کا یہاں کوئی
سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو واقعہ اور حقیقت کا سوال ہے۔ مدراس یا کلکتہ کی طرف
جانے والوں کو آخر میں عازمِ پشاور کس طرح کہوں، جانتے بوجھتے ایک خلافِ واقعہ

بات یاد رکھنا کہ ہمدردی کی کون سی قسم ہے؟ میرے نزدیک تو ہمدردی کی
صورت یہی ہے کہ صاف صاف لوگوں کو بتا دیا جائے کہ یہ پشاور کی سڑک ہے
اور دوسری سڑکیں فلاں فلاں سمت کو جاتی ہیں۔ جو لوگ فی الواقع پشاور جانا چاہتے
ہیں مگر راستہ سے ناواقف ہونے کے باعث دوسرے راستوں پر چلے جا رہے
ہیں یا بھٹکتے جا رہے ہیں وہ میرا راستہ معلوم کر لیں گے۔ اور جو حقیقت میں جانا
ہی دوسری طرف چاہتے ہیں میں نہ تو ان کا راستہ روکنا چاہتا ہوں، نہ ان سے مجھے
کوئی دشمنی ہے کہ انسانیت کے خلاف ان کے ساتھ کوئی بے دردی کروں۔
میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ جدھر جانا چاہتے ہیں سمجھ بوجھ کر پورے شعور کے ساتھ
جائیں، اور جب جائیں تو غلط نام کے ساتھ سفر نہ کریں۔

مسلمانوں کے معاملہ میں جو الجھن پیش آ رہی ہے اس کی نوعیت بعینہٖ وہی
ہے جو اوپر کی مثال میں بیان کی گئی ہے۔ مسلمان کا لفظ اسلام سے ماخوذ ہے اور
اسلام ایک طریقِ فکر، ایک مقصدِ زندگی، ایک سیرت و کردار اور ایک طرزِ عمل
کا نام ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان کے معنی محض آدمی کے نہیں ہیں بلکہ اس آدمی کے
ہیں جو زندگی کے تمام معاملات میں وہ خاص طریقِ فکر، وہ خاص مقصدِ حیات، وہ
خاص اخلاق و اطوار، اور وہ خاص طرزِ عمل رکھتا ہو جس کا نام اسلام ہے۔ لہٰذا "مسلمان"
کے ان تخیلات کو اگر صاف صاف سمجھ لیا جائے تو مسلمانوں کی بہتری و بہبود، ان
کا مفاد، ان کی تنظیم، ان کی قیادت و امامت، غرض ان سے تعلق رکھنے والی ہر
چیز کا مفہوم متعین ہو جائے گا۔ لیکن اگر ان تخیلات سے قطع نظر کر کے "مسلمان" کے
لفظ کو مطلقاً ایک گروہ، ایک قوم کے معنی میں لے لیا جائے تو پھر ہر شخص کو آزادی ہو
گی کہ جس چیز کو چاہے مسلمانوں کا مفاد کہہ دے، جس چیز کو چاہے ان کی فلاح و بہبود
قرار دے دے، جس ذریعہ کو چاہے ان کی تنظیم سمجھ لے، اور جو شخص بھی ہانک لے
جانے کی قابلیت رکھے وہ اٹھ کر دعویٰ کر دے کہ مسلمانوں کا قائد ہے اور جدھر چاہے لے جانے
پر آمادہ ہو جائے۔

بدقسمتی سے یہاں کچھ ایسی ہی صورتِ حال درپیش ہے۔ "اسلام" کی قید سے
قطع نظر کر کے نری اولاد "مسلمانوں" کو بعض ایک گروہ شمار کیا گیا ہے اور اسی
کا نتیجہ ہے کہ عجیب عجیب چیزوں پر مسلمانوں کے مفاد، اُن کی فلاح و بہبود، اُن
کی تنظیم و جمعیت، اُن کی قیادت و امارت وغیرہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہنے
والے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ بینک اور انشورنس اور اسی
قبیل کی دوسری چیزوں سے استفادہ کریں۔ حالانکہ مسلمان کا لفظ اگر کوئی معنی رکھتا
ہے تو اس کی رُو سے مسلمان مامور ہیں اس پر کہ اُس پورے نظامِ ریاست کو توڑ
ڈالیں جو اس وقت دنیا میں قائم ہے اور اپنے اصول پر ایک نیا نظام بنائیں پھر
یہ اُلجھے ہوئے دماغ کی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ مسلمان کی حیثیت سے جس نظام
کے ساتھ آپ کی اصولی عداوت ہے اسی میں آپ اپنا مفاد دیکھیں اور پھر اس کا
نام "مسلمانوں کا مفاد" رکھیں؟ اسی طرح سرکاری ملازمتوں اور شریعت ساز مجالس
کی نشستوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو "مسلمانوں کے مفاد" سے تعبیر کیا جاتا
ہے۔ حالانکہ مسلمان کے لفظ کو اگر اسلام کی قید سے مقید کر کے دیکھا جائے تو یہ سب
چیزیں مسلمانوں کے مفاد کی ضد ہیں۔ مسلمان کے مفاد کی حیثیت سے تو آپ کا کام اس
نظامِ حکمرانی کو جڑ سے ڈھانا ہے جسے چلانے کو آپ اپنا مفاد سمجھ رہے ہیں۔ اسی طرح
وہ نظامِ تعلیم جو انگریزوں نے یہاں قائم کیا ہے اُس کے تحت اپنی نسلوں کا ذہن
تیار کرنا آپ کے نزدیک مسلمان کی فلاح و بہبود اور ترقی کا ذریعہ ہے۔ اور اسی
نظام کے تحت آپ خود اپنے خرچ سے درسگاہیں بنا کر ان کے نام اسلامیہ
اسکول اور اسلامیہ کالج، مسلم یونیورسٹی رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ پورا نظامِ تعلیم
انسانیت کی تشکیل جس نقشے پر کرتا ہے وہ اسلامی نقشے کے عین برعکس ہے۔

ایسا ہی خلط مبحث آپ کے ذہن میں مسلمانوں کی جمعیت، مسلمانوں کی تنظیم اور
مسلمانوں کی قیادت کا بھی ہے۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ اسلام کس تحریک کا نام ہے،
اس کا مقصد کیا ہے، اس کے اصول کیا ہیں، اور وہ کیا طرزِ عمل چاہتا ہے، تو آپ

بڑی آسانی کے ساتھ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُن سیاسی جمعیتوں اور تنظیموں اور اُن قائدوں اور امیدواروں کی کیا حیثیت ہے جو اسلام کے نام سے اِس وقت کام کر رہے ہیں۔ اسلام کی رُو سے مسلمانوں کی جمعیت صرف وہ ہو سکتی ہے جو غیر الٰہی حکومت کو مٹا کر الٰہی حکومت قائم کرنے اور قانونِ خداوندی کو سکۂ رواں کرنے کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ جو جماعت ایسا نہیں کرتی بلکہ غیر الٰہی نظام کے اندر "مسلمان" نامی ایک قوم کے دُنیوی مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہے" نہ تو اسلامی جماعت ہے، اور نہ اسے مسلمانوں کی جماعت ہی کہنا درست ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی تنظیم صرف وہی ہو سکتی ہے جو خالص اسلامی اصولِ اجتماع پر قائم ہو اور جس کا مقصد اسلامی ہو۔ ورنہ جو تنظیم فاشستی اصولوں پر کی جائے اور جس کا مقصد محض اپنی قوم کا غلبہ و تسلّط ہو اُسے محض اِس بنا پر مسلمانوں کی تنظیم نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مردم شماری کے مسلمانوں کو منظم کرتی ہے اور ان کے استخلاف فی الارض کے لیے کوشاں ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس مسلمانوں کے رہنما بھی صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو سب سے بڑھ کر اسلامی تحریک کے مقصد، اصول اور طریقِ کار کو جانتے ہوں اور اہلِ تقویٰ و دیانت ہوں۔ باقی رہے وہ لوگ جو سرے سے اسلام کا علم ہی نہ رکھتے ہوں، یا ناقص علم کی بنا پر اسلام اور جاہلیت کو خلط ملط کرتے ہوں اور پھر تقویٰ و دیانت کی کم سے کم ضروری شرائط سے بھی عاری ہوں، تو ایسے لوگوں کو محض اس لیے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرزِ تنظیم کے استادِ فن ہیں، اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔

یہ باتیں جب مسلمانوں سے صاف صاف کہی جاتی ہیں تو وہ اس پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں اور شکایات کے دفتر باندھ دیتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت اس معاملہ میں جذبات کی برانگیختگی کا کوئی موقع نہیں ہے۔ لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچ کر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ اسلام

طلبہ اسلام کے نام پر کام کرنا چاہتے ہیں یا اپنے لیے اپنے اصول پر۔ اگر پہلی بات ہے تو انہیں سیدھی طرح ہر اُس چیز کو ترک کرنا چاہیے جو غیر اسلامی ہے۔ اور اگر دوسری بات ہے تو جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں شوق سے کریں۔ ہم اُن کا راستہ روکنے نہیں آتے۔ ہمارا مطالبہ اُن سے صرف یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے نام کو غلط طریقے پر استعمال کرنا چھوڑ دیں۔

(ترجمان القرآن - دسمبر ۱۹۳۹ء)

رکھنے کو دیکھتے ہوئے وہ یہی کہیں گے کہ ابھی تنقید کا وقت نہیں ہے۔ اصل یہ ہے
کہ وہ خود بھی نہ بتا سکیں گے کہ کون سا وقت تنقید کے لیے موزوں ہے۔

لیکن جن کی نظر "کیا ہونا چاہیے" پر ہوتی ہے وہ چونکہ حالات کو ایک دوسری
نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے وہ اُسی وقت کو تنقید کے لیے موزوں سمجھتے ہیں جو اہلِ
حال کے نزدیک سخت غیر موزوں ہوتا ہے۔ اُنہیں اپنا کام پرستارانِ حال کی چیخوں
اور فریادوں، جھگڑوں کے درمیان کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اصلاح و
ترقی ناممکن ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ "جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے" کی ذہنیت
عام لوگوں پر مسلط ہو جانے کے بعد کسی اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہو سکتی۔ خامیوں
کا احساس ہی تو پیدا ہی نہ ہوگا کہ انہیں دور کرنے کی طرف توجہ ہو۔ یا اگر تھوڑا سا احساس
اُبھرا بھی تو حال کے شیدائی اُسے دبانے کے لیے بیسیوں قسم کی تاویلیں کریں گے،
تاکہ ان خامیوں کو ناگزیر ثابت کریں اور بس چلے تو خوبیوں میں تبدیل کر دکھائیں۔

"کیا ہونا چاہیے" کے نقطۂ نظر سے جو تنقید کی جاتی ہے اس کا نتیجہ کبھی یہ نہیں
ہوتا کہ عمل میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یک لخت بند ہو جائے، اور اُس وقت تک جمود
تعطل کی حالت طاری رہے جب تک کہ وہ مثالی (Ideal) حالت رونما نہ ہو جائے
جسے مقصود قرار دے کر ناقد تنقید کرتا ہے۔ ایسا نہ کبھی ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ فطری
طور پر تنقید کا اثر ہمیشہ بتدریج ہوا کرتا ہے۔ اوّل اوّل تو اُسے سخت حیرت اور ناگواری
کے ساتھ دیکھا جاتا ہے کیونکہ عام طبیعتیں تغیر سے ڈرتی اور نئے پن سے متنفر ہوتی ہیں۔
پھر ایک دَور شکایت کا آتا ہے جس میں صداقت اور نیک نیتی کے سوا ہر ممکن
چیز ناقد کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر فی الواقع تنقید میں کچھ جان ہوتی
ہے اور درحقیقت موجودہ نظام میں وہ خامیاں پائی جاتی ہیں جن کی نشان دہی
تنقید میں کی گئی ہے، اور سننے والوں کا ضمیر بھی راست بازی کے ساتھ اُسی عیب کو حق
تسلیم کرتا ہے جسے نظر کی حد نے تنقید کی ہے، تب کہیں آہستہ آہستہ لوگ اصلاح
کی ضرورت محسوس کرنی شروع کرتے ہیں، اور جوں جوں اصلاح کے حق میں رائے عام

تیار ہوتی جاتی ہے۔ ذہنیت کی تیز رفتار پرواز بڑھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ بالآخر پیچھے قائدوں
کو اپنی جانشینی پر مائل کرتی ہے یا پھر تیز تر رفتار صلاحیت کے تقاضا سے ایک نئی قیادت
(Leadership) کا بجز خود نشوونما پاکر سامنے آجاتی ہے۔ اس عمل کے دوران میں کسی بڑی
کی تعداد میں خونی انقلاب پیدا نہیں ہوتا کہ تعطل کی وہ حالت پیش آئے جس کی بھیانک تصویر
کھینچ کر بعض حضرات سیاسی رسّا کشی اور کشمکش کو لازمی ثابت کیا کرتے ہیں۔

کسی حالت کو مثالی یا آئیڈیل قرار دینے کا اس کے لحاظ سے عمل پر تنقید کرنے کا مطلب
یہ نہیں ہوتا کہ ہم موجودہ حالت سے دفعتہً چھلانگ لگا کر اس مثالی حالت میں پہنچ جانا
چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب عقل آدمی ظاہر ہے کہ ایسی چھلانگ تیز گام کا تصور بھی نہیں کرسکتا،
کیونکہ تیز بہرحال قدم بقدم ہی ہوگا۔ مگر کسی صاحب عقل آدمی سے شاید یہ توقع بھی نہیں کی جا
سکتی کہ وہ جس حالت کو مثالی حالت قرار دیتا ہو اس کے بالکل برعکس حالت کی طرف بڑھنے
پر کسی درجہ میں بھی راضی ہو جائے۔ وہ اگر دونوں حالتوں میں سے بہتر کو ترجیح دیتا ہے تو کم از کم اس
بات کی طلب اور تڑپ ہونی چاہیئے کہ حالات کی رفتار اسی منزل کی سمت میں ہو جسے وہ
مقصود قرار دے رہا ہے۔ خواہ وہ ابتداءً چند قدم ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً اگر میرا خیال یہ ہے کہ
مسلمانوں کے لیے خلافت راشدہ کے طرز کی قیادت، سیاست اور زندگی مثالی کی
حیثیت رکھتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب جو مسلمانوں کا لیڈر ہو وہ فاروق
اعظم سے کم نہ ہو اور اس کے ساتھی سب کے سب علی رضی اللہ عنہ اور ابو عبیدہ بن الجراح
اور عبدالرحمٰن بن عوف کے مثیل ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ ہونا چاہیئے کہ میری
آخری منزل مقصود تو ہو وہ مقام جس پر صحابہ کرام تھے اور اس منزل کی طرف جانے کے لیے
میرے رہبر وہ بنا کریں وہ لوگ جو نہ اس راہ سے واقف ہیں، نہ اس کی طرف جانے کا ارادہ
رکھتے ہیں، بلکہ اس کے عین مخالف سمت میں جا رہے ہیں۔

فرض کیجیے کہ میں سطح زمین سے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو بہرحال
میں وہی ذریعہ تلاش کروں گا جو مجھے اوپر کی طرف لے جاسکتا ہو، خواہ ابتداءً وہ مجھے دس
فیٹ سے زیادہ نہ اٹھائے۔ ایسا ذریعہ مجھے نہ ملے تو میں سطح زمین ہی پر قیام کرنا پسند

ہو ـــــ مگر اب اس کا نام عمل کر کہیں ہو جاتے۔ اس کو پامال ہوتے دیکھ کر
آزادی دوم جا کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ اس کی حمایت کرنے والے کا منہ نوچنے کے لیے دوڑتے
اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ جاتے کہ آئیڈیل تو میرا وہی ہے۔ یہ آئیڈیل کی ایک بالکل ہی نرالی
قسم دریافت ہوئی ہے جس سے ہم اب تک آشنا نہ تھے۔ ہمیں تو یہی معلوم تھا کہ
آئیڈیل انسان کی محبوب ترین چیز ہوتی ہے۔ اس کا نام سن کر دلوں میں حرارت پیدا
ہونے لگتی ہے۔ اگر آدمی اس تک پہنچنے سے عاجز ہوتا ہے تو رنجیدہ اور غمگین ہوتا
ہے۔ اگر کسی مجبوری سے اس کے خلاف چلتا ہے تو شرمندہ ہوتا ہے۔ اور اگر کبھی
اس غلطی پر اسے ٹوک دیا جاتا ہے تو اس کی نگاہ شرم کے مارے اٹھ نہیں سکتی۔ مگر
اب ہمارا تعارف اس نئی قسم کے آئیڈیل سے ہوا ہے۔ جو ہے تو آئیڈیل ہی، لیکن اس کا نام
لیجیے تو چہرے بگڑنے لگتے ہیں، اس کی طرف چلنے کے لیے کہیے تو شدت غضب سے
تیوریاں چڑھ جاتی ہیں، اس کے خلاف چلنے پر ٹوکیے تو شرمندگی کے بجائے کمال
دیدہ دلیری و جسارت کے ساتھ تاویلیں کی جاتی ہیں، اس کی حمایت کرنے والے سے
بڑھ کر نگاہوں میں مبغوض کوئی نہیں ہوتا، اور اسے پامال کرنے والوں سے بڑھ کر محبوب
کوئی نہیں ہوتا۔ ـــــ کیسا عجیب ہے یہ آئیڈیل اور کتنے عجیب ہیں اس کے
پرستار!

طرفہ تماشہ یہ ہے کہ کانگریس اور اس کے نیشنلزم کی مخالفت میں تو اسلام اور اسلامی
تہذیب کا نام لیا جاتا ہے، اور انہی قوتوں کو نعرۂ جنگ بنا کر مسلمانوں کو جنگ کی دعوت
دی جاتی ہے۔ مگر جہاں یہ اسلام اور اس کی تہذیب کا تحفظ کرنے والے جمع ہوتے
ہیں وہاں اسی اسلام کے آئینی ضابطے توڑے جاتے ہیں، اسی تہذیب کو ذبح کیا جاتا
ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی ساری جنگ صرف اس لیے ہے کہ
دوسروں کے ہاتھوں اس تہذیب کا استیصال نہ ہونے پائے بلکہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے
اس کو حلال کریں۔

وہاں مسلمان عورت اسی طرح جاہلیت کے ساتھ شمع انجمن بنی نظر آتی ہے

جس طرح کوئی مسیحی یا کوئی یہودی ہو سکتے ہیں۔ وہاں عین نماز کے وقت جلسے ہوتے
رہتے ہیں اور اگر ہال سے متصل مسجد بھی ہو تب بھی جلسے ہوتے ہیں تو چند لوگوں سے لے کر
پیروؤں تک شاذ و نادر ہی کوئی نماز کے لیے اٹھتا ہے۔ وہاں جا کر وہیں نشست و
برخاست میں، وضع قطع اور پارٹیوں میں اسلامی تہذیب کا کہیں نام و نشان تک
نظر نہیں آتا اور ایک معمولی مسلمان بلکہ حامیانِ اسلام اور مبلغینِ تہذیبِ اسلامی کی
صحبت میں پہنچ کر اپنے آپ کو اتنا ہی اجنبی محسوس کرتا ہے جتنا ہندوؤں اور پارسیوں
کی کسی محفل میں کر سکتا ہے۔ وہاں کے مباحث آپ گھنٹوں سنتے رہیں مگر بھولے سے
بھی کہیں قرآن و حدیث کا ذکر نہیں آئے گا، کسی مسئلے کا حل دریافت کرنے کے لیے
اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع نہ کیا جائے گا، بلکہ قرآن و سنت کا نقطۂ نظر صریح
طور پر ان کے سامنے رکھ دیا جائے تب بھی بے تکلف اس کے خلاف طرزِ عمل اختیار کیا
جائے گا۔ ان کی کمیٹیوں اور ان کے جلسوں میں آپ مسلمان کا ذکر کبھی اس حیثیت سے
نہ سنیں گے کہ اس کا کوئی جماعتی نصب العین بھی ہے، وہ دنیا میں کوئی اخلاقی منصب
بھی رکھتا ہے، اور کوئی نبی مشن بھی اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ ان باتوں کے بجائے
وہاں ساری گفتگو صرف اس حیثیت سے ہوتی کہ مسلمان کے نام سے جو ایک مجموعۂ
افراد پایا جاتا ہے اس کو دنیوی نقصانات سے کس طرح بچایا جائے اور دنیوی فوائد
سے کس طرح متمتع کیا جائے۔ پھر وہ لوگ جو اس جماعت کے سرخیل ہیں ان کا حال کیا
ہے؟ ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپ کو نماز کے وقت کوئی یہ
بتانے والا نہ ملے گا کہ مسجد کدھر ہے، اور اب بہت جلد عشرت سے بھری
ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ ان سے بیٹھ کر ذرا
اسلام کے بنیادی اور اجتماعی مسائل کے متعلق امتحان لیجیے تو شاید کوئی صاحب دو تین
سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں گے، الا ماشاء اللہ۔

کیا وہ جماعت جسے کانگریس اور اس کی تحریک وطنیت سے بچانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے
یہی ہے؟ اور یہی اس کے تحفظ اور احیا کے ڈھنگ ہیں؟ اور انہی طریقوں سے

ایسے ہی رہنماؤں کی قیادت میں اس طرح سے اپنے تک پہنچا جائے گا جسے منتہائے نظر
اور نصب العین قرار دیا جاتا ہے؟ ———— یہ سوال اتنا خطرناک ہے کہ اسے
زبان پر لانا اپنی شامت کو خود دعوت دینا ہے۔ آپ کی زبان سے اسلام اور اس
کی تہذیب کا ذکر نکلتے ہی ہر طرف سے شور برپا ہوگا کہ یہ کیا صاحب نے ہنگامہ بند
کرنی شروع کر دی؟ آخر اس ذکر کا یہ کون سا موقع تھا؟ دیکھتے نہیں کہ ابھی ہم تہذیب
کی مخالفت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ بھلا جمع ہونے کے دوران میں بھی کہیں اس کا
تذکرہ کیا جاتا ہوگا؟

یہ بے دلی اور کم نظری و خود فروشی ہے جسے دیکھ کر غیروں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے
کہ اصل سوال محض معاشی و سیاسی ہے اور تہذیب و مذہب کو محض عام مسلمانوں
کے جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے بہانہ بنایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حالت کو
دیکھ کر کون کہے گا کہ اپنے دین اور کلچر کی محبت میں واقعی آپ مخلص ہیں؟ زبان سے کچھ
کہہ لیں، درد ہے، مگر وقت پر بار بار پیٹ ہی کو پیٹے جاتے ہیں تو دیکھنے والا یہی خیال
کرے گا کہ درد آپ کے پیٹ میں ہے نہ کہ دل میں۔ ایسی ہی باتوں سے ایک قوم
کی ہوا اکھڑتی ہے اور دوسری قوموں کے دل سے اس کا رعب اٹھ جاتا ہے۔

تفرقہ و انتشار اور بے نظمی کے تلخ نتائج دیکھ کر مسلمانوں میں اجتماع و تنظیم اور
مرکزیت کی ضرورت کا احساس تو پیدا ہوا، مگر افسوس کہ عقل و فہم کی کمی نے اس مفید
احساس کو بھی غلط رستے پر لگا دیا۔ عام طور پر لوگ اب اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے
جا رہے ہیں کہ اجتماع اور تنظیم اور مرکزیت بجائے خود رحمت ہیں، لہٰذا جو مرکز سامنے
آئے اس کے گرد جمع ہو جاؤ اور سب مل کر چلو۔ انشاء اللہ کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاؤ گے۔
گویا جس طرح کبھی یہ خبط پیدا ہوا تھا کہ "آرٹ محض آرٹ کی خاطر" اور "ادب محض ادب
کے لیے"، اسی طرح اب یہ ایک نیا خبط پیدا ہو رہا ہے کہ "اجتماع بس اجتماع کی خاطر"
اور "تنظیم محض برائے تنظیم" اور "مرکزیت صرف مرکزیت کے لیے"۔ حالانکہ ان
چیزوں کے مفید ہونے کا تمام تر انحصار اجتماع کی روح اور تنظیم کے اصولوں اور مرکز کی

نوعیت پر ہے۔ کسی غلط لیڈر کے گرد بے مقصد جمع ہو جانا، یا غلط مقصد کے لیے جمع ہونا
بجائے مفید ہونے کے الٹا مضر ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کو اب اچھی طرح سوچ سمجھ کر سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ
تنظیم کا صحیح نظریہ کیا ہے اور وہ کس غرض کے لیے اجتماع اور تنظیم چاہتے ہیں۔

اگر آپ اصلی معنوں میں ایک ایسی مسلم جماعت کی تنظیم چاہتے ہیں جو اسلامی
اصول کی تہذیب کا تحفظ کر سکتی ہو اور بالآخر اسلامی حکومت کی منزل تک پہنچ سکتی ہو،
تو آپ کو جان لینا چاہیے کہ جو صورتِ تنظیم اس وقت بن رہی ہے وہ بالکل غلط ہے۔
اس تنظیم میں جو لوگ سب سے آگے کی صف میں نظر آتے ہیں اسلامی جماعت میں ان
کا صحیح مقام سب سے پیچھے کی صف ہے، بلکہ بعض تو وہاں بھی بمشکل ہی جگہ پا
سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو پیشوا بنانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل کے سب سے
پچھلے ڈبے کو انجن کی جگہ لگا دینا۔ جس جہت میں آپ جانا چاہتے ہیں، یہ تمام قیادت آپ
کی گاڑی کو اس کی طرف ایک انچ بھی لے کر نہیں جا سکتی، البتہ آدمی اپنے وزن سے
آپ نشیب کی طرف لڑھکے گی اور آپ لوگ کچھ مدت تک اس غلط فہمی میں مبتلا
رہیں گے کہ ماشاءاللہ جا رہا ہے انجن، اسے خوب اونچا لیے جا رہا ہے۔ اس حقیقت
کو جتنی جلدی سمجھ لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے، کیونکہ ہر لمحہ جو گزرتا ہے وہ آپ کو اوپر
کے بجائے نیچے کی طرف لے جا رہا ہے۔ جو لوگ آپ کی تہذیب کو جانتے ہی نہیں وہ
اس کا تحفظ کیا کریں گے، جو اس سے عملاً برگشتہ ہیں، کس طرح امید کی جا سکتی
ہے کہ ان کے ہاتھوں سے اس کا احیاء اور استقرار ہو سکے گا؟ وہ اپنی زبان سے جو کچھ
پکارتے ہیں، اگر حقیقت میں وہ ان کے دل میں اٹھا ہوتا تو یقیناً ان کی زندگیاں
بدل گئی ہوتیں، ان کی ذہنیتیں بدل گئی ہوتیں، اور ان کا طرزِ فکر بدل گیا ہوتا۔ یہ
علامت ان کی زندگیوں میں ناپید ہے، اور یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس گروہ
میں حقیقی اسلامی جذبہ ہرگز مشتعل نہیں ہوا ہے۔

اور اگر اسلامی مقصد آپ کے سامنے نہیں ہے بلکہ محض مادی معنی میں ایک

قوم کی حیثیت سے آپ اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں اور اپنے اندر نشو ونما کی شان
پیدا کر کے دوسری قوموں کے ساتھ وسائل و اسباب منفعت میں آپ کا آخری مطمح نظر ہے تو بجز
آپ کو اپنے پیشواؤں میں اسلام کا رنگ دیکھنے کی فرصت نہیں اور مجھے آپ سے کسی بحث
کی فرصت بھی نہیں۔ آپ کا راستہ جدا ہے اور میرا راستہ جدا۔ البتہ ایک بات پھر کہوں گا
جو اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اپنی اس قوم پرستانہ تحریک کے لیے آپ کو اسلام کا نام
استعمال کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اسلام ہر قسم کی قوم پرستی کا دشمن ہے خواہ وہ ہندوستانی
قوم پرستی ہو یا نام نہاد مسلم قوم پرستی۔

بعض حضرات اس قسم کے غیر اسلامی اجتماع اور مرکزیت کے حق میں قرآن و حدیث
سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ جماعت ہے جس کے التزام کا حکم دیا گیا
ہے اور جس سے الگ ہونے یا الگ رہنے پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ لیکن میں حیران ہوں
کہ ایسی ناواقفیت کا اظہار کیا جاتا ہے یعنی اللہ اور رسول کے مقابلہ میں جسارت۔ قرآن تو اس
جماعت میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیتا جس کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہو۔ اور یہاں تقویٰ کا
نام لینے والے جاہل بنے جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوط تھامو۔ اور یہاں
کہا جاتا ہے کہ بس لوگوں کا متفق ہو کر کسی رسی کو تھام لینا ہی ذریعہ نجات ہے۔ قطع نظر
اس سے کہ وہ اللہ کی رسی ہو یا نہ ہو۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ:۔

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ
يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۔

(المائدہ ۵ - آیت ۵۵)

"مسلمانو! تمہارے حقیقی دوست اور ساتھی صرف اللہ اور رسول ہیں اور
وہ لوگ ہیں جو ایمان والے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور
خدا کے آگے جھکنے والے ہیں۔"

پھر یہاں تک کہتا ہے کہ:۔

فَإِنْ تَابُوْا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَإِخْوَانُكُمْ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ سوادِ اعظم کا ساتھ دو۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی اور جس قیادت کی متبع ہے اس کے ساتھ چلنا ضروری ہے۔ لیکن یہ ارشادِ نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے، اس سے مراد دراصل ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو، جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی شریعت اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ضرور ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ ایسے مسلمانوں کی اکثریت کبھی باطل پر مجتمع نہیں ہو سکتی، اور اگر وہ کبھی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو بھی جائے تو اس پر دیر تک جمی نہیں رہ سکتی۔ اسی بنا پر حضور نے سوادِ اعظم کا ساتھ دینے کی تاکید فرمائی۔ مگر جو لوگ دین کی ضروری معلومات سے عاری ہوں اور جن میں کھرے اور کھوٹے کی، باطل و حق کی پرکھ ہی نہ ہو، ان کے گروہ کا نام ہرگز "سوادِ اعظم" نہیں ہے۔ نہ ان کی جماعت اسلامی مفہوم کے اعتبار سے "جماعت" ہے، اور نہ ان کی امارت اسلامی اصطلاح کی رُو سے "امامت" ہے، نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ "مسلمان" سے دھوکا کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم خالص اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوگی ان کی غلط فہمی ماتم کی مستحق ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جنوری ۱۹۴۰ء)

اسلام کی دعوت اور مسلمان کا نصب العین

جب کسی شخص پر بار بار تشنج، ہذیان اور بحران کے دورے پڑتے ہوں اور ہیجانی دوروں میں بھی وہ ہر وقت کسی نہ کسی تکلیف سے بے تاب رہتا ہو تو اس کی حالت کو دیکھ کر عقل مند دو رنگ کے نتیجے اخذ کرتے ہیں۔ وہ اسے محض اوپری تکلیف کا اثر قرار دیتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ خود اس کے اپنے نظامِ جسمانی کے اندر کوئی خرابی موجود ہے؟ وہ تشنج کا علاج ہاتھ پاؤں باندھنے سے، ہذیان کا علاج منہ بند کرنے سے اور بخار کا علاج برف میں دبانے سے کرتے ہیں، یا ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس اصل خرابی کو کھوجیں جو اس کے بدن کی ترکیب میں پیدا ہو گئی ہے اور ساری تدبیریں اسی کو دور کرنے میں صرف کر دیں؟

جہاں تک انفرادی حالات کا تعلق ہے، ہر صاحبِ عقل پہلے طریق پر دوسری صورت ہی اختیار کیا کرتا ہے۔ مگر تعجب اور سخت تعجب ہے کہ جو عقل ایک انسان کو اس حالت میں دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے وہ کہاں ماری جاتی ہے جب پوری جماعت اس کے سامنے اسی حال میں ہو۔ تمام عالمِ انسانی اس وقت ایک شدید بحران میں مبتلا ہے۔ اس پر تشنج کا ایک زبردست دورہ پڑا ہے جس سے ساری دنیا ہل گئی ہے[1]

[1] واضح رہے کہ اس وقت جنگِ عظیم دوم پوری شدت کے ساتھ جاری تھی (جدید)

اور یہ کوئی پہلا دورہ نہیں ہے۔ ایک مدت سے ہم اس پر ایسے ہی دورے پڑتے
ہیں، اور دو دوروں کے درمیان جو وقفہ گزرتا ہے اس میں بھی کبھی وہ چین سے نہیں رہتا۔
ہر وقت کسی نہ کسی درد سے بے چین ہی رہتا ہے۔ مگر باوجودیکہ مدت ہائے دراز سے
یہ صورت حال ساری دنیا میں مشاہدہ کی جارہی ہے، کسی کا ذہن ادھر نہیں جاتا کہ انسانی
تمدن و عمران کی اساس میں ایک بنیادی خرابی موجود ہے۔ ساری دنیا کے ارباب حل و عقد
اپنی اپنی نظریں صرف ان خارجی علامات ہی پر جمائے ہوئے ہیں جو اندرونی خرابی کی وجہ
سے سطح پر نمایاں ہوتی ہیں، اور ہر ایک کو سطح پر جو پھوڑا سب سے زیادہ نمایاں نظر
آتا ہے اسی پر انگلی رکھ کر کہہ دیتا ہے کہ بس اس کا آپریشن کر دو پھر سب کچھ ٹھیک ہو
جائے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ بس ساری گندگی ڈکٹیٹرشپ ہے، اس کو کاٹ دو۔ کوئی کہتا ہے
کہ ساری خرابی امپیریلزم کی وجہ سے ہے، اسے مٹا دو۔ کوئی کہتا ہے کہ سرمایہ داری
نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے، اس کا خاتمہ کر دو۔ ان نادانوں کی عقل کہاں گم ہو گئی ہے؟
یہ شاخوں کو جڑ سمجھ رہے ہیں۔ ان کو خبر نہیں کہ جڑ کہیں اور ہے، اور وہ جب تک
زمین پکڑے رہے گی، شاخیں برابر نکلتی ہی رہیں گی خواہ قیامت تک ان کو کاٹنے میں
وقت صرف کیا جاتا رہے۔

دنیا میں جہاں جو خرابی بھی پائی جاتی ہے اس کی جڑ صرف ایک چیز ہے، اور وہ
ہے اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم کرنا۔ یہی اُمّ الخبائث ہے۔ یہی اصل بیج
کی گانٹھ ہے۔ اسی سے وہ شجرِ خبیث پیدا ہوتا ہے جس کی شاخیں پھیل پھیل کر
انسانوں پر مصیبتوں کے زہریلے پھل ٹپکاتی ہیں۔ یہ جڑ جب تک باقی ہے، آپ شاخوں
کی جتنی چاہیں قطع و برید کر لیں، بجز اس کے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا کہ ایک طرف سے مصائب
کا نزول بند ہو جائے اور دوسری طرف سے شروع ہو جائے۔

ڈکٹیٹرشپ یا مطلق العنان بادشاہی کو مٹایا جائے گا تو حاصل کیا ہوگا؟ یہی نا کہ
ایک انسان یا ایک خاندان خدائی کے مقام سے ہٹ جائے گا اور اس کی جگہ پارلیمنٹ
خدا بن جائے گی۔ مگر کیا فی الواقع اس طریقہ سے انسانیت کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے؟ کیا

ظلم، بدنظمی اور ناانصافی اور ظلم سے وہ جگہ خالی ہے جہاں پارلیمنٹ کی خدائی ہے؟

اگر قومیت کو اختیار کیا جائے گا تو اس کا حاصل کیا ہوگا؟ یہی کہ ایک قوم پر سے دوسری قوم کی خدائی اُتر جائے گی۔ مگر کیا واقعی اس کے بعد زمین پر امن اور خوشحالی کا دور دورہ ہو جاتا ہے؟ کیا وہاں انسان کو چین نصیب ہے جہاں قوم آپ اپنی خدا بنی ہوئی ہے؟

اگر سرمایہ داری کا استیصال ہو جائے گا تو اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ صرف یہ کہ محنت پیشہ عوام مالدار طبقوں کی خدائی سے آزاد ہو کر خود اپنے بنائے ہوئے خداوں کے بندے بن جائیں گے۔ مگر کیا اس سے حقیقت میں آزادی، عدل اور امن کی نعمتیں انسان کو حاصل ہو جاتی ہیں؟ کیا انسان کو وہاں یہ نعمتیں حاصل ہیں جہاں مزدوروں کے اپنے بنائے ہوئے خدا حکومت کر رہے ہیں؟

انفرادی ملکیت سے منہ موڑنے والے زیادہ سے زیادہ بہتر نصب العین جو پیش کر سکتے ہیں وہ بس اتنا ہے کہ دنیا میں مکمل جمہوریت قائم ہو جائے، یعنی لوگ اپنی بھلائی کے لیے آپ اپنے حاکم ہوں۔ لیکن قطع نظر اس سے کہ یہ حالت واقعی دنیا میں رونما ہو سکتی ہے یا نہیں، قابل طلب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت اگر رونما ہو جائے تو کیا اس زمینی جنت میں انسان خود اپنے نفس کے شیطان، یعنی اس جاہل اور نادان خدا کی بندگی سے بھی آزاد ہو جائے گا جس کے پاس خدائی کرنے کے لیے علم، حکمت، عدل، راستی کچھ بھی نہیں، صرف خواہشات ہی خواہشات ہیں، اور وہ بھی اندھی بہری خواہشات۔

غرض دنیا کے مختلف گوشوں میں انسانی مصائب اور پریشانیوں کے جتنے حل بھی سوچے جا رہے ہیں ان سب کا خلاصہ بس اتنا ہی ہے کہ خدائی یا حاکمیت بعض انسانوں سے

---

۱ تجربات شاہد ہیں کہ حقیقی جمہوریت کبھی دنیا میں کہیں قائم نہیں ہو سکی اور عقل و دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا ہونا قطعاً محال ہے۔ (مترجم)

مداخلت سے کبھی درست نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بُت کے ہٹ جانے اور اس کی
جگہ دوسرے بُت کے آ جانے سے حقیقت میں کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ اس
قسم کی تبدیل سے ظاہری تسلی تو ہو سکتی ہے مگر غیر حق پسندگی کی عادت قائم کرنے کا جو نقصان
ایک صورت میں تھا وہی دوسری صورت میں بھی علیٰ حالہٖ باقی رہتا ہے۔

اس نقصان کو دور کرنے اور انسانی زندگی کو حقیقی فلاح و سعادت سے ہمکنار کرنے
کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ غیر اللہ کی حاکمیت سے کلیۃً انکار کیا جائے اور
اُس کی حاکمیت تسلیم کی جائے جو فی الواقع مالک الملک ہے۔ ہر اُس نظام حکومت کو رد کر دیا
جائے جو انسانی اقتدار اعلیٰ کے باطل نظریہ پر قائم ہو، اور صرف اُس نظام حکومت کو
قبول کیا جائے جس میں اقتدار اعلیٰ اُسی کا ہو جو فی الحقیقت مقتدر اعلیٰ ہے۔ ہر اُس حکومت
کے حق حکمرانی کو ماننے سے انکار کر دیا جائے جس میں انسان بذات خود حاکم اور صاحب
امر و نہی ہونے کا مدعی ہو، اور صرف اُس حکومت کو جائز قرار دیا جائے جس میں انسان اصلی
اور حقیقی حاکم کے ماتحت خلیفہ ہونے کی حیثیت قبول کرے۔ یہ بنیادی اصلاح جب
تک نہ ہوگی، جب تک انسان کی حاکمیت، خواہ وہ کسی شکل اور کسی نوعیت کی ہو، جڑ
پیڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دی جائے گی، اور جب تک انسانی حاکمیت کے غیر واقعی
تصور کی جگہ خلافت الٰہی کا واقعی (Realistic) تصور نہ لے گا، اُس وقت تک انسانی
تمدن کی بگڑی ہوئی کل کبھی درست نہ ہو سکے گی، چاہے سرمایہ داری کی جگہ اشتراکیت قائم
ہو جائے، یا ڈکٹیٹرشپ کی جگہ جمہوریت حقیقی ہو جائے، یا امپیریلزم کی جگہ آزادی کی حکومت
خود اختیاری کا قاعدہ نافذ ہو جائے۔ صرف خلافت ہی کا نظریہ انسان کو امن دے سکتا
ہے، اسی سے ظلم مٹ سکتا ہے اور عدل قائم ہو سکتا ہے، اور اسی کو اختیار کر کے انسان
اپنی قوتوں کا صحیح مصرف اور اپنی سعی و جہد کا صحیح رُخ پا سکتا ہے۔ رب العالمین اور عالم
الغیب والشہادۃ کے سوا اور کوئی انسانی تمدن و عمران کے لیے ایسے اصول اور ضوابط تجویز
کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا جو بے لاگ ہوں، جن میں جانبداری، تعصب اور خود غرضی
کا شائبہ تک نہ ہو، جو ٹھیک ٹھیک عدل پر قائم ہوں، جن میں تمام انسانوں کے مفاد اور

حقوق کا یکساں لحاظ کیا گیا ہو، جو ظن و قیاس پر نہیں بلکہ حقائقِ فطرت کے یقینی علم پر مبنی ہوں۔ ایسے ضابطہ کی نعمتوں سے انسان صرف اسی طرح بہرہ ور ہو سکتا ہے کہ وہ خود صاحبِ امر اور قانون ساز بننے کے زعم سے دست بردار ہو جائے، خدا پر اور اس کے بھیجے ہوئے قانونِ زندگی پر ایمان لائے اور اطاعت کی پابندی کا احساس رکھتے ہوئے اُس ضابطہ کو دنیا میں قائم کرے۔

اسلام انسانی زندگی میں یہی بنیادی اصلاح کرنے آیا ہے۔ اس کو کسی ایک قوم سے دلچسپی اور کسی دوسری قوم سے عداوت نہیں ہے کہ ایک کو چڑھانا اور دوسری کو گرانا اس کا مقصود ہو۔ بلکہ اُسے تمام نوعِ انسانی کی فلاح و سعادت مطلوب ہے جس کے لیے وہ ایک عالمگیر ضابطہ پیش کرتا ہے۔ وہ ایک تنگ زاویہ سے کسی خاص ملک یا کسی خاص گروہِ انسانی کو نہیں دیکھتا بلکہ وسیع نظر سے تمام روئے زمین کو اُس کے تمام باشندوں سمیت دیکھتا ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے وقتی حوادث و مسائل سے بالاتر ہو کر اُن اصولی و بنیادی مسائل کی طرف توجہ کرتا ہے جن کے حل ہو جانے سے تمام زمانوں اور تمام حالات و مقامات میں سارے فروعی و ضمنی مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں۔ اسے ظلم کی شاخوں اور فساد کی فروعی شکلوں سے بحث نہیں ہے کہ آج ایک جگہ ایک شاخ کو کاٹنے پر زور صرف کرے اور کل دوسری جگہ کسی دوسری شاخ سے جنگ آزمائی کرنے لگے، بلکہ وہ ظلم کی جڑ اور فساد کے سرچشمے پر براہِ راست حملہ کرتا ہے تاکہ ان شاخوں کی پیدائش ہی بند ہو جائے اور جگہ جگہ ان کی کاٹ چھانٹ کا جھگڑا ہی باقی نہ رہے۔

یہ چھوٹے چھوٹے ضمنی مسائل جن میں آج دنیا کی مختلف قومیں اور جماعتیں الجھ رہی ہیں، مثلاً یورپ میں ہٹلر کا طغیان تمرّد، یا حبش میں اٹلی کا فساد، یا چین میں جاپان کا ظلم، یا ایشیا و افریقہ میں برطانیہ و فرانس کی قیصریت، اسلام کی نگاہ میں ان کی اور ایسے تمام مسائل کی کوئی اہمیت نہیں۔ اُس کی نگاہ میں ایک ہی سوال اہمیت رکھتا ہے۔ وہ تمام دنیا سے یہ چاہتا ہے،

ءَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔

(یوسف - آیت ۳۹)

"متفرق بہت سے خداؤں کی بندگی اچھی ہے یا اُس ایک اللہ کی جو سب پر غلبہ و تسلط رکھتا ہے؟"

جو لوگ پہلی صفت کے پرستار رہے ہیں اسلام اُن سب کو ایک جماعت ہے خواہ وہ آپس میں کتنے ہی مختلف شعبوں میں بٹے ہوئے ہوں۔ اُن کی ایک دوسرے کے خصومت جدید اسلام کی نظر میں ایک فساد کے خلاف دوسرے فساد کی جدوجہد ہے۔ ان میں سے کسی کی دشمنی بھی نفسِ فساد سے نہیں ہے بلکہ فساد کی کسی خاص شاخ سے ہے اور اس لیے ہے کہ جس فساد کا جھنڈا ایک فریق نے بلند کر رکھا ہے وہ سرنگوں ہو اور اس کی جگہ وہ فساد سر بلند ہو جس کا جھنڈا دوسرا فریق اُٹھائے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے فریقوں میں سے کسی کے ساتھ بھی اس کا اشتراکِ عمل نہیں ہو سکتا جو اصل فساد کا دشمن ہو۔ اُس کے لیے تو ایک جھوٹے رب کے پرستاروں اور دوسرے جھوٹے رب کے بندوں میں ترجیح کا سوال ہی نہیں۔ اس کی تو بیک وقت سب سے لڑائی ہے۔ وہ تو اپنا سارا زور صرف ایک ہی مقصد پر صرف کرے گا اور وہ یہ ہے کہ انسان کو متفرق غیر حقیقی ربوں اور الٰہوں کی بندگی سے نکالا جائے اور اس اللہ واحد قہار کی حاکمیت تسلیم کرائی جائے جو فی الحقیقت رَبُّ النَّاس، مَلِکُ النَّاس اور اِلٰہُ النَّاس ہے۔

لفظ "مسلمان" اگر کوئی بے معنی لفظ ہے اور محض قوم کے طور پر انسانوں کے کسی گروہ کے لیے استعمال ہونے لگا ہے، تب تو مسلمانوں کو پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ اپنی زندگی کے لیے جو مقصد چاہیں قرار دے لیں اور جن طریقوں پر چاہیں کام کریں۔ لیکن اگر یہ لفظ اُن لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کو بطور مسلک و مشرب قبول کیا ہے تو یقیناً مسلمانوں کے لیے کوئی نظریہ، کوئی مقصد اور کوئی طریقِ کار اسلام کے نظریہ، مقصد اور طریقِ کار کے سوا نہیں ہو سکتا۔ غیر اسلامی نظریے اور پالیسی اختیار کرنے کے لیے حالاتِ زمانہ اور مقتضیاتِ وقت کا بہانہ کوئی بہانہ نہیں

ہے۔ مسلمان جہاں جس ماحول میں بھی ہوں گے ان کو وقتی ضرورت اور مقامی حالات و
مصلحت سے بہرحال سابقہ پیش ہی آئے گا۔ پھر وہ اسلام آخر کس کام کا اسلام ہے
جس کا اتباع صرف مخصوص حالات ہی میں کیا جاسکے اور جب حالات دگرگوں ہوں
تو اسے چھوڑ کر حسب سہولت کوئی دوسرا نظریہ اختیار کر لیا جائے۔ دراصل تمام
مختلف حالات میں اسلام کے اساسی نظریہ اور بنیادی مقصد کے مطابق طرز عمل اختیار کرنا ہی
مسلمان ہونا ہے اور اگر مسلمان ہر معاشرہ اور ہر حال کو ایک جداگانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے لگیں اور
ہمیشہ ہر تغیر و عمل دیکھ کر ایک نئی پالیسی وضع کر لیا کریں جس کو اسلام کے نظریہ و مقصد سے کوئی
لگاؤ نہ ہو، تو ایسے مسلم ہونے میں اور نامسلمان ہونے میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ ایک مسلک
کی پیروی کے معنی ہی یہ ہیں کہ آپ جس حال میں بھی ہوں آپ کا نقطۂ نظر اور طریق کار اسی
مسلک کے مطابق ہو جس کے آپ پیرو ہیں۔ ایک مسلمان سچا مسلمان اسی وقت ہو
سکتا ہے جب کہ وہ زندگی کے تمام جزوی معاملات اور وقتی حوادث میں اسلامی نقطۂ نظر
اور اسلامی طریقہ اختیار کرے۔ جو مسلمان کسی مرحلۂ عمل میں اسلامی پہلو چھوڑ کر غیر اسلامی
پہلو اختیار کرتا ہے اور یہ عذر پیش کرتا ہے کہ اس مرحلہ اور اس حال میں تو مجھے غیر اسلامی طریقہ
ہی پر کام کر لینے دو، بعد میں جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو مسلمان بن کر کام کرنے
لگوں گا، وہ دراصل یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو اسلام اس کے نزدیک بجائے خود کوئی ایسا ہمہ گیر نظام زندگی
ہی نہیں جتنا جو زندگی کے ہر معاملہ اور زمانہ کی ہر گردش پر یکساں حاوی ہو سکتا ہو، یا پھر اس
کا ذہن اسلام کے سمجھنے میں پوری طرح نہیں منجھا ہے جس کی وجہ سے اس میں یہ صلاحیت
نہیں ہے کہ اصول کی تطبیق جزوی حوادث پر منطبق کر سکے۔ [illegible] کہ مختلف احوال
میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کی پالیسی کیا ہونی چاہئے۔

ایک حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے جب میں اس معیار پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر
اظہار مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ [illegible] افغانستان میں پٹھان
حکمران ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں حکومۃ الناس علی الناس للناس[1]

---

[1] (Government of the People, by the People, for the People)

کے نظریہ کا قائل نہیں ہوں کہ مجھے اس پر مسرت ہو۔ میں اس کے برعکس حکم اللہ علی
الناس بالحق ؎ کا نظریہ رکھتا ہوں۔ اور اس اعتبار سے میرے نزدیک انگلستان
پر انگریزوں کی حاکمیت اور فرانس پر اہل فرانس کی حاکمیت جس قدر غلط ہے، اسی قدر
ترکیا اور مصر کے ملکوں پر ان کے اپنے باشندوں کی حاکمیت بھی غلط ہے۔ بلکہ اس سے
زیادہ غلط، اس لیے کہ جو قومیں اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں ان کا خدائی حاکمیت کے بجائے
انسانوں کی حاکمیت اختیار کرنا اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ غیر مسلم اگر ضالین کے حکم
میں ہیں تو یہ اس طرز عمل کی بنا پر مغضوب علیہم کی تعریف میں آجاتے ہیں۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے
کہ ہندوستان میں جہاں مسلم کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ میرے
نزدیک جو سوال سب سے مقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس "پاکستان" میں
نظام حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریہ جمہوریت کے مطابق
عوام کی حاکمیت پر۔ اگر پہلی صورت ہے تو یقیناً یہ "پاکستان" ہوگا ورنہ بصورت دیگر
یہ ویسا ہی "ناپاکستان" ہوگا جیسا ملک کا وہ حصہ ہوگا جہاں آپ کی اسکیم کے مطابق غیر مسلم
حکومت کریں گے۔ بلکہ خدا کی نگاہ میں یہ اس سے زیادہ ناپاک اس سے زیادہ مبغوض و
ملعون ہوگا، کیونکہ یہاں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے وہ کام کریں گے جو غیر مسلم
کرتے ہیں۔ اگر میں اس بات پر خوش ہوں کہ یہاں رام داس کے بجائے عبد اللہ خدائی
کے منصب پر بیٹھے گا تو یہ اسلام نہیں ہے بلکہ نیشنلزم ہے، اور یہ "مسلم نیشنلزم"
بھی خدا کی شریعت میں اتنا ہی ملعون ہے جتنا "ہندوستانی نیشنلزم"۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں
ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین
ایک ملک ہے۔ انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ اب تک کی

؎ (Rule of God on Man with Justice)

تقسیم اگر جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا؟ یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ ہے جس پر مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی غور و فکر میں اپنا وقت ضائع کرے؟ مسلمان کو تو صرف اس چیز سے بحث ہے کہ یہاں انسان کا سر نظامِ خداوندی کے آگے جھکتا ہے یا نظامِ الناس کے آگے۔ اگر نظامِ خداوندی کے آگے جھکتا ہے تب تو ہندوستان کو اور زیادہ وسیع کیجیے، ہمالیہ کی دیوار کو بیچ میں سے ہٹائیے اور سمندر کو بھی نظر انداز کر دیجیے تاکہ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ سب ہندوستان میں شامل ہو سکیں۔ اور اگر یہ نظامِ الناس کے آگے جھکتا ہے تو جہنم میں جائے ہندوستان اور اس کی خاک کا پرستار، مجھے اس سے کیا دلچسپی کہ یہ ایک ملک بنے یا دس ہزار ٹکڑوں میں بٹ جائے۔ اس بُت کے ٹوٹنے پر تڑپے وہ جو اسے معبود بناتا ہو۔ مجھے تو اگر یہاں ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرّۂ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے۔ انگریزی حاکمیت سے نجات تو صرف لَا اِلٰہ کا ہم معنی ہوگا۔ فیصلہ کا انحصار محض اس نفی پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ اس کے بعد اثبات کس چیز کا ہوگا؟ آج آزادی کی یہ ساری لڑائی صرف اس نفی کی ہے ——— اور حامیانِ حریت میں سے کون صاحب یہ جرأت بولنے کی جرأت رکھتے ہیں کہ اس سے بہتر نہیں ہے ——— کہ امپیریلزم کے اِلٰہ کو ہٹا کر ڈیموکریسی کے اِلٰہ کو بت خانۂ حکومت میں جلوہ افروز کیا جائے تو مسلمان کے نزدیک درحقیقت اس سے کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ لات گیا منات آیا۔ ایک جھوٹے خدا نے دوسرے جھوٹے خدا کی جگہ لے لی۔ اصل کی بندگی جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ کون مسلمان اس کو آزادی کے لفظ سے تعبیر کر سکتا ہے؟ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَمْحُو السَّيِّئَ بِالسَّيِّئِ وَلٰكِنْ يَمْحُو السَّيِّئَ بِالْحَسَنِ اِنَّ الْخَبِيْثَ لَا يَمْحُو الْخَبِيْثَ

؎ یہ صرف نفی ہے جس کا مطلب ہے کہ مسلمان ... سے نہیں بلکہ ... ہے۔ ایک ناپاک کو ... دوسرا ناپاک اس کی جگہ لے لے تو پاکی کیسی؟

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی وہ مختلف جماعتیں جو اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنسِ کاسد نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا قدیم طرز کے مذہبی رہنما، دونوں ہی اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ دونوں اپنے اصل ہدف کو چھوڑ کر ہوا میں بے ہوائی تیر چلا رہے ہیں۔ ایک گروہ کے دماغ پر ہندو کا ہَوّا سوار ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہندو امپیریلزم کے چنگل سے بچ جانے کا نام نجات ہے۔ دوسرے گروہ کے سر پر انگریز کا بھوت مسلط ہے اور انگریزی امپیریلزم کے جال سے نکل بھاگنے کو نجات سمجھ رہا ہے۔ ان میں سے کسی کی نظر بھی مسلمان کی نظر نہیں، ورنہ وہ دیکھتے کہ اصل شیطان نہ یہ ہے نہ وہ، اصل شیطان غیر اللہ کی حاکمیت ہے۔ اس سے نجات نہ پائی تو کچھ نہ پایا۔ وقت ہے کہ اس کو مٹانے کے لیے اٹھو۔ جو تیر چلانا ہے اُسی ہدف کی طرف شست باندھ کر چلاؤ۔ جس قدر قوت صرف کرنی ہے اسے اس کے مٹانے پر صرف کرو۔ اس کے سوا جس کام میں بھی تم اپنی ساعی صرف کرو گے وہ اسی طرح پراگندہ اور ضائع ہو کر رہیں گی جس طرح ان لوگوں کی ساعی جن کے متعلق قرآن فیصلہ کرتا ہے کہ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔ (الکہف۔ آیات ۱۰۳ تا ۱۰۵)

مغربی طرز کے لیڈروں پر تو چنداں حیرت نہیں کہ ان بے چاروں کو قرآن کی ہوا تک نہیں لگی ہے۔ مگر حیرت اور سخت حیرت ہے اُن علمائے کرام پر جن کا رات دن کا مشغلہ ہی قال اللہ و قال الرسول ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ قرآن کو کس نظر سے پڑھتے ہیں کہ ہزار بار پڑھنے کے بعد بھی انھیں اس مسلک اور اس پالیسی کی طرف ہدایت نہیں ملتی جو مسلمان کے لیے اصولاً مقرر کر دی گئی ہے۔ جن

مسائل کو جن کو ہم نے اتنا اہم قرار دے رکھا ہے، قرآن میں ہم ان کی طرف ادنیٰ اور خفیف اہمیت کا بھی ذکر نہیں پاتے۔ جن مسائل پر سب سے پہلے ہیں جو انہوں نے دہلی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقد فرمائی اور تڑپ تڑپ کر تقریریں کیں، اس نوعیت کے مسائل کہیں اشارۃً بھی قرآن میں زیر بحث نہیں آتے۔ برعکس اس کے قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر نبی آتا ہے اور ایک ہی بات کی طرف اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے، یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ[1] خواہ بابل کی سرزمین ہو یا ارضِ سدوم، یا مکہ و مدین، یا جزیرۃ العرب، یا نیل کی وادی۔ خواہ وہ چالیسویں صدی قبل مسیح ہو، یا بیسویں یا دسویں۔ خواہ وہ غلام قوم ہو یا آزاد، شکستہ و درماندہ ہو یا تمدنی و سیاسی حیثیت سے بام عروج پر، ہر جگہ، ہر زمانہ میں، ہر قوم میں اللہ کی طرف سے آنے والے رہنماؤں نے انسان کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کی اور وہ یہ تھی کہ "اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے"۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعاون، کوئی اشتراک عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم اس اصل الاصول کو تسلیم نہیں کرتے۔ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (الممتحنہ، آیت ۴) حضرت موسیٰ نے فرعون کے پاس جا کر اَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کا مطالبہ کرنے سے پہلے اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الاعراف ۱۰۴) کا اعلان کیا اور هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (النازعات ۱۸-۱۹) کی دعوت دی، اور اسے بتایا کہ تو رب نہیں ہے بلکہ رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور جینے کا طریقہ بتایا رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (طٰہٰ ۵۰)۔ حضرت عیسیٰ نے، جن کی قوم رومیوں کی غلام ہو چکی تھی، بنی اسرائیل اور آس پاس کی قوموں کو رومن امپیریلزم کے خلاف جنگ آزادی کے جھنڈے

---

[1] اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔

کی طرف دعوت دی، بلکہ اس چیز کی طرف دعوت دی کہ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ
فَاعْبُدُوْہُ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (آل عمران)۔ حالانکہ ہر جگہ پیدا شدہ تھا
جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں، کسی اور دنیا کے نہیں، اسی دنیا کے ہیں جس میں ہم بستے
ہیں، اور ایسے ہی انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے ہم انسان ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا
کہ ان ملکوں اور قوموں میں انبیاء علیہم السلام آئے ان میں سرے سے کوئی سیاسی،
معاشی، تمدنی مسئلہ حل طلب تھا ہی نہیں جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہوتی۔ پس جب
یہ واقعہ ہے کہ اسلامی تحریک کے پیرو رہنما نے ہر ملک اور ہر زمانے میں تمام وقتی اور
مقامی مسائل کو نظر انداز کر کے اسی ایک مسئلہ کو آگے رکھا اور اسی پر اپنا سارا زور صرف
کیا تو اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ اُم المسائل تھا
اور اسی کے حل پر زندگی کے تمام مسائل کا حل موقوف سمجھتے تھے۔

اب یا تو یہ کہہ دیجیے کہ اسلامی تحریک کے یہ رہنما جو خدا کی طرف سے آئے تھے،
سب کے سب عمل سیاسیات سے نابلد تھے، نہ جانتے تھے کہ انسانی زندگی کے
معاملات میں کون سی چیز مقدم اور کون سی مؤخر ہونی چاہیے، اور انہیں خبر نہ تھی
کہ آزادی کے لیے جدوجہد کس طرح کی جاتی ہے اور ملی معاملات کو حل کرنے کی
کیا تدبیریں ہیں۔ یا پھر تسلیم کیجیے کہ اس دور میں جو حضرات اسلام کے نام سے
اور مسلمانوں کے قائد و رہنما بنے ہوئے ہیں وہ خواہ کیسا ہی تبحر اور کتنا ہی تقدس رکھتے ہوں،
بہرحال اسلامی تحریک کے مزاج کو وہ نہیں سمجھے اور نہیں جانتے کہ اس تحریک کو
چلانے اور آگے بڑھانے کا طریقہ کیا ہے۔

تمام مسلمانوں کو جان لینا چاہیے کہ بحیثیت ایک مسلم جماعت ہونے کے ہمارا تعلق
اسی تحریک سے ہے جس کے رہبر و رہنما انبیاء علیہم السلام تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص
نظامِ فکر اور ایک خاص طریقِ کار ہوتا ہے۔ اسلام کا نظامِ فکر اور طریقِ کار وہ ہے جو ہم
کو انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ ہم خواہ کسی ملک اور کسی زمانے میں ہوں،
اور ہمارے گرد و پیش زندگی کے مسائل و معاملات خواہ کسی نوعیت کے ہوں، ہمارے

یہ مقصود و نصب العین وہی ہے جو انبیاء کا تھا، اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے جس پر انبیاء ہر زمانے میں چلتے رہے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ ۔ (الانعام ۹۰) ہمیں زندگی کے سارے معاملات کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے جس سے انہوں نے دیکھا۔ ہمارا عقیدہ وہی ہونا چاہیے جو ان کا تھا۔ اور ہماری اجتماعی پالیسی انہی خطوط پر قائم ہونی چاہیے جن پر انہوں نے قائم کی تھی۔ اس مسلک کو چھوڑ کر اگر ہم کسی دوسرے مسلک کا طریقہ اور طرزِ عمل اختیار کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے۔ یہ بات ہمارے نزدیک بدیہی ہے کہ ہم کسی تنگ زاویہ سے دنیا پر نگاہ ڈالیں جس سے ایک قوم پرست، یا ایک جمہوریت پسند یا ایک اشتراکی اس کو دیکھتا ہے۔ جو چیزیں ان کے لیے منتہائے نظر ہیں وہ ہمارے لیے اتنی پست ہیں کہ ادنیٰ التفات کی بھی مستحق نہیں۔ اگر ہم ان کے سے طرز فکر اختیار کریں گے، انہی کی زبان میں باتیں کریں گے، اور انہی کے سے مقاصد پر زور دیں گے جن پر وہ زور دیتے ہیں تو اپنی وقعت اپنے ہی ملک میں کھو دیں گے۔ شیر اگر بکری کی سی بولی بولنے لگے اور بزغالوں کی طرح گھاس پر ٹوٹ پڑے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جنگل کی بادشاہی سے وہ آپ ہی دست بردار ہو گیا۔ اب وہ اس کی توقع کیسے کر سکتا ہے کہ جنگل کے لوگ اس کی وہ حیثیت تسلیم کریں گے جو شیر کی ہونی چاہیے؟ یہ تعداد کی بنا پر قومی حکومت کے مطالبے، یہ اکثریت و اقلیت کے نعرے، یہ تحفظات اور حقوق کی چیخ پکار، یہ انگریزی سلطنت اور دیسی ریاست کے خلاف مدافعت میں قومی حد کے تحفظ کی تدبیریں، اور دوسری طرف گاندھی جی کے نعرے اور پنڈت نہرو کے نعروں میں امپیریلزم کی مخالفت، یہ سب ہمارے لیے بکری کی بولیاں ہیں۔ یہ بولیاں بول کر ہم خود ایک غلط حیثیت اختیار کرتے ہیں اور اپنی حیثیت اس قدر غلط طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ دنیا ہمیں بکری ہی سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ خدا نے ہمیں اس سے بہت اونچا منصب دیا ہے۔ ہمارا منصب یہ ہے کہ ہم لوگوں

---

[1] یہی لوگ تھے جن کی اللہ نے رہنمائی کی تھی بس تم ان کی ہدایت کی پیروی کرو۔

اصلی مسلمانوں کے لیے ایک ہی راہِ عمل

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام تمام عالمِ انسانی کے لیے بنیادی اصلاح کا ایک پیغام اور عملِ اصلاح کا ایک انقلابی پروگرام لے کر آیا ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان خدائے وحدہٗ لاشریک کی حاکمیت تسلیم کریں حتیٰ کہ اس کے حکم کے سوا ہر دوسرا حکم باطل ہو جائے۔ اور اس کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں وہ ایک جتھا بنا کر اپنا پورا زور اس بنیادی اصلاح کو عملاً نافذ کرنے میں صرف کر دیں، یہاں تک کہ شخصوں کی، خاندانوں اور طبقوں کی، قوموں اور نسلوں کی فرماں روائی اور جمہور کی حکومت خود اختیاری بالکلیہ مٹ جائے اور خدا کی سلطنت میں اُس کی رعیت پر صرف اُسی کا قانون جاری ہو۔ یہی پیغام اور یہی پروگرام انبیاء علیہم السلام ابتدا سے لے کر آتے رہے ہیں۔ اسی ایک مقصد پر انہوں نے اپنی تمام سعی و جہد کو مرکوز کیا ہے۔ اور مسلمان جو انبیاء کے وارث اور ان کے پیرو ہیں، ان کے سامنے بھی اس کے سوا نہ کوئی دوسرا مقصد ہے اور نہ کوئی دوسری راہِ عمل۔ مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں پر مجھے جو کچھ اعتراض ہے وہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو مسلم (یعنی متبعِ انبیاء) سمجھنے کے باوجود انہوں نے اس نصب العین اور اس راہِ عمل کو چھوڑ کر ایسے مقاصد اور طریقے اختیار کر لیے ہیں جن کا اسلام سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

نئی روشنی کا پرزور ہو اسلام کے علم سے بالکل ہی بے بہرہ ہیں، آج تک بجز کسی
مسلمان، خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، ایسا نہیں ہے جس نے اس اصول کو حق کر
اصولی حیثیت سے تسلیم نہ کیا ہو۔ سب مانتے ہیں کہ بلاشبہ مسلمان کا اصل کام یہی ہے، اور
اسی منزل کی طرف انبیاء علیہم السلام نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ لیکن جواب میں دو مختلف
سمتوں سے دو مختلف آوازیں آتی ہیں۔

"آزادی پسند" علماء اور ان کے ہم خیال مسلمان، اس راستہ پر آنے کی مشکلات یوں
بیان فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر صرف مسلمان آباد ہوتے، یا مسلمانوں کی بھاری اکثریت
ہوتی، جیسی مصر، ایران، عراق وغیرہ ممالک میں ہے، تب تو ہمارے لیے آسان تھا کہ حکومت
الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتے، اور اس صورت میں اس کے قائم ہونے کا امکان بھی تھا۔ مگر
مشکل یہ ہے کہ یہاں ہم قلیل التعداد ہیں، اکثریت غیر مسلم ہے، حکومت الٰہیہ کے نام
سے ان کو پرخاش رہتی ہے۔ اور صرف مشترک وطنی حکومت ہی کے نصب العین تک
اس کی نظر جا سکتی ہے۔ اوپر انگریزی حکومت بیٹھی ہے جو ہمیں اور غیر مسلم ہمسایوں کو
ایک ساتھ دبائے ہوئے ہے۔ خود مسلمانوں کی آبادی کا کثیر حصہ بھی اخلاقی و اقتصادی
حیثیت سے انتہائی تنزل کی حالت میں ہے۔ لہٰذا اس وقت جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے
کہ مشترک حکومت کے نصب العین کو قبول کر کے، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر، انگریزی اقتدار
سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد آزاد ہندوستان میں ہم اپنی قوتوں
کو مجتمع کریں گے اور اپنے نصب العین کے لیے جدوجہد شروع کر دیں گے۔ اس کے سوا
اور کوئی راستہ اس وقت قابل عمل نہیں ہے۔

دوسری طرف مسلم لیگ اور اس کے ہم خیال لوگ، انہی مشکلات کو ایک دوسرے رنگ
میں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں اقلیت قلیل التعداد ہیں، پھر تعلیمی اور معاشی
حیثیت سے ہماری قوت بہت کم ہے، اور ہمارے مقابل ایک ایسی تنگ نظر اکثریت
نے سیاسی اور معاشی قوتوں کے منابع پر تسلط حاصل کر لیا ہے جو ہماری قوم کو ایک الگ
قوم کی حیثیت سے تعلیم حاصل کرنے اور پیٹ بھرنے کے ہر ذریعہ سے محروم رکھنا چاہتی ہے۔ مگر

سیاسی اغراض کے لیے صرف ہمارے مستقل قومی وجود سے انکار کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ ہم "ہندوستانی قوم" میں شامل ہو کر بس ایک ایسی جمہوری حکومت قائم ہو جانے دیں جس میں سیاسی طاقت کے حصول کا ذریعہ محض ووٹوں کی کثرت ہو۔ اس مقصد میں اس کے کامیاب ہو جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنی قومی شخصیت ہی کو سرے سے کھو دیں، پھر حکومتِ الٰہیہ کا خواب کہاں دیکھا جا سکے گا؟ لہٰذا درست یہی ہے کہ سوال کی قابلِ عمل صورت یہی ہے کہ جس طرح دنیا کی اور سب قومیں اپنی تنظیم کیا کرتی ہیں اسی طرح ہم بھی اپنی تنظیم کریں، اور دنیا میں جس طرح سیاسی لڑائی لڑی جاتی ہے اسی طرح ہم بھی لڑ کر سب سے پہلے ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے، اسی جمہوری دستور کے مطابق جو انگریزی حکومت جمہوریت کے تحت بنا رہی ہے، اپنی حکومت قائم کر لیں۔ بعد میں جب اختیارات ہمارے ہاتھ میں آ جائیں گے تو ہم مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اخلاق و تمدنی حالت کو درست کر کے رفتہ رفتہ حکومتِ جمہوریہ کو حکومتِ الٰہیہ میں تبدیل کر لیں گے، اور اللہ نے چاہا تو پھر باقی ہندوستان کی بازیافت کے لیے بھی جد و جہد کرتے رہیں گے۔

بظاہر دونوں فریقوں کے خیالات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر انہی دو گروہوں میں بھٹکے ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن مشکلات کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں ان میں قطعاً کوئی وزن نہیں ہے بلکہ خود یہی بات کہ حکومتِ الٰہیہ کے رستے میں انہیں اس نوعیت کی مشکلات نظر آتی ہیں اس امر کا ثبوت ہے کہ انہوں نے اسلامی تحریک کے مزاج اور اس کے طریقِ کار (Technique) کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔ زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں، اگر اس تحریک کی تاریخ ہمارے سامنے ہو تو بادی النظر ہی میں ان خیالات کی غلطی نمایاں ہو جاتی ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی مسلمان آیا ہے اکیلا ہی آیا ہے۔ اقلیت اور اکثریت کا کیا سوال، یہاں سرے سے کوئی مسلمان تو موجود ہی نہ تھا۔ ایک نئی قوم بلکہ ایک

نہ دیا کی حیرت انگیز عقیدت کے ساتھ رسول پر وحی سے کہا جاتا ہے کہ کوئی زمین پر خدا کی بادشاہت
قائم کرنے آیا ہوں۔ چند گنے چنے آدمی اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور یہ آٹے میں نمک سے
بھی کم اہمیت، طرح طرح کی سختیاں سہتے ہوئے جدوجہد کرتی ہے۔ اکثریت کا منصوبہ اس کے ساتھ جو
کچھ سلوک کرتا ہے، اس کے مقابلے میں ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کے اس جبر و تسلط
کی سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے جس کا ذکر کرتے کرتے ہمارے مسلم قوم پرست
بھائیوں کے منہ خشک ہوئے جاتے ہیں۔ دفتروں کی ملازمت، منڈیوں کے کاروبار،
اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ملازمت کا کیا ذکر، وہاں سانس لینے کا حق بھی اس اہمیت کو نہیں
دیا جاتا تھا۔ پھر حکومت، خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، جس بے پناہ ظلم و شکنجۂ جبر میں ان کو کستی تھی اس
کو کسی معنی میں بھی ہندوستان کے ان انگریز فرمانرواؤں کے برتاؤ سے تمثیل نہیں دی جا
سکتی جن کے ظلم و جفا سہتا ہمارے آزادی پسند بھائی یاد دلایا کرتے ہیں۔ پھر
یہ بھی کچھ ضروری نہ تھا کہ بہر حال رسول اور اصحاب رسول حکومت الٰہیہ قائم کرنے میں کامیاب
ہو ہی گئے ہوں۔ ہو سکتا تھا وہ اس مقصد میں ناکام ہو گئے ہیں۔ ان کو اور ان کے ساتھیوں
کو قتل کر دیا گیا ہے، اور خدا کے دشمنوں نے اپنی دانست میں اس تحریک کا
قلع قمع کر کے چھوڑا ہے۔ مگر اس کے باوجود جو لوگ اللہ پر ایمان لائے تھے، اور جن کے
نزدیک کرنے کا کام بس یہی تھا، انہوں نے آخری سانس تک اس مقصد کے لیے کام کیا
اور کسی مرحلہ میں بھی اکثریت کا یا حکومت کا رنگ دیکھ کر، یا وقتی و مقامی مشکلات کا خیال
کر کے دوسرے راستوں کی طرف ادنیٰ التفات تک نہ کیا۔

پس یہ بالکل غلط ہے کہ اس تحریک کو اٹھنے اور چلنے کے لیے خارج
میں کسی معاون اور ماحول میں کسی سازگاری کی ضرورت ہے۔ جس سامان اور جس سازگار
ماحول کو لوگ ڈھونڈتے ہیں وہ نہ کبھی فراہم ہوا ہے، نہ فراہم ہوگا۔ دراصل خارج میں
نہیں بلکہ مسلمان کے اپنے باطن میں ایمان کی ضرورت ہے۔ اس قلبی شہادت کی ضرورت
ہے کہ یہی مقصد حق ہے، اور اس عزم کی ضرورت ہے کہ میرا جینا اور مرنا اسی مقصد کے
لیے ہے۔ یہ ایمان، یہ شہادت، یہ عزم موجود ہو تو دنیا بھر میں ایک اکیلا انسان یا

کرنے کے لیے کافی ہے کہ کوئی زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی پشت
پر کسی منظم جمعیت یا کسی حکومت اور اقتدار رکھنے والی اکثریت کی تقاضا کی حاجت نہیں
وہ اس امر کی کیا حاجت ہے کہ اس ملک پہ بیرونی قوم کے تسلط سے آزاد ہو جائے۔
بیرونی قوم کیا، اور گھر کی قوم کیا، اللہ کے سوا دوسروں کی حاکمیت تسلیم کرنے والے سب مخالف
اس کے لیے یکساں ہیں۔ سب کی نفی سے اس کی سب سے یکساں لڑائی ہے۔
حضرت مسیح علیہ السلام سے یہودیوں نے جو کچھ برتاؤ کیا، اس سے زیادہ برا سلوک ہو سکتا تھا
وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کی اپنی قوم نے کیا۔

یہ تو وہ بات ہے جو ہماری نظر میں ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس نے قرآن کو سمجھ کر
پڑھا ہے۔ لیکن ذرا زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس نوعیت کی مشکلات
کے یہ لوگ اپنی راہ میں حائل پاتے ہیں وہ دراصل ایک قوم کی مشکلات ہیں نہ کہ ایک تحریک
کی۔ جہاں ایک قوم اپنی زندگی اور اپنی قومی اغراض کے لیے جدوجہد کر رہی ہو وہاں تو
بلاشبہ اسی قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ان سوالات میں بڑی اہمیت
ہوتی ہے کہ جس ملک میں وہ آباد ہے وہاں اس کی تعداد کتنی ہے؟ اس میں تنظیم ہے یا
نہیں؟ اس کی تعلیمی حالت کیسی ہے؟ اس کی معاشی حالت کیسی ہے؟ اس کے اوپر
ایک جابر قوت ہے یا دو جابر قوتیں؟ انہی سوالات کے جواب پر اس کا مستقبل منحصر
ہوتا ہے، اور انہی سوالات کے لحاظ سے اس کو اپنی پالیسی متعین کرنی پڑتی ہے۔ مگر
ایک اصولی تحریک جو کسی خاص قوم کی اغراض سے وابستہ نہ ہو بلکہ انسانی زندگی کی صلاح
و فلاح کے لیے وہ ایک دعوت لے کر اٹھی ہو اس کے سامنے ان سوالات میں سے کوئی
سوال بھی نہیں ہوتا۔ اس کے مسائل کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اس کی کامیابی و
ناکامی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کے اصول بجائے خود معقول ہیں یا نہیں؟ وہ انسانی
زندگی کے مسائل کو کہاں تک حل کرتے ہیں؟ وہ عام عقلِ سلیمِ انسانی کو کس حد تک
اپیل کرتے ہیں؟ اور اس کی طرف دعوت دینے والے خود اس کی پیروی میں کتنے مخلص
اور کتنے صادق العزم ہیں؟

مسلمانوں کو جو کچھ بھی پریشانی پیش آ رہی ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ ان کے سوچنے
والے دماغوں نے اپنی حیثیت کو ان دو مختلف حیثیتوں کے درمیان گڈمڈ کر دیا ہے۔
کبھی تو یہ ان عزائم اور مقاصد کا اظہار کرتے ہیں جن کا تعلق اسلامی تحریک سے ہے اور
ان کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک اصولی تحریک کے پیرو اور داعی ہیں۔
اور کبھی یکایک ایک قوم بن کر رہ جاتے ہیں، اسی طرح سوچنے لگتے ہیں جس طرح قومیں سوچا
کرتی ہیں، ایسے مسائل میں الجھ جاتے ہیں جو صرف قوموں ہی کو پیش آتے ہیں، اور ٹھیک اسی
طرز فکر کی وجہ سے ان مشکلات کو پیدا کر لیتے ہیں جو صرف قومی مقاصد ہی کے لیے پیدا
ہوا کرتی ہیں۔ یہاں لوگوں نے آج تک ان دونوں حیثیتوں کے فرق کو نہیں سمجھا، نہ واضح
طور پر فیصلہ کیا کہ دراصل وہ ہیں کیا۔ اسی لیے کوئی ایسی پالیسی ابھی تک اپنے لیے متعین
نہ کر سکے جو تناقض سے خالی اور الجھاؤ سے پاک ہو۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ قومیت اور قومی اغراض قابل تبلیغ چیزیں نہیں ہیں۔ خواہ
جرمنیت ہو، اطالویت، انگریزیت یا ہندوئیت کے متعلق کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ان کی
طرف دوسروں کو دعوت دی جا سکتی ہے۔ یہ ایسے اصول نہیں ہیں کہ ہر انسان کے سامنے انہیں
پیش کیا جا سکے۔ یہ تو نسل، تاریخ اور تمدن کے بنے ہوئے بے لچک دائرے ہیں۔ ان دائروں
کے مفاد اور مقاصد سے جو کچھ بھی دلچسپی ہو سکتی ہے انہی لوگوں کو ہو سکتی ہے جو انہی دائروں کے
اندر پیدا ہوئے ہوں۔ دوسرے دائروں کے لوگوں کو ان سے دلچسپی ہونے کی کوئی وجہ نہیں
ہے۔ ایک جرمن اپنی جرمنیت کی بنیاد پر کوئی کام کرنا چاہے تو وہ علاوہ جرمنوں کے کس سے
ہمدردی و اعانت کی توقع کر سکتا ہے۔ انگریز کو کیا پڑی ہے کہ وہ جرمنیت کی سربلندی یا اس کی
برتری کے معاملے میں اس کا ساتھ دے۔ جرمنوں کا بول بالا کرنے کی تڑپ تو صرف جرمنوں
ہی میں پیدا ہو سکتی ہے۔ اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ اس کے مقابلہ میں انگریز بھی متحد
ہو کر اپنا بول بالا کرنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔ یہ ممکن ہے کہ دونوں فریق
ایک دوسرے کے بعض افراد کو خرید کر اپنا آلہ کار بنا لیں۔ مگر یہ ممکن نہیں
ہے کہ انگریز جرمنیت پر ایمان لے آئیں، یا جرمنوں کا دل نرم ہو جائے اور وہ انگریزیت اختیار

اسلام کی راہِ راست اور اس سے انحراف کی راہیں

مسلمانوں میں سے جو لوگ پاکستان کے نصب العین پر اپنی نظر جمائے ہوئے ہیں اور جو انگریزی حکومت سے ہندوستان کی آزادی پر اپنی تمام ہمتیں مرکوز کیے ہیں، اور جو ان دونوں کے درمیان مختلف راہیں تلاش کر رہے ہیں، ان سب کے اندر ایک چیز مجھے مشترک نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اسلام کے اصل نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے یہ سب لوگ جھجکتے ہیں۔ غالباً اس کا ایک بہت بڑا سبب ان کو اس راستہ میں مشکل نظر آتی ہے اور اس کی دقتوں کو دیکھ کر وہ یا تو دوسری جانب مڑ جاتے ہیں یا بیچ کے راستوں سے نکل جاتے ہیں۔ مگر میں علیٰ وجہ البصیرت یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی نصب العین تک کسی بیچ کے راستے سے پہنچنا ناممکن ہے۔ اس کی طرف اگر پیش قدمی کی جا سکتی ہے تو براہِ راست ہی کی جا سکتی ہے۔ اور جو مشکلات اس راستہ میں نظر آتی ہیں وہ ناقابلِ عبور نہیں ہیں، بشرطیکہ ان کو صحیح طور سے سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس مختصر سے مقالہ میں میرا مقصد یہ ہے کہ میں اس کا تجزیہ کر کے ایک ایک جزء پر الگ الگ بحث کروں گا۔

۱۔ اصل اسلامی نصب العین کیا ہے؟

پھر رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ لوگوں کو نظام اطاعت (دین) اور اس

[illegible]

اطاعتیں ایک بڑے قانون کے ماتحت ہو جائیں، تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت
کے تابع ہوں اور سب کو منظم (Organise) کرنے والا ایک اللہ ہی کا قانون ہو،
اور اس بڑی اطاعت اور اس ضابطۂ قانون کی حد سے باہر کوئی اطاعت باقی نہ رہے۔

یہ رسول کا مشن ہے اور رسول اس مشن کو پورا کرنے پر مامور ہے، خواہ شرک کرنے
والے اس پر کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں۔ شرک کرنے والے ان میں بہت سے لوگ ہیں جو
اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری مستقل بالذات
(یعنی خدا کی اطاعت سے آزاد) اطاعتیں شریک کرتے ہیں۔ جہاں تک اللہ کے قانون
طبیعی (Law of Nature) کا تعلق ہے، ہر انسان خواہ کوئی ہو اس کی اطاعت کر رہا
ہے کیونکہ اس کے بغیر تو اس کے لیے کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ مگر جہاں تک انسان کے
دائرۂ اختیار کا تعلق ہے، اس دائرے میں بعض انسان تو بالکل ہی غیر اللہ کے مطیع بن
جاتے ہیں اور بعض انسان اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے کسی حصے میں خدا کے
بھیجے ہوئے قانون اخلاق (شریعت) کی اطاعت کرتے ہیں اور کسی دوسرے حصے میں
اپنے نفس یا دوسروں کی اطاعت پر چلتے ہیں۔ اسی چیز کا نام اللہ کی اطاعت کے ساتھ
دوسری اطاعتوں کو شریک کرنا ہے۔ اور یہ لوگ شرک کی ان مختلف صورتوں میں مبتلا
ہیں ان کو یہ بات ناگوار ہوتی ہے کہ اپنی فطری اطاعت کی طرح اپنی اختیاری اطاعت و
بندگی کو بھی بالکلیۃً اللہ کے لیے خاص کر دیں۔ خواہ نادانی کے سبب سے یا اخلاقی
کمزوری کے سبب سے، بہرحال وہ شرک پر اصرار کرتے ہیں۔ لیکن اللہ کے رسول پر یہ فرض
عائد کیا گیا ہے کہ وہ ان لوگوں کی کراہت کے باوجود اپنے مشن کو پورا کرے۔

۴۔ اس نصب العین تک پہنچنے کا سیدھا راستہ

یہ ہے اسلامی نصب العین، اور اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے
کے لیے سیدھا راستہ وہی ہے جو اللہ کے رسول نے اختیار کیا، یعنی یہ کہ لوگوں کو ابتداءً
اللہ وحدہ لا شریک کی طرف دعوت دی جائے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے اپنی بندگی و

اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر لیں، دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک
کرنا چھوڑ دیں، اللہ کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنا لیں جو ایک ضمیر و جذبہ بن
جائے۔ پھر یہی حال قوم کی اخلاق، علم، معاشرت اور تمدن سے جو اس کے اصولوں میں ہوں،
دینِ حق (الاسلام) کے قائم کرنے کے لیے جہاد و تکبیر کرے، یہاں تک کہ اللہ کے سوا دوسری
اطاعتیں جو ان طاقتوں کے بل پر قائم ہیں ان سب کا زور ٹوٹ جائے اور پورے
نظامِ اطاعت پر یہ "الہدیٰ" اور "دینِ حق" غالب ہو جائے۔

اس دعوت کا ہر جز قابلِ غور ہے۔

پہلا جز یہ ہے کہ انسانوں کو بالعموم اللہ کی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس
کے بھیجے ہوئے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔ یہ دعوت عام
ہونی چاہیے، ہر قسم کی ہونی چاہیے، اور اس کے ساتھ دوسری غیر متعلق باتوں کی
آمیزش نہ ہونی چاہیے۔ قومی اور نسلی اور وطنی سیاسی جھگڑے، خود اپنے سیاسی
اور معاشی مفادات کی بحثیں، غیر الٰہی نظامات میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا، یا
کسی ایسے نظامِ فاسد کو درست ثابت کرنا، یا کسی نظامِ فاسد میں اپنی جگہ بنانے
کی کوشش کرنا، یہ سب چیزیں اس دعوت پر کہ "الہدیٰ" اور "دینِ حق" اس کے ساتھ میل نہیں
کھاتیں بلکہ صریح طور پر اس کے منافی اور اس کے لیے موجبِ ضعف و زوال ہیں۔ پس جب کسی
شخص یا گروہ کو صرف حق کی دعوت اور خدمتِ دینی پر اترنا ہے تو ان تمام جھگڑوں اور بحثوں
سے الگ ہو جانا چاہیے اور اپنی دعوت کے ساتھ کسی دوسرے غیر متعلق دعوے کو
قطعی شامل نہ کرنا چاہیے۔

دوسرا جز یہ ہے کہ جماعت صرف ان لوگوں کی بنائی جائے جو اس دعوت کو جان کر اور سمجھ کر
قبول کریں، جو زندگی اور اطاعت کو اپنی تمام اطاعات اللہ کے لیے خالص کر دیں، جو دوسری اطاعتوں
کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ واقعتاً شریک کرنا چھوڑ دیں اور حقیقت میں اللہ کے قانون کو
اپنا قانونِ زندگی بنا لیں۔ سب سے پہلے وہ لوگ جو اس طرزِ خیال یا اس طرزِ زندگی کے قائل ہیں
ہوں یا اس سے ہمدردی رکھتے ہوں، ان کو جماعت کے ساتھ لیا جا سکتا ہے،

۲۔ مشکلات

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جتنی مستقل سیاسی جماعتیں ہیں ، قریب قریب سب کی سب کا دعویٰ یہی ہے کہ ان کا نصب العین اسلامی نصب العین ہی ہے مگر ان سب نے اس راہِ راست کو چھوڑ دیا ہے جس کی تشریح ابھی میں نے بیان کی ہے۔ وہ تو "آزادی" اور "دین حق" کی خاص سمت نیز دعوت عام دیتی ہیں ، وہ اس پارٹی کی تشکیل کرتی ہیں جس کی جماعت وہ لیست صرف ان لوگوں تک محدود ہو جاتی ہے جو بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوں ، اور نہ غیر متعلق عناصر کو چھوڑ کر صرف اس ایک مقصد کو اپنی کوششوں کا ہدف بناتی ہیں جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ راہِ راست سے ان تمام بجز اس کے یہ سب جماعتیں منحرف ہیں۔

اس انحراف نے مختلف جماعتوں کے مسلک میں کیا کیا صورتیں اختیار کی ہیں اس کی تفصیل تو میں بعد میں بیان کروں گا۔ پہلے میں اس انحراف کا سبب بتا دینا چاہتا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کو اصل اسلامی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی

(بقیہ حاشیہ ۱۲۸) سے تو گویا آپ یہ سمجھے ہیں کہ اسلام کی حکومت اور کفر کی حکومت دونوں یکساں ہیں۔ اور اگر آپ دوسری بات کے قائل ہیں تو براہِ کرم ایسی ہی غور کر کے بتائیے کہ حکومت اسلام اور حکومت کفر کے درمیان بنیادی فرق کیا ہے اور ایک کے رد اور دوسرے کے قبول پر فضل کی توجیہ آپ کس طرح کریں گے؟ کاش آپ نے قرآن پر غور کیا ہوتا تو سمجھ میں خود یہ بات آ جاتی کہ حکومت اسلامی کا بنیادی نظریہ اسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور یہ چیز ضمنی نہیں ہے بلکہ اساسی اہمیت رکھتی ہے۔ لا الٰہ کی نفی میں حاکمیت غیر اللہ کا انکار اور الا اللہ کے اثبات ہی میں حاکمیت اللہ کا اقرار شامل ہے اور یہ بنیاد ہے اسلامی حکومت کی۔

(ترجمان القرآن ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۴۲ء)

۴۔۱ انحراف کی راہیں

یہی وہ خطوط ہیں جن کو اس راہ میں غافل دیکھ کر لوگ دائیں اور بائیں رُخ پر راستہ کتر کر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جزئیات کے اعتبار سے مختلف لوگوں کے طرزِ عمل اور طریق کار میں جو اختلافات ہیں اُن کو نظر انداز کر کے بڑی بڑی اصولی تقسیم اگر کی جائے تو یہ مسلک بس تین قسموں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔

ایک وہ گروہ جو کہتا ہے کہ پہلے ہمیں ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کے ساتھ موافقت کر کے اس ملک کو انگریزی اقتدار سے آزاد کرانا چاہیے تاکہ یہاں ایک مشترک جمہوری اسٹیٹ قائم ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہم تدریجاً اُس اسٹیٹ کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کرنے کے لیے کوشش کریں گے۔

دوسرا گروہ جس کا خیال ہے کہ پہلے انگریزی اقتدار کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ہمیں مستقل ہندو اکثریت کے تسلط کا سدِ باب کر لینا چاہیے، اور ایسی تدبیر کر لینی چاہیے کہ اس ملک میں ایک جمہوری اسٹیٹ کے بجائے دو اسٹیٹ قائم ہوں۔ ایک وہ اسٹیٹ جس میں مسلم اکثریت کی وجہ سے اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے، اور دوسرا وہ اسٹیٹ جس میں ہندو اکثریت کی وجہ سے اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں جائے مگر زیادہ سے زیادہ جو آئینی تحفظات ممکن ہیں ان کے ذریعے سے مسلمانوں کی پوزیشن محفوظ ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہم مسلم اکثریت والے اسٹیٹ کو بتدریج اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کریں گے اور پھر ہندو اکثریت والے اسٹیٹ میں تبلیغ و اصلاح کی کوشش کریں گے۔

تیسرا گروہ جو موجودہ حالت میں وحدتِ عام اور ایک متحدہ پارٹی کی تشکیل کا سامان بنانے کے لیے اسلام کو ایک دوسرے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے، تاکہ وہ اُن لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہو جائے جو اسلامی عقائد و اخلاقیات اور اسلامی شریعت کی بندشوں سے گھبراتے ہیں۔ اس گروہ نے اگرچہ کوئی مستقل جماعتی صورت اختیار نہیں کی ہے، مگر یہ مسلم

ہے کہ اس طرزِ خیال کے لوگ ایک اچھی خاصی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں اسلامی تحریکیں بھی
بعض حالت جنینی سے گزر رہی ہیں۔

۵۔ منحرف راستوں کی غلطی

اب میں ان میں سے ایک ایک گروہ کے طریقہ پر الگ الگ تنقید کر کے بتاؤں گا کہ ان طریقوں میں غلطی کیا ہے، ان میں سے ہر ایک نے اسلام کی راہِ راست سے انحراف کس طرح کیا ہے، اور ان پھیر کے راستوں سے اصل اسلامی نصب العین تک پہنچنا غیر ممکن الوقوع کیوں ہے۔

• آزادیِ ہند کو مقدم رکھنے والے

پہلا گروہ زیادہ تر علماء و مذہبی خیالات کے لوگوں پر مشتمل ہے اور بالعموم اس گروہ کے لوگ دوسرے گروہوں کی بہ نسبت زیادہ مذہبی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے انحراف پر مجھ کو سب سے زیادہ افسوس ہے۔ ان حضرات نے عملی مشکلات سے مرعوب ہو کر یہ خیال قائم کر لیا کہ موجودہ حالت میں اصل اسلامی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی نہیں کی جا سکتی، اس لیے انہوں نے اپنی کوششوں کا مقصد یہ ٹھیرایا کہ "ہندوستان انگریزی اقتدار سے آزاد ہو جائے"۔ مقصود بدل جانے سے طریقِ کار بھی بدل گیا۔ اسلام کی راہِ راست کے تین اجزاء جو میں نے بیان کیے ہیں، ان کا راستہ ہر جزء میں اُس سے مختلف ہے۔

(۱) دعوت کے باب میں اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی مالکیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے کی طرف بلایا جائے۔ مگر یہ ہندوستان کے باشندوں کو اس طرف بلاتے ہیں کہ تم خود مالک الملک بنو۔ یہ غیر الٰہی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی نہیں کرتے بلکہ صرف انگریزی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی کرتے ہیں۔ اور یہ الٰہی اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات بھی نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ باشندگانِ ملک کی خود اختیاری اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شرک ہونے کی حیثیت سے انگریزی اقتدارِ اعلیٰ اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی دعوت سراسر غیر اسلامی بلکہ خلافِ اسلام دعوت ہے۔

ان کے نزدیک انگریزی اقتدار کے مقابلہ میں جمہوری ہند کا اختیار، اور انگریزی قومیت کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کی متحدہ قومیت زیادہ قابل ترجیح ہے۔ حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے دونوں یکساں ضلالت، یکساں کفر اور یکساں فسق و معصیت ہیں۔

پھر یہ انگریز اور ہندوستانی کے درمیان نزاع و دشمنی عداوت و تعصب کی آگ بھڑکانے میں حصہ لیتے ہیں۔ حالانکہ اسلام کی دعوتِ عام کے راستہ میں یہ رکاوٹ ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انگریز اور ہندوستانی دونوں انسان ہیں۔ وہ دونوں کو یکساں اپنی دعوت کا مخاطب بناتا ہے۔ اس کا جھگڑا انگریز سے اس بات پر نہیں ہے کہ وہ ایک ملک کا باشندہ ہو کر دوسرے ملک پر حکومت کیوں کرتا ہے بلکہ اس بات پر ہے کہ وہ خدا کی حاکمیت اور اس کے قانون کی اطاعت کیوں نہیں تسلیم کرتا۔ ٹھیک اسی بات پر اس کا جھگڑا ہندوستانی سے بھی ہے۔ وہ دونوں کو ایک ہی بات کی طرف بلاتا ہے۔ یک لخت ہی کہ دونوں سے ہر ایک اس کی حیثیت کے مخاطب ہیں۔ لیکن اگر وہ ہندوستانی اور انگریز کے دشمنی والے جھگڑے میں ایک کا طرفدار اور دوسرے کا مخالف بن جائے تو انگریز کے دل کا دروازہ اس کی دعوت کے لیے بند ہو جائے گا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ ایک طرف اسلام کے داعی بنتے ہیں اور دوسری طرف اس دشمنی اور قومی جھگڑے میں فریق بھی بنتے ہیں وہ دراصل اسلام کے مفاد کو ہندوستانیت کے مفاد پر قربان کرتے ہیں۔

ان تمام بنیادی غلطیوں کے ساتھ یہ حضرات کبھی کبھی اسلام کی تبلیغ بھی فرمایا کرتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر ظالم دوسری قوم پر ظلم کر رہا ہو اس کے متعلق قطعی طور پر اسلام مظلوم قوم کی حمایت نہ کرے گا، بلکہ درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قومیت اور وطنیت کی بنیاد پر دونوں قوموں میں جو نزاع ہوگی، اسلام اس میں کوئی حصہ نہ لے گا۔ وہ ظالم کی مخالفت کرے گا نہ اس لیے کہ وہ غیر قوم کا آدمی ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ ظالم ہے۔ اور اسی طرح وہ مظلوم کی حمایت بھی اس حیثیت سے نہ کرے گا کہ وہ غیر قوم سے تعلق رکھتا ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ مظلوم ہے۔ (مترجم)

مگر ایسی تبلیغ کبھی مؤثر نہیں ہو سکتی۔ ایک محاذ سے دو باہم متناقض آوازیں سُن کر اور ایک زبان سے دو قطعی متضاد باتیں سماعت کر کے آخر کون متاثر ہو سکتا ہے؟

(۲) تشکیل جماعت کے باب میں یہ حضرات اس سے بھی زیادہ مُغالطے میں ہیں۔ اوّل تو قومیّت کی حیثیت بدل جانے کی وجہ سے خود ہی جماعت کی ترکیب اور اجزائے ترکیبی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر بدل گیا ہے۔ پھر مسلمان قوم والے تخیّل نے پریشان خیالی کے لیے ایک اور وجہ بھی پیدا کر دی ہے۔ ان اسباب سے یہ ہر قسم کے رطب و یابس آدمی اکٹھے کر لیتے ہیں، اور ان آدمیوں کے اقوال و اعمال میں بیک وقت بیسیوں قسم کی متضاد باتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک متحد المزاج نظریے کی جماعت کے لیے آپ اُٹھیں تو لامحالہ آپ ایسے ہی لوگوں کے لیے ایسے آدمیوں کا انتخاب کریں گے جو یکسوئی کے ساتھ اس خاص نظریے کے متبع ہوں۔ بخلاف اس کے ایک منتشر اور غیر معیّن مزاج رکھنے والے نظریے کے لیے جب آپ اُٹھیں گے تو آپ کا معیارِ انتخاب، اگر ان قیود سے آزاد ہو جائے گا جو متحد المزاج نظریے کے لیے ناگزیر ہیں۔ مجھے خود ابھی ایک مجلس میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا جہاں ہندوستان کی ایک بہت بڑی ذمہ دار جمعیت کی مقامی شاخ کو منظم کرنے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کی بحث و تمحیص کے بعد جو بات قرار پائی وہ یہ تھی کہ رکنیت کے فارم چھپوا لیے جائیں اور پندرہ دن کے اندر زیادہ سے زیادہ ممبر بھرتی کر کے ارکان کا ایک جلسہ عام کر لیا جائے جس میں عہدہ داروں کا انتخاب ہو جائے۔ بس جمعیت کی شاخ منظم ہو گئی۔ اس طرح جماعت بنا کے تو ہر شخص رکنیت کے فارموں پر دستخط کر کے اور چار آنہ چندہ ادا کر کے ان جماعتوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ پھر ایسی آدمیوں کے ووٹوں سے منتخب ہو کر وہ لوگ برسرِ کار آتے ہیں جن کا کام رہنمائی و سربراہ کاری ہوتا ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کی مختلف خواہشات سے پالیسیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ کیا کوئی شخص توقع کر سکتا ہے کہ جماعتی تشکیل کے اس طریقے سے کبھی اسلامی نصب العین کی طرف بھی کوئی پیش قدمی کی جا سکتی ہے؟

(۳) اسی طرح تیسرے جزء میں بھی ان کا طریقہ اسلام کی راہِ راست سے ہٹا ہوا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اسلام براہِ راست غیر اسلامی نظامِ اطاعت پر حملہ کرتا ہے۔

اس کا تقاضا یہ تھا کہ تمام مساعی اور کاوشیں سب سے پہلے اسی کے قیام و ثبات پر مرکوز کر دی جاتیں ۔
لیکن اس کے برعکس یہ لوگ اپنی سعی و جہد کا رخ برطانوی نظام اطاعت کی تخریب اور حاکمیت
عوام کے قیام کی طرف پھیر دیتے ہیں ۔ یہ صریح انحراف ہے صراط مستقیم سے ۔ اس انحراف
پر جب اعتراض کیا جاتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ برطانوی نظام اطاعت اسلامی نصب العین
کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے ، ہم تنہا اس رکاوٹ کو دور نہیں کر سکتے ۔ اس لیے
پہلے دوسروں کی مدد سے اس کو دور کریں ، پھر اصل منزل مقصود کی طرف بڑھنے کے لیے راستہ
آسان ہو جائے گا ۔ مگر یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ راستہ صاف کیسے ہو جائے گا ؟ ظاہر بات ہے
کہ ایک نظام اطاعت یونہی ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا نظام اطاعت یونہی کبھی قائم نہیں
کیا جا سکتا جب تک کہ نفوس انسانی میں پہلے نظام کی تخریب اور دوسرے نظام کی تعمیر
کا خیال اور ارادہ کامل درجہ قوت کے ساتھ مستحکم نہ کر دیا جائے ۔ اگر ہندوستان کے موجودہ
انگریزی نظام اطاعت کی جگہ آپ جمہوری نظام اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ مقصود صرف
اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ آپ باشندگان ہند کے دلوں میں حاکمیت انگریز کے بجائے خود
اپنی حاکمیت کے برحق ہونے کا تخیل اور خود مالک الملک بن جانے کا عزم پوری شدت
کے ساتھ پیدا کر دیں ۔ برعکس اس کے اگر آپ ہندوستان میں اسلامی نظام اطاعت قائم
کرنا چاہیں تو یہ انقلاب بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ عوام و خواص کو خود اپنی حاکمیت سے
دست بردار ہو جانے اور غیر اللہ کی حاکمیت کا انکار کرنے پر آمادہ کریں اور اللہ کے مالک
الملک ہونے کا عقیدہ ان کے دلوں میں اتنی قوت کے ساتھ بٹھا دیں کہ وہ اس کی حاکمیت
کے آگے برضا و رغبت سر جھکا دیں ۔ اب سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا آخری مقصد اسلامی نظام
اطاعت کا قیام ہے وہ کس طرح سلامت ہوش و حواس اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے
ذریعہ کے طور پر یہ تدبیر اختیار کر سکتے ہیں کہ عوام الناس کے دل میں خود اپنی حاکمیت کا عقیدہ
اور ارادہ اتنی قوت کے ساتھ بٹھا دیں کہ اس کے زور سے وہ انگریز کی مضبوط جمی ہوئی جڑیں
اکھاڑ پھینکیں اور دین الٰہی کی جڑیں زمین میں جگہ پکڑ لیں ؟ جہاں حاکمیت خلق کے دلوں میں اپنی
حاکمیت کا عقیدہ اور عزم اتنی قوت کے ساتھ جم گیا ہو کیا وہاں لوگوں کو خداوند عالم کے آگے

یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پہلے گروہ کی طرح اس گروہ کا راستہ بھی راہ راست کے تینوں اجزا سے منحرف ہے۔

(۱) پہلے دعوت کو لیجیے۔ ان کے لٹریچر، ان کے لیڈروں کی تقریریں، ان کی مجلس کی قرار دادیں، ان کے کارکنوں کی باتیں، ان کے اہل قلم کی تحریریں، سب کی سب اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ ان کی دعوت اصل میں ایک قوم پرستانہ دعوت ہے یعنی ان کی پکار اسلام کے نصب العین کی طرف نہیں ہے، بلکہ اس مطلب کی طرف ہے کہ ان کی قوم متحد ہو کر ہندو قوم کے مقابلہ میں اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کرے۔ گویا جس طرح آزادی پسند ہندوؤں نے انگریزوں کو اپنا قومی حریف بنا لیا ہے اسی طرح انہوں نے ہندوؤں کو اپنا قومی حریف بنا لیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ لوگ آزادی پسند حضرات کی سطح پر کھڑے ہیں۔ بلکہ ایک چیز نے ان کی بہ نسبت ان کی روش کو اسلام سے کچھ اور زیادہ منحرف بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ قومیت اور وطنیت کے نام پر لڑتے ہیں، مگر یہ اپنی قومی اور دنیوی لڑائی میں بار بار اسلام اور مسلم کا نام لیتے ہیں جس کی وجہ سے اسلام خواہ مخواہ ایک فریق جنگ بن کر رہ گیا ہے اور غیر مسلم قومیں اس کو اپنا سیاسی اور معاشی حریف سمجھنے لگی ہیں۔ اس طرح انہوں نے صرف اپنے آپ کو اسلام کی دعوت دینے کے قابل نہیں رکھا ہے بلکہ اسلام کی اشاعت کے راستے میں اتنی بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ہے کہ اگر دوسرے مسلمان بھی یہ کام کرنا چاہیں تو غیر مسلموں کے دلوں کو اسلام کے لیے مقفل پائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قوم پرستانہ دعوت کے ساتھ یہ لوگ کبھی کبھی اسلام کی خوبیاں اور اس کے اصولوں کی فضیلت بھی بیان کیا کرتے ہیں۔ مگر اول تو قوم پرستی کے پس منظر میں یہ چیز ایک اصولی دعوت کے بجائے محض ایک قومی تفاخر بن کر رہ جاتی ہے۔ اور مزید برآں دعوت اسلام کے ساتھ جن دوسری باتوں کی یہ آمیزش کرتے ہیں وہ بالکل اس دعوت کی ضد ہیں۔ ایک طرف اسلامی نظام حکومت کی تبلیغ اور دوسری طرف ان "مسلمان" ریاستوں اور حکومتوں کی حمایت جن کا نظام بالکل غیر اسلامی ہے،

ایک طرف اسلامی نظامِ معاشرت کی تشریح اور دوسری طرف خود اپنی قوم کے عادات و اطوار کی تائید و حمایت۔ ایک طرف انسانی قانون سازی کا اصول باطل اور دوسری طرف خود قانون سازی میں اپنے حصّہ کا مطالبہ۔ ایک طرف حاکمیتِ جمہور کا قطعی ابطال اور دوسری طرف حاکمیتِ جمہور کے اصول پر خود اپنی قومی حکومت کے قیام کی فکر۔ ایک طرف وطنیت کی نسلی، قومی اور وطنی تقسیم کا ابطال اور دوسری طرف ہر وقت قوم قوم کا شور اور خود قومیت ہی کے اصول پر دوسری قوموں سے جدال و کشمکش۔ ایک طرف بے غرضانہ حق پرستی کا دعویٰ اور دوسری طرف شب و روز اپنے دنیوی مفاد کا زمزمہ و ماتم۔ ایک طرف اسلامی تہذیب و تمدن پر فخر و ناز اور اس کی حفاظت کے لیے پُرشور مورچہ بندی اور دوسری طرف اُسی تہذیب و تمدن کے باغیوں اور قاتلوں کی سرداری و پیشوائی۔ یہ دونوں چیزیں آخر کس طرح ایک ساتھ نبھ سکتی ہیں؟ [illegible] ایسی متضاد باتوں سے دنیا نے کب اثر قبول کیا ہے کہ آج ان سے اسلام کا جھنڈا زمین میں گڑ جانے کی اُمید کی جاتی ہے؟

(۲) اب دیکھیے کہ یہ اپنی جماعتی تشکیل کس ڈھنگ پر کرتے ہیں۔ ان کا قاعدہ یہ ہے کہ یہ اُن سب لوگوں کو جو اتفاق سے پیدائشی مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں اپنی جماعت کی رکنیت کا بلاوا دیتے ہیں اور جو اس کو قبول کرے اُسے ابتدائی رُکن بنا لیتے ہیں۔ پھر انہی ابتدائی ارکان کے ووٹوں سے ذمہ دار کارکن اور عہدہ دار منتخب ہوتے ہیں اور انہی کی کثرتِ رائے سے تمام معاملات انجام دیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ صرف قومی تنظیم ہی کے لیے موزوں ہو سکتا ہے اور اس طریقہ سے جو نظام بنے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ ایک قوم کی خواہشات جیسی کچھ بھی ہوں اُن کے حصول کی کوشش کرے۔ رہی ایک اصولی تحریک، تو اُس کو چلانے کے لیے یہ طریقِ جماعت سازی قطعاً بے کار بلکہ مضر ہے۔ ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہو گا اسلامی اصول ہی پر ہو گا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ یہ ایک عظیم جس کو

مسلمان قوم کہا جاتا ہے۔ ان کا حال یہ ہے کہ ان کے ۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اس لیے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔

(۳) اس کے بعد اس طریقہ کا جائزہ لیجیے جس سے یہ بزعم خود اسلامی نصب العین تک پہنچنے کی امید رکھتے ہیں۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ پہلے اسی جمہوری دستور کے مطابق، جو انگریزی حکومت یہاں نافذ کرنا چاہتی ہے، مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہو جائے، پھر کوشش کی جائے گی کہ یہ قومی حکومت اسلامی نظامِ حکومت میں بتدریج تبدیل ہو جائے۔ لیکن یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسی آزادیٔ ہند کو

لہ اس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔ برعکس اس کے ان کی طرف سے بصراحت جس چیز کا بار بار اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے پیشِ نظر ایک ایسی جمہوری حکومت ہے جس میں دوسری غیر مسلم قومیں بھی حصہ دار ہوں، مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہو۔ بنا بریں ان کا اطلاق کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ چند اکثریت کے علاقوں میں [illegible] مسلمانوں کی کثرت ہے۔ باقی رہا نظامِ حکومت تو وہ پاکستان میں بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ہندوستان میں ہوگا۔ [illegible] مسلمانوں کی اور حکومت [illegible] غیر مسلموں کی [illegible] زیادہ قابلِ اعتماد ہے [illegible] جب یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ (مودودی)

دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا وہ قدرتی بات ہے کہ اس دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ پس اگر یہاں سوسائٹی اگر بگڑی ہوئی ہے تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہوکر برسرِ اقتدار آئیں گے جو اس سوسائٹی کی خواہشات نفس سے سب سے زیادہ قربت حاصل کرسکیں گے۔ پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومتِ الٰہی رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عوام کی اخلاقی و ذہنی تربیت کر کے، ان کے نقطۂ نظر کو تبدیل کر کے اور ان کے نفسیات میں انقلاب برپا کر کے ایک جمہوری نظام کو الٰہی حکومت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اخلاقی و نفسیاتی انقلاب کے برپا کرنے میں کیا مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کچھ بھی مددگار ہوگی؟ کیا وہ لوگ جو موجودہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کے ووٹوں سے اپیل کر کے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے ان سے آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ حکومت کا ذریعہ، اس کے وسائل اور اس کے اختیارات کسی ایسی تحریک کی اعانت میں صرف کریں گے جس کا مقصد عوام کی ذہنیت تبدیل کرنا اور انہیں حکومتِ الٰہی کے لیے تیار کرنا ہو؟ اس کا جواب عقل اور تجربہ دونوں کی روشنی میں نفی کے سوا کچھ نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ لوگ اس انقلاب میں مدد دینے کے بجائے الٹی اس کی مزاحمت کریں گے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر عوام کے نفسیات میں تغیر واقع ہو گیا تو پھر اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں ان کا چراغ نہ جل سکے گا۔ یہی نہیں، اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ عوام کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی بہ نسبت بہت زیادہ جسارت و بے باکی کے ساتھ یہی پرورش کر سکیں گے اور ان کے نام ان کے ظلم کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہوں گے۔ جب صورت حال یہ ہے تو کیا وہ شخص نادان نہیں ہے جو اسلامی انقلاب کا نصب العین سامنے رکھ کر ایسی جمہوری حکومت کے قیام

کی کوشش کرے جو ہر آوازۂ حکومت سے بڑھ چڑھ کر اُسی کے متعلق رہنے میں حق بجانب ہو؟

تحریفِ دین کے مجوزین

اب تیسرے گروہ کو لیجیے۔ یہ لوگ مختلف قسم کی تجویزیں سوچ رہے ہیں۔ کوئی فکرِ اسلامی کے ساتھ غیر اسلامی افکار کا جوڑ ملا کر ایک نئی قسم کی معجون بنانا چاہتا ہے۔ کوئی اس خیال میں ہے کہ ہندوستانی اسلام کا ایک نیا ایڈیشن نکالے۔ کوئی یہ چاہتا ہے کہ اسلام کے پورے نظام میں سے صرف اس کے سیاسی و معاشی اصولوں کو لے لیا جائے، ان کی بنیاد پر ایک ایسی سیاسی جماعت بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے عقائد، عبادات اور احکامِ شرعیہ کی پابندی لازم نہ ہو۔ یہ سب لوگ اپنے نزدیک نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان طریقوں سے رفتہ رفتہ وہ تفرقہ دور ہو جائے گا جو اسلام کے معتقد گروہوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ اور جب وہ بعض اسلام سے کسی حد تک مانوس ہو جائیں گے تو پورے اسلام سے مانوس ہونے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔

لیکن یہ سب خیالات خام ہیں۔ نہ اصولی حیثیت سے ان کو صحیح کہا جا سکتا ہے اور نہ عملی حیثیت سے ہی ان کی کوئی قدر و قیمت ہے۔ میرے نزدیک ایسی تمام تجویزیں ضعفِ دل اور ضعفِ دماغ کا نتیجہ ہیں۔

اصولی حیثیت سے درحقیقت ہم اسلام میں کسی قسم کی کمی بیشی، اور کسی ترمیم و تنسیخ کے مجاز ہی نہیں ہیں۔ ہم اسلام کے مالک نہیں ہیں، اس کے واضع نہیں ہیں، اس کے شارع نہیں ہیں۔ اسلام ہمارا مال نہیں ہے کہ مارکیٹ میں جیسی طلب ہو اس کے مطابق اپنے اس مال کو بنا کر بازار میں لائیں۔ ہماری حیثیت صرف پیرو اور مبلغ کی ہے۔ مالک نے عقائد، عبادات اور احکام کا یہ پورا مجموعہ ہمیں دیا ہے تاکہ ہم خود اس کی پیروی کریں اور دوسروں تک اسے پہنچائیں۔ اس مجموعہ میں کوئی ترمیم کرنے کا، یا اس کی اصل صورت کو بدل کر اس کی کوئی اور صورت بنانے کا ہم کو ہرگز کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جس کو لینا ہے اُسے پورے مجموعہ کو لینا پڑے گا اور اسی صورت میں لینا ہوگا جس میں مالک نے اسے

دیا ہے۔ اور جو اس کو اس حیثیت مجموعی اور اس مقررہ صورت کے ساتھ نہ لینا چاہے اس
کی خوشامد کرنے اور اسے کم و بیش پر راضی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسلام تو ایک
حکم ہے خالق کی طرف سے مخلوق کی طرف۔ خالق کا کام مخلوق کی خوشامد کرنا اور اس کو راضی
کرنا نہیں ہے۔ مخلوق کو تو اس کا حکم، جیسا کہ وہ ہے، جوں کا توں ماننا پڑے گا۔ ورنہ وہ
خود اپنا ہی کچھ بگاڑے گی، خالق کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گی۔ اسی لیے اللہ کی طرف سے اس
کے جو رسول دنیا میں آئے انہوں نے پورے کا پورا لوگوں کے سامنے بجنسہٖ پیش کر دیا اور صاف
کہہ دیا کہ چاہو اس کو قبول کرو اور چاہو رد کر دو۔ بہرحال تمہاری خواہشات کے مطابق اس میں
کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جائے گا۔ ٹھیک یہی پوزیشن رسول کے نائب ہونے کی حیثیت سے
ہماری بھی ہے۔

پھر یہ کتنی غیر معقول تجویز ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے بعض اُس کے
معاشی و سیاسی اصول کو لے لیا جائے اور انہی کی بنیاد پر ایک پارٹی ایسی بنائی جائے
جس میں شامل ہونے کے لیے توحید، آخرت، قرآن، رسالت، کسی چیز پر بھی ایمان لانے
کی ضرورت نہ ہو اور نہ عبادات کی بجاآوری اور احکام شرعیہ کی پابندی ضروری ہو۔ کیا کوئی
صاحبِ نظر آدمی ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال کر سکتا ہے کہ کسی اجتماعی نظم اور تحریکِ عمل
کو اس کے بنیادی عقیدے، اس کے نظامِ اخلاق اور اس کے تعمیرِ سیرت کرنے والے ارکان سے
الگ کر کے چلایا جا سکتا ہے؟ مثلاً حاکمیتِ الٰہی کا تصور نکال دینے کے بعد اسلام کا سیاسی
نظام آخر ہے کس چیز کا نام؟ اور اگر قرآن کو ماخذِ قانون اور سنتِ رسول اللہ کو حیثیت
(قانون) اور بادشاہ (اللہ) کے درمیان ترسیلِ احکام کا واحد مستند ذریعہ نہ مانا جائے تو
کیا اسلامی طرز کے سٹیٹ کی تعمیر ہوا پر کی جائے گی؟ نیز وہ کون سا نظامِ تمدن و سیاست
ہے جو کسی نظامِ اخلاق کا سہارا لیے بغیر قائم ہو سکتا ہو؟ اور کیا اللہ کے سامنے انسان کی
ذمہ داری و جواب دہی کا تخیل نکال دینے کے بعد اُس نظامِ تمدن و سیاست کے لیے
کوئی اخلاقی سہارا باقی رہ جاتا ہے جس کا نقشہ اسلام نے پیش کیا ہے؟ کیا اس نظام کو
آپ مادہ پرستانہ اخلاقیات کے بل پر ایک دن کے لیے بھی قائم کر سکتے ہیں؟ مزید برآں

وہ خاص قسم کی انفرادی سیرت اور اجتماعی زندگی جو اس نظام تمدن و سیاست کے لیے درکار
ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے سوا اور کس ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور وہ نہ ہو
تو یہ نظام چل کیسے سکتا ہے؟ پھر یہ عجیب درجہ کا خواب ہے کہ کوئی شخص جس شاخوں کا
حسن دیکھ کر یہ کہنے لگے کہ ان کو جڑ کے بغیر ان شاخوں ہی سے درخت قائم کریں۔

عملی حیثیت سے بھی اس قسم کی تمام تجویزیں سراسر غلط ہیں۔ ان سے اصل حصہ تک پہنچنے
کے بجائے خطرہ ہے کہ کہیں ہم خود ہی راستہ میں گم ہو جائیں۔ ترمیم شدہ صورت میں جس
نام نہاد اسلام کی تبلیغ کی جائے گی، ایک معنوی اصل معیار بن جائے گا، اور جو لوگ اس پر ایمان
لا کر جماعت میں شریک ہوں گے، نہ صرف وہ خود اصل اسلام کی طرف رجوع کرنے سے انکار
کریں گے، بلکہ وہ صحت پرست مسلمان بھی جنہوں نے اس سے کم درجے پر سمجھوتہ کیا تھا ان
کے ساتھ اسی گمراہی میں شریک ہو جائیں گے۔ سمجھوتے (Compromises) پر جو کام کیے جاتے
ہیں ان میں ہمیشہ یہی خرابی ہوتی ہے۔

۶۔ مشکلات کا جائزہ

اب ہمیں ایک نظر ان مشکلات پر ڈالنی چاہیے جن سے خوف زدہ ہو کر یہ انحراف
کی راہیں اختیار کی جا رہی ہیں۔ کیا حقیقت میں وہ ایسی ہی مشکلات ہیں کہ ان کا حل نہیں کیا
جا سکتا؟

تکرار بیان سے بچنے کے لیے میں ناظرین کو پھر ایک مرتبہ تکلیف دوں گا کہ پیچھے
پلٹ کر مضمون کے اس حصہ پر نگاہ ڈال لیں جس میں ہم نے ان مشکلات کی تشریح کی ہے۔

۲۔ پہلی مشکل

پہلی مشکل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام صرف تمدنی، سیاسی اور معاشی مسائل کا حل ہی
پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد، عبادات اور ضوابط معاشرہ کا ایک مجموعہ بھی اس کے ساتھ دیتا
ہے، اور اس کو قبول کرنے کے معنی انسان کی پوری زندگی تبدیل ہو جانے کے ہیں۔ کہا جاتا
ہے کہ یہ چیز اسلام کو اسی طرح پھیلنے نہیں دیتی جس طرح دوسری تحریکیں پھیلتی ہیں۔ لیکن

یہ شکل بظاہر جتنی زبردست نظر آتی ہے، باطن میں اتنی ہی کمزور اور بے حقیقت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اجتماعی نظریہ یا دستور بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی زندگی کے عملی مسائل کا مجرد حل پیش کرتا ہو، اس کے ساتھ ہمیشہ کچھ اعتقادات یا ایک مخصوص فلسفہ زندگی ہوتا ہے۔ چند امور مابعد الطبیعیات (Metaphysical Problems) ایسے ہیں جن کے متعلق کسی نہ کسی ایمانی حیثیت سے ایک رائے قائم کرنا ہر حال ہر اس دستور کے لیے ناگزیر ہے جو انسان کے لیے ایک طرز زندگی بنانے کا مدعی ہے۔ یہ سوالات کہ کائنات کا یہ نظام کس نوعیت کا ہے؟ اور اس نظام میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟ اور انسانی زندگی کا مآل کیا ہے؟ اور یہ کہ ان سوالات کا کچھ نہ کچھ جواب دیے بغیر جو اصل انسانی زندگی کے بنیادی معاملات میں ان کا ایک قابل عمل حل (Workable Solution) پیش کیے بغیر کوئی بھی اخلاقی، تعلیمی اور تمدنی نظام بنایا ہی نہیں جا سکتا اور کسی نظام کے محض عملی پہلوؤں کو لے کر کوئی کام نہیں کر سکتا جب تک کہ ساتھ ساتھ اس کے بنیادی فلسفہ یا بالفاظ دیگر اس کے اعتقادات کو بھی قبول نہ کرے۔ پس ایک اعتقادی نظام ہونا تنہا اسلام ہی کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اس جہت سے اگر اسلام کی راہ میں کوئی مشکل حائل ہے تو ایسی مشکل ہر اجتماعی مسلک کی راہ میں حائل ہے۔ ہر اجتماعی مسلک فی الواقع ایک مذہب ہی ہے اور جو اس کی پیروی اختیار کرتا ہے وہ حقیقت میں ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے، خواہ اپنی سادہ لوحی کی بنا پر وہ یہ کہتا اور سمجھتا ہے کہ میں بدستور اپنے پچھلے مذہب پر ہوں۔

میں ایک سیدھی سی مثال سے اس نکتہ کی مزید توضیح کروں گا۔ یہ کمیونزم آپ کے سامنے ہے۔ اس کا حال بھی دیکھیے۔ اگر اسلام اس مابعد الطبیعی نظریہ سے اپنے مسلک کی ابتدا کرتا ہے کہ خدا ہے، تو کمیونزم اس نظریہ سے چلتا ہے کہ خدا نہیں ہے یا کم از کم اس کا وجود ہے یا نہیں یہ خارج از بحث ہے۔ اگر اسلام یہ نقطہ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا خدا کی سلطنت ہے اور انسان یہاں اس کا تابع امر ہے تو کمیونزم یہ نقطہ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا ایک اتفاقی پیداوار ہے اور انسان یہاں مطلقاً خود مختار (Independent) ہے۔ اگر اسلام یہ

چھوڑتا ہے کہ انسان کو یہاں کام کرنے کے لیے خدا کی ہدایت درکار ہے اور وہ رسول کے ذریعہ سے آتی ہے تو کمیونزم یہ چھوڑتا ہے کہ کوئی ہدایت سرے سے نہیں اترتی، کوئی وحی نہیں آتی۔ اگر اسلام اس مقام سے سوچ کا آغاز کرتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں انسان کو اپنی اس زندگی کے پورے کارنامے کا حساب دینا ہے، تو کمیونزم اس مقام سے چلتا ہے کہ جو کچھ ہے یہی زندگی ہے اس کے بعد نہ کوئی زندگی ہے نہ حساب و کتاب۔ دیکھیے یہ دونوں کیسے بنیادی مختلف نظریے ہیں اور دونوں میں سے کسی کو بھی تجربہ یا مشاہدہ سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اب اگر کسی سائنٹیفک ثبوت کے بغیر محض استدلال اور قیاسی شہادت کی بنا پر بہت سے وہ لوگ جو کل تک کمیونسٹ نہ تھے، آج کمیونزم کے نقطۂ نظر کو قبول کر سکتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ آخر انہی دو بنیادوں پر بہت سے وہ لوگ جو آج مسلم نہیں ہیں، کل اسلام کا نقطۂ نظر کیوں قبول نہیں کر سکتے؟

اسی طرح ایک بنیادی چیز ایمان لانے کا معاملہ بھی دونوں میں مشترک ہے۔ اگر مسلم ہونے کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا پڑتا ہے تو کمیونسٹ بھی آخر مارکس پر ایمان لاتا ہی ہے۔ پھر اگر ایک شخص جو کل تک مارکس کا دشمن تھا، مارکس کی تصنیفات کو دیکھ کر اس کو اپنا رہنما تسلیم کر سکتا ہے، تو آخر کون سی چیز مانع ہے کہ ایک وہ شخص جو کل تک معترض تھا، آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، ان کی تعلیمات اور ان کے کارنامے کو دیکھ کر ان کو اپنا ہادی و رہبر تسلیم نہ کرے؟

ایسا ہی معاملہ جماعتی ضابطہ (Party Discipline) کا بھی ہے۔ اگر اسلام ان لوگوں کو جو اس کی جماعت میں شامل ہوں، اپنے کچھ ضوابط کا پابند بناتا ہے تو کیا کمیونسٹ پارٹی ان لوگوں کو جو اس کی جماعت میں شامل ہیں، کسی ضابطہ اور کسی قاعدے میں نہیں جکڑتی؟ پھر جب بہت سے انسان کمیونزم کے اصولوں پر ایمان لانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے ضوابط کی پابندی قبول کر لیتے ہیں تو آخر اسلام ہی کے جماعتی ضوابط میں کون سا عیب ہوتا ہے کہ جو لوگ اسلام کے اصولوں کو جانچ کر ان پر ایمان لانے کے لیے تیار ہوں گے ان کو یہ چیز اپنی صورت دکھا کر بھگا دے گی؟

اس مثال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں خدا کی ہستی اور اس کی توحید کا اعتقاد، یا
محمد کی مستقل پیغمبری کا قبول، یا ان کی غیر متنازعہ پیشوائی (Indisputable Leadership) اور
قرآن کے آخری منبع قانون ہونے کا اعتقاد شرط لازم ہے، اور نماز، روزہ، زکاۃ اور حج کے ضوابط
کی پابندی فرض ہے، مگر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے پھیلنے اور غیر مسلموں کے اس
کی طرف کھنچ کر آنے میں سدِّ راہ ہو۔ مابعد الطبیعی اعتقادات اور جامع ضوابط دوسرے
مسلکوں میں بھی موجود ہیں، اور جو انسان ان مسلکوں میں اپنی زندگی کے مسائل کا حل اپنی
سمجھ کے مطابق پا سکتے ہیں وہ ان کے عقائد اور ضوابط دونوں کو قبول کرتے ہی ہیں۔
پھر کوئی وجہ نہیں کہ اگر اسلام ان کے سامنے تمام مسائلِ زندگی کا بہترین حل پیش کرے اور
ان کی اپنی فلاح و سعادت کا راستہ کھول کر ان کے سامنے رکھ دے تو عقائد اور ضوابط کی
شرط صرف اسلام ہی کے معاملہ میں ان کے لیے غیر معمولی رکاوٹ ثابت ہو۔ رکاوٹ اگر
ہے تو کچھ اور قسم کی ہے، اس کا مطلب ہے کہ لوگوں کے لیے بالعموم اپنے پرانے مسلک کو
چھوڑ کر کوئی دوسرا مسلک اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن یہ رکاوٹ ہر ایک ہی دنیا میں پھیلتی
ہے آئے بہرحال اس رکاوٹ سے سابقہ پیش آتا ہی ہے اور جو لوگ کسی تحریک پر ایمان
لاتے ہیں وہ بہرحال اس رکاوٹ کو عبور کر کے ہی آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ اس کو سامنے
کھڑا دیکھ کر راستہ کترانے کی کوشش صرف وہی شخص کرے گا جو یا تو پختہ ایمان ہی میں
صادق نہیں ہے یا پست ہمت اور نادان ہے۔

البتہ اسلام کے حق میں اس راستہ میں جو چیز شدید تر رکاوٹ بن گئی ہے وہ جدید ہی یہ
جامد قسم کی روحِ مذہبیت ہے جسے غلطی سے اسلام سمجھا جاتا ہے۔

اس بے روح مذہبیت کا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلام کے عقائد کو محض
ایک مذہب (Religion) کے عقائد (Dogmas) بنا کر رکھ دیا گیا ہے، حالانکہ
وہ ایک مکمل فلسفۂ اجتماع اور نظامِ تمدن کی منطقی بنیاد ہیں۔ اور اسی طرح اس کی عبادات
محض پوجا اور تپسیا بنا کر رکھ دی گئی ہیں، حالانکہ وہ ان ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط
مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام نے اپنا نظامِ اجتماعی تعمیر کیا ہے۔ اس عمل تحریف

کا نتیجہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایک سیاسی، معاشی اور تمدنی ڈھانچہ حاصل کر چکنے کے لیے ان عقائد اور ان عبادات کی ضرورت ہی کیا ہے۔

دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہد گزشتہ کی ایک تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے اور اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثار قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر آثار قدیمہ شناسی تو کر سکتے ہیں، مگر یہ توقع ان سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لیے اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔

تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول، مقداروں کے غیر ضروری تعین، اور روح سے بڑھ کر مظاہر پر علم دین داری کی مکمل بنیادیں اس میں حد سے بڑھ گئی ہے، اور وہ غیروں کی نفسیت زیادہ کرنے کی اسی طرح تنفیر کا باعث بن رہی ہے۔ اس مذہبیت کے علمبرداروں کی زندگی دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر آدمی اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ انسان کی ابدی فلاح و خسران کا مدار کیا انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے جن پر یہ لوگ اتنا زور دیتے ہیں!

اسلام کے راستے میں یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے مگر یہ اسلام کا قصور نہیں ہمارا اپنا قصور ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے اس نظام تعلیم کو بدلیں جس نے دین کے تصور کو اتنا غلط اور شریعت کے علم کو اس قدر جامد بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک زندہ تحریک محض عقائد کے بل پر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ہمیں اس کے عقائد کو معقول دلائل کے ساتھ پیش کرنا ہوگا۔ پھر عقائد کے ساتھ عبادات کا اور عبادات کے ساتھ زندگی کے قوانین کا منطقی ربط واضح کرنا پڑے گا۔ پھر ان قوانین کو زندگی کے تمام عملی مسائل پر منطبق کر کے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ جتنی انسانی ضروریات ہیں ان سب کا حل ان قوانین میں موجود ہے۔ تب

نے، مسلمان زمینداروں اور رئیسوں نے اور مسلمان عوام نے، اپنے برتاؤ سے اسلام کا جو نمونہ
پیش کیا وہ ہرگز ایسا نہ تھا کہ اس ملک کے بسنے والے غیر مسلموں کو اسلام کا گرویدہ بنا سکتا۔ بلکہ اس
کے برعکس نفسانی اغراض کے لیے جو کشمکش ان کے اور غیر مسلم عناصر کے درمیان مدتہائے
دراز تک برپا ہوتی رہی اس نے اسلام کے خلاف مستقل تاریخی تعصبات پیدا کر دیے۔

اس تاریخی پس منظر کے ساتھ اسلام کا جو نمونہ آج اس ملک میں مسلمان اپنی انفرادی
زندگی اور اجتماعی طرزِ عمل سے پیش کر رہے ہیں وہ بھی کچھ ایسا خوبصورت نہیں ہے کہ اس
قسم کے نمونے کو دیکھ کر لوگ اس تحریک کے قائل ہو جائیں جس کی نمائندگی اس شان سے کی
جا رہی ہو۔ انفرادی زندگی میں ایک عام مسلمان ایک عام غیر مسلم سے آخر کس چیز میں برتر
نظر آتا ہے کہ لوگ اس برتری کے منبع کی جستجو کریں؟ اس کے برتاؤ میں، اس کے اخلاق میں،
اس کے معاملات میں کہاں کوئی خصوصیت کی جھلک بھی ایسی نمودار ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو
کہ یہ شخص کسی فائق تر اور پاکیزہ تر اصولوں کی پیروی کرتا ہے؟ کیا ایک مسلمان زمیندار "شریف"
اصطلاحی "کمینوں" کے ساتھ اپنے طبقہ کے کسی غیر مسلم "شریف" یا رئیس سے کچھ کم
نخوت برتتا ہے؟ کیا ایک مسلمان تاجر یا پیشہ ور آدمی اپنے ہم پیشہ غیر مسلم سے کچھ زیادہ
حسنِ معاملہ برتتا ہے؟ کیا ایک مسلمان حاکم یا عہدہ دار اپنے اختیارات کے استعمال میں کسی غیر مسلم
ہمسر سے کچھ بہتر اخلاقی اصولوں کی پیروی کرتا ہے؟ کیا فرقوں کے مسلمان لیڈر اور رہنما دن
انہی تمام ذلیل طریقوں کی پیروی نہیں کر رہے ہیں جن کی پیروی ان کے غیر مسلم ساتھی
کرتے ہیں؟ کیا وہی جاہلانہ بلکہ اس سے زیادہ شدت سے اپنی قوم کا تعصب، وہی کمینہ چالوں سے
غیر قوم والوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرنا، اور اپنی چھوٹی چھوٹی دنیوی اغراض کے
پیچھے فتنے برپا کرنا، جس کی شکایت یہ غیر مسلموں سے کرتے ہیں، خود ان کا بھی دامن ان سے
محفوظ نہیں ہے؟ پھر جب ایک غیر مسلم اسلام کے ان نمائندوں کی زندگی میں کہیں بھی کوئی
فوقیت کا نشان نہیں پاتا، جب وہ انہیں بھی وہی سب کچھ کرتے دیکھتا ہے جو وہ خود کرتا
ہے، اور جب وہ انہیں بھی اپنی ہی خاطر کے لیے لڑتے جھگڑتے اور کشمکش کرتے دیکھتا
ہے جن کے لیے وہ خود لڑتا جھگڑتا اور کشمکش کرتا ہے، تو آخر ان کی چیز اس کی حس

مسلک کی طرف مائل کرسکتی ہے جس کی نمائندگی یہ لوگ کر رہے ہیں؟ بلکہ جب یہ لوگ بھی نفسانیت
اور دنیا پرستی کے میدان میں ہمارے مدِ مقابل اور برابر کے حریف ہیں تو اپنے حریفوں کے مسلک پر وہ
کھلے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس کرنے لگا؟ ایک طرف پچھلی تاریخی قصومت،
اور پھر آج کی نفسانی کشمکش، کیا یہ دونوں چیزیں اس کے دل کے دروازوں پر قفل چڑھانے
کے لیے کافی نہیں ہیں؟

انفرادی زندگی سے وسیع تر قومی دائرے میں مسلمان اس وقت تک جس پالیسی پر
عمل پیرا ہیں بلکہ جسے اپنی حیثیت اجتماعی کا اساس بنا رہے ہیں وہ کیا ہے؟ اصولِ اسلام اور
مقاصدِ اسلام کا کہیں نام تک نہیں آتا۔ کسی خطبے، کسی تقریر، کسی ریزولیوشن میں آپ
ایک فقرہ تک ایسا نہیں پڑھ سکتے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہ لوگ اپنی اغراض اور اپنے
دنیوی مقاصد کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کی فلاح کے لیے عالمگیر اصول لے کر اٹھے ہیں
اور ان کی لڑائی محض اصولِ حق کی خاطر ہے۔ اس کے برعکس آپ یہ دیکھیں گے کہ ان کے
اور دوسری قوموں کے درمیان ٹھیک برابر کی قوم پرستانہ جنگ برپا ہے۔ دونوں ایک
سطح پر اتر آئے ہیں۔ ایک ہی مرتبے کی دنیوی اغراض کے لیے کشمکش کر رہے ہیں۔ ایک
ہی قسم کی پالیسی (Tactics)، زبان، اصطلاحات اور اصولِ نزاع اختیار کر رہے ہیں۔
اور وہی رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا انہی چیزوں کے لیے ہے جن کے لیے ان کے حریفوں
کا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا ہے۔ پھر کس طرح یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ جن لوگوں سے
آپ دنیوی اغراض کے لیے مساوی مرتبے پر لڑ رہے ہوں، جن سے آپ روز بحث اور
حریفی کا رشتہ رکھتے ہوں، جن کے ساتھ آپ کی سیاسی اور معاشی مفاد کے
لیے کشمکش برپا ہو، وہ آپ کی طرف سے کسی اصولی تحریک کی دعوت پر اسی طرح کھلے
دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہوں گے جس طرح وہ اشتراکیت یا ڈیموکریسی یا کسی اور
مسلک کی دعوت کے لیے تیار ہوتے ہیں؟

یہ تعصبات اسلام کے راستے میں دوسری عظیم الشان رکاوٹ ہیں۔ مگر ان کا علاج
یہ ہے کہ ہم ان تعصبات کی پیدائش کے سبب کو دیکھیں اور پھر ان کی موجودگی کو

بجائے بالکل اپنے متصادم طرف ہموار راستے پیش قدمی کرتے ہوئے کھو بیٹھیں، بجائے اس کا اصل
علاج یہ ہے کہ ہم اپنے انفرادی اور اجتماعی طرز عمل کو بدلیں اور اس طرح تمام تعصبات
کی جڑ کاٹ کر اپنے مقصد کی طرف بڑھنے کے لیے سیدھا راستہ تیار کریں۔ بعض لوگ
سطحی سرسری نگاہ میں یہ دیکھ کر کہ اسلام کے خلاف ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، تمام قوموں
میں مختلف تعصبات پھیلے ہوئے ہیں، یہ فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ اس حالت میں اسلام
ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں چل سکتا، وہ دراصل واقعات کو غلط رنگ
میں دیکھتے اور غلط نتائج نکالتے ہیں، جیسا کہ میں سطور پیش عرض کیا ہے، یہ تعصبات
اسلام اور اسلامی سیرت کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہیں (جس سے ان قوموں کو چند صدیوں
میں کم ہی سابقہ پیش آیا ہے)، بلکہ اسلام کے ان غلط نمائندوں کی روش سے پیدا ہوئے
ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود غیر اسلامی طریقوں پر چلتے رہے اور خالصۃً للہ کام
کرنے کے بجائے اپنی دنیوی اغراض اور نفسانی خواہشات کے لیے کام کرتے رہے۔
لہٰذا ان تعصبات کے تدارک کی یہی صورت ہے کہ ہم اپنی سیرت، اپنے اعمال اور
اپنی اجتماعی جدوجہد سے اسلام کی صحیح نمائندگی کریں۔ نہ یہ کہ تعصبات کی موجودگی کو اسی غلط
روش پر چلنے کے لیے حجت بنائیں جس کی وجہ سے تعصبات پیدا ہوئے ہیں۔ بالفرض
اگر یہ مان لیا جائے کہ قومی تعصبات کی موجودگی میں اسلام کا ایک خالص اصولی تحریک
کی حیثیت سے چلنا محال ہے، تو سوال یہ ہے کہ اسلامی مقاصد کے بجائے مسلمانوں کے دنیوی
مفاد کے لیے جو کشمکش آپ کے اور دوسری قوموں کے درمیان برپا ہے اس میں قوم پرستانہ
طریقوں کے جواب میں ویسے ہی قوم پرستانہ طریقے جس طرح آپ اختیار کر رہے ہیں کیا
ان سے یہ تعصبات کبھی قیامت تک بھی ختم ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر یہ نہ کہیے کہ
اس وقت کچھ خاص حالات ایسے ہیں جن کی وجہ سے اسلام ایک خالص اصولی تحریک
کی حیثیت سے نہیں چل سکتا۔ بلکہ یوں فرمائیے کہ آئندہ بھی ہمیشہ ایسے ہی حالات
موجود رہیں گے اور اگر اسلام آپ ہی کا فرقہ بنا رہا تو وہ ہمیشہ بنی اسرائیل کی
طرح محض آپ کا قومی مذہب بن کر رہے گا، کبھی ایک عالمگیر دعوت نہ بن سکے گا۔

یہ انسانی فطرت کا اقتضاء ہے کہ خود غرضی کے جواب میں خود غرضی اور قوم پرستی کے جواب میں قوم پرستی پیدا ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے بے غرضانہ حق پرستی کے مقابلہ میں تمام تعصبات اور تمام مخالفانہ جذبات تھوڑی ہی مدت میں ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور ایک سچے بے لوث حق پرست کے آگے انسان عقیدت و محبت کے سوا اور کوئی چیز پیش کرنے پر قادر ہی نہیں رہتا۔ اگر مسلمان اپنی وہی حیثیت قائم رکھتے جو دراصل ان کی تھی تو یہ ممکن نہ تھا کہ ہندوستان میں ان کے خلاف وہ تعصبات پائے جاتے جن کی آج شکایت کی جاتی ہے۔ لیکن انہوں نے خود اپنی وہ حیثیت کھو دی۔ دنیوی فائدوں کے لیے دوسری قوموں سے لڑنے جھگڑنے لگے اور اصولِ حق کے بجائے اپنی اغراض ذاتی و قومی کو انہوں نے اپنی جدوجہد کا محور بنا لیا۔ اس کے جواب میں اگر دوسروں کے اندر تعصب نہ پیدا ہوتا تو تعجب کی بات تھی۔ جن اصولوں کو آپ سچا سمجھتے ہیں ان کی آپ خود پیروی نہیں کرتے بلکہ علانیہ اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں ان کے خلاف عمل کرتے رہتے ہیں۔ جس نصب العین کا آپ اظہار کرتے ہیں، آپ کی عملی جدوجہد اس مقصد کے لیے نہیں ہے بلکہ آپ کے افراد انفرادی طور پر اور آپ کی پوری جماعت بحیثیت مجموعی اس کو پس پشت ڈال کر دوسرے مقاصد کے پیچھے چلی جا رہی ہے۔ اس صورت میں اگر اپنے خیالی نصب العین اور اپنے محض زبانی اصولوں کے لیے آپ کی اپیل دوسروں پر بے اثر ہو، اگر وہ اس اپیل میں آپ کو جھوٹا سمجھیں اور آپ کی تبلیغ کو محض خود غرضانہ چال سمجھ کر حقارت سے رد کر دیں تو آخر اس میں حیرت کی بات کون سی ہے؟

ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم مسٹر جناح کے دو قومی نظریہ پر تو ایمان نہیں لا سکتا۔ نہ

لے چودہ نکات کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے مسٹر جناح نے مارچ ۱۹۲۹ء میں پیش کیے تھے۔ ان نکات کی مکمل عبارت مسٹر جی الانا کی کتاب (Pakistan Movement: Historic Documents) صفحہ ۱۰۰ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کو پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں تحفظ اسلام کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے تحفظ کا مطالبہ ہے۔ (باقی صفحہ ۱۵۵ پر)

مسلم لیگ یا مجلس احرار یا جمعیت العلماء کے دینی جو مشغلوں میں کوئی ایسی چیز ہے جس پر کوئی ایمان
لائے۔ یعنی اگر ایمان ہو سکتا ہے تو اسلام اور اللہ پر ہو سکتا ہے بشرطیکہ ایک جماعت ایسی
کر کے دکھائے اور اسی پر چلنے والی اس کے سامنے موجود ہو۔ مگر وہ ہے کہاں؟ کون
سی جماعت آپ کے اندر ایسی موجود ہے جس نے خالص اطاعت حق کو اپنا مسلک اور
خالص دین کے تمام کام کو اپنی تمام مشغولیتوں کا مرکز و محور بنایا ہو؟ لوگ اسلام کی دعوت اور اس
کے اصول ان کی کتابوں میں دیکھتے ہیں اور ان کے معترف ہو جاتے ہیں۔ مگر اس پر عمل کرنے والی
اور اس کے نصب العین کے لیے کام کرنے والی سوسائٹی ان کو کہیں نہیں ملتی۔ پھر وہ جوش
تو خواہ کہاں جائیں؟ کیا اس سوسائٹی میں شامل ہوں جو بعد ختم دین دنیا ہی کے پیچھے دوڑی جا رہی
ہے اور انہی راستوں پر چلی جا رہی ہے جن پر غیر مسلم چلتے ہیں؟ آپ کی ایک جماعت لڑتی
ہے اس لیے کہ ارض ہند پر انگریز کے بجائے ہندوستانی کا اقتدار قائم ہو۔ حالانکہ یہی چیز
ایک شخص کو غیر مسلم جماعتوں میں بھی مل جاتی ہے۔ پھر وہ آپ کے پاس کیوں آئے؟ آپ
کی دوسری جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ہندوستان کے ہندوؤں میں نسلی مسلمانوں کے ذہنی مفاد
کا تحفظ کیا جائے۔ یہ چیز اس کو خود اپنی قوم پرستی کی بدولت مل سکتی ہے۔ پھر وہ اپنی
قوم پرستی کو چھوڑ کر آپ کی قوم پرستی پر کیوں ایمان لائے؟ انسان کو غیر اللہ کے تسلط سے
آزاد کرانے والی جماعت آپ میں سے کہاں ہے کہ کوئی اس کے اصول و مقاصد پر ایمان لائے اور
اس میں شامل ہونے کے لیے آگے بڑھے؟

تیسری مشکل

سب سے بڑی مشکل جو تبلیغ کرنے والوں کے لیے ناقابل حل بن گئی
ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کروڑوں کی تعداد میں ایک ایسی قوم بستی ہے جو نام کی مسلمان ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) انگریزی حکومت ملک میں تھی۔ ہندو عوام کے ایک [illegible] ہی کی صحت میں یہ
تصور [illegible] تھے۔ اس لیے جب [illegible] مسلمانوں کے آگے [illegible] کے لیے [illegible]
کوئی اہمیت نہ تھی۔ (۱۹۴۷ء)

دیہاتی غیر مسلم ۔ اس قوم کے اس حال میں یہاں موجود ہونے سے متعدد پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کا کوئی حل لوگوں کو نہیں بتا اور اسی وجہ سے رہنما اور کارکن سب پراگندہ عمل ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں ان چند بڑی بڑی الجھنوں کی طرف اشارہ کروں گا جو اس صورتِ حال نے پیدا کر دی ہیں۔

بعض لوگ ہندوستان کے وسیع ملک میں اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ اصل سوال اسلام کے احیاء (Revival) کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے احیاء کا ہے۔ یعنی یہ قوم جو مسلمان کے نام سے پکاری جاتی ہے، اس کو ایک زندہ اور طاقتور قوم بنانا اور برسرِ عروج لانا اصل مقصود ہے اور اسی کا نام اسلام کا احیاء ہے۔ یہ غلط فہمی ان کو مسلم قوم پرستی کی طرف کھینچ لے گئی ہے۔ جس طرح ترکوں اور نازیوں کے لیے سوال ان کی قوم کے عروج کا ہے، جس طرح مسولینی کے لیے اطالوی قوم اور ہٹلر کے لیے جرمن قوم کے عروج کا سوال ہے، اسی طرح ان مسلم قوم پرستوں کے لیے اصل سوال اس مسلمان قوم کے عروج کا ہے جس میں یہ پیدا ہوئے ہیں اور جس سے ان کی قسمتیں وابستہ ہیں۔ یہ اسلام کی خدمت اس کو سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تنظیم، قطع نظر اس سے کہ وہ تنظیم کیسی ہی کیوں نہ ہو، ان کی معاشی خوشحالی (خواہ وہ کسی قسم کے ذرائع سے حاصل ہو)، اور ان کی سیاسی و ملکی تنظیم (جو قومی تنظیم ہو) پر زور صرف کیا جائے، اور ان کو ایک زبردست قوم بنا دیا جائے۔ پھر جب یہ ان کا مقصد قرار پایا تو انہوں نے معاملات کو اسی نظر سے دیکھنا شروع کیا کہ کون سی تدابیر اس مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہو سکتی ہیں، اور جو تدبیریں بھی ان کو دنیا میں قومی عروج کے لیے مفید نظر آئیں ان کو بے تکلف یہ لوگ استعمال کرنا شروع کر دیا، خواہ وہ اسلام سے ان کو کتنی ہی دور لے جانے والی ہوں۔ یہ ذہنیت سر سید احمد خاں کے وقت سے شروع ہو کر آج مسلمانوں کے اکثر و بیشتر رہنماؤں، اور کارکنوں اور اداروں پر مسلط ہے۔ اسلام کے نام سے جو کچھ سوچا جاتا ہے مسلمانوں کے لیے سوچا جاتا ہے اور اسلام کی حیثیت سے آزاد ہو کر سوچا جاتا ہے۔

[illegible] (جدید)

کچھ دوسرے لوگ اسلام اور مسلمان کو اس حیثیت سے تو خلط ملط نہیں کرتے لیکن ایک دوسری حیثیت سے وہ اسلام کے مستقبل اور جزو نسلی مسلمانوں کے وجود ہی سے وابستہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ وہ چاہتے تو اسلام ہی کا احیاء ہیں، مگر ان کا خیال یہ ہے کہ اسلام کا احیاء ہو تو سب سے پہلے سب مسلمانوں کے مکمل مسلمان ہو جانے پر ہو، اس وقت تو یہ نسلی حیثیت سے مسلمان ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک یہ سارے کے سارے مسلمان ذہنی، اخلاقی اور عملی حیثیت سے مکمل نہ ہو جائیں، قدم آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ اور یہ چیز چونکہ خود بخود محال نظر آتی ہے اس لیے یہ لوگ اصل مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کے بجائے ادھر ادھر کے فضول کاموں میں مختلف ضمنی مقاصد کے پیچھے اپنی قوتیں ضائع کر رہے ہیں۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے سامنے اسلامی نصب العین زیادہ واضح ہو چکا ہے اور وہ اسی کی طرف بڑھنا بھی چاہتے ہیں، مگر یہ سوال ان کو پریشان کرتا ہے کہ ہمارے کار فرما دماغ اور کارکن ہاتھ سب کے سب اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد کرنے میں لگ جائیں تو غیر مسلموں کا قائم کردہ نظام تمدن و سیاست اور اس کے ماتحت اثرات میں چند کروڑ قوم کے سیاسی و معاشی مفاد کا کیا حشر ہوگا۔ اس سوال کی اہمیت ان کی نگاہ میں اتنی زیادہ ہے کہ وہ اپنے عزم کو ملتوی کر رکھتے ہیں کہ پہلے اس سوال کو حل کیا جائے اور اصل مقصد کی طرف قدم اس وقت بڑھایا جائے جب اس قوم کا کوئی مسئلہ حل ہونے کے لیے باقی نہ رہے۔

لیکن یہ تمام الجھنیں غیر اسلامی طرز فکر اور غیر اسلامی ذہنیت کی پیدا کردہ ہیں۔ اگر خالص مسلمان ہونے کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی الجھن بھی ہمارے لیے الجھن نہیں رہتی۔ ہمارے سامنے اصل سوال کسی قوم کے احیاء کا نہیں بلکہ مسلک اسلام کے احیاء کا ہے۔ قوم کے احیاء کا خیال دماغ سے نکال دیجیے تو وہ تمام مسائل کافور کی طرح اڑ جاتے ہیں جو قومیت کی اصطلاحوں میں سوچنے والے لوگوں کو پریشان کیا کرتے ہیں۔ جب ہم مسلک اسلام کے پیرو ہیں اور اسی کو فروغ دینا ہمارا مقصد ہے تو ہمیں کسی ایسے مفاد سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں ہو سکتی جو کسی غیر اسلامی نظام سے وابستہ ہو یا جس کی اسلام سے متصادم ہو۔ ہم اپنے دماغ کو اس کے لیے

سوچنے کی کچھ بھی زحمت دیں گے۔ نسلی جماعت کی تمام تحریکوں سے بھی ہمارا کوئی تعلق نہ ہو
گا جو غیر اسلامی اصول پر مبنی ہوں۔ ایک قوم اور دوسری قوم کی باہمی کشمکش اور ایک
قوم پر دوسری قوم کے تفوق کی کوششوں سے بھی ہم پوری بے تعلقی برتیں گے۔ ہم کو جو کچھ بھی
دلچسپی ہوگی اسلامی نظامِ فکر و عمل سے ہے، اس کی تبلیغ و اشاعت سے، اور اس کو حکمراں بنانے
کی سعی و جہد سے ہوگی۔ مسلمانوں سے ہمارا تعلق صرف اسی مسلک پر ہوگا جس حد تک ان کا
تعلق اسلام سے ہے۔ جو بھی شخص خواہشِ نفس اور ہر غیر اللہ کی بندگی چھوڑ کر صرف اللہ کی
بندگی میں آ جائے وہ ہمارا بھائی اور رفیق ہے، خواہ وہ نسلی مسلمانوں میں سے آئے یا
غیر مسلموں میں سے۔ ہم پیدائشی مسلمانوں کو بھی اسی مسلک کی طرف دعوت دیں گے
اور غیر مسلموں کو بھی۔ ہمارے نزدیک اسلام کو ان نسلی مسلمانوں کے دامن سے بندھا ہوا
ماننا کہ اگر یہ ڈوبیں تو وہ بھی ڈوبے اور یہ اٹھیں تو وہ بھی اٹھے۔ اسلام ان کے باپ دادا
کی جاگیر نہیں ہے۔ یہ اگر مسلک پر چلیں اور اس کے لیے مرنے پر تیار ہوں تو ہم دوش بدوش
ہمارے رفیق، ورنہ جس جہنم میں ان کا جی چاہے جا کر گر جائیں۔ ہم اللہ کا کلمہ دوسرے طبقوں
کے پاس لے جائیں گے۔

یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں ٹھیک یہی طرزِ عمل انبیاء و رسل کا تھا اور اسی کو نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے اختیار کیا۔ قرآن میں جن کو اہلِ کتاب کہا گیا ہے وہ دراصل "نسلی مسلمان" ہی تو تھے
خدا اور ملائکہ اور نبی اور کتاب اور آخرت سب کو مانتے تھے، اور عبادات اور احکام کی بھی
پیروی بھی کرتے تھے۔ البتہ اسلام کی اصل روح یعنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص
کر دینا اور دین میں شرک نہ کرنا، یہ چیز ان میں سے نکل گئی تھی۔ اب دیکھیے کیا آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے اس "نسلی مسلمان" قوم کے بچاؤ کی کوششوں کو مقدم فرمایا تھا؟ نہیں۔ کیا
آپ نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک یہ سارے کے سارے "نسلی مسلمان" "اصل مسلمان" نہ
بن جائیں گے قدم آگے نہ بڑھایا جائے گا؟ یہ بھی نہیں۔ کیا آپ نے ان "نسلی مسلمانوں" کے
دنیوی مسائل کو حل کرنے تک حق کی تبلیغ کی کوششوں کو ملتوی رکھا تھا؟ یہ بھی نہیں۔ پھر آپ
نے کیا کیا؟ سب جانتے ہیں کہ آپ نے تمام حالات اور تمام مسائل سے قطعِ نظر کر کے

و نسلی مسلموں، اور غیر مسلموں سب کو اس خدائے واحد کی بندگی کی طرف دعوت دی، جس نے اسے
قبول کیا اور غیر اللہ کی بندگی و اطاعت ترک کر دی، اسے اپنے جتھے میں شامل کر لیا اور پھر
ان لوگوں کو لے کر اپنی نظام اطاعت یعنی دین حق کو قائم کرنے کے لیے براہِ راست جدوجہد
شروع کر دی یہاں تک کہ اس کو قائم کر کے چھوڑا۔

ٹھیک یہی طریقہ ہے جس کی پیروی کو میں حق سمجھتا ہوں، اسی کی پیروی خود کرنا چاہتا
ہوں، اور اسی کی طرف سب لوگوں کو دعوت دیتا ہوں جن کا نصب العین اسلامی ہے۔

(ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۴۰ء)

اِسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟[1]

اس مقالہ میں مجھے اُس عمل (Process) کی تشریح کرنی ہے جس سے ایک طبعی نتیجہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔ آج کل ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلامی حکومت کا نام بازیچۂ اطفال بنا ہوا ہے۔ مختلف حلقوں سے اس تخیل اور اس مقصد کا اظہار ہو رہا ہے مگر ایسے ایسے عجیب راستے اس منزل تک پہنچنے کے لیے تجویز کیے جا رہے ہیں جن سے کہیں تک پہنچنا اتنا ہی محال ہے جتنا موٹر کار کے ذریعہ سے امریکہ تک پہنچنا۔ اس خام خیالی (Loose Thinking) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جس کا نام "اسلامی حکومت" ہے مگر خالص علمی (Scientific) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ وہ قائم کیونکر ہوا کرتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علمی طریقہ پر اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔

نظامِ حکومت کا طبعی ارتقاء

جو لوگ اجتماعیات میں کچھ بھی نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ریاست خواہ کسی نوعیت

---

[1] یہ مقالہ ۱۲ ستمبر ۱۹۴۰ء کو اسٹریچی ہال، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا تھا۔

کی جو مصنوعی طریقے سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر تیار ہو اور پھر وہاں سے لا کر اس کو کسی جگہ جما دیا جائے۔ اس کی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اندر اخلاقی، نفسیاتی، تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ ابتدائی لوازم (Prerequisites)، کچھ اجتماعی محرکات، کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں جن کے فراہم ہونے اور زور کرنے سے وہ وجود میں آتی ہے۔ جس طرح منطق میں آپ دیکھتے ہیں کہ نتیجہ ہمیشہ مقدمات (Premises) کی ترتیب ہی سے برآمد ہوتا ہے، جس طرح علم الکیمیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کیمیاوی مرکب ہمیشہ کیمیاوی کشش رکھنے والے اجزا کے ایک خاص طریقہ پر ملنے ہی سے برآمد ہوتا ہے، اسی طرح اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ایک حکومت صرف اُن حالات کے اقتضا کا نتیجہ ہوتی ہے جو کسی سوسائٹی میں بہم ہو گئے ہوں۔ پھر حکومت کی نوعیت کا تعین بھی بالکلیہ اُن حالات کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے جو اس کی پیدائش کے مقتضی ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں کہ مقدمات کسی نوعیت کے ہوں اور ان کی ترتیب سے نتیجہ کچھ اور نکل آئے، کیمیاوی اجزا کسی خاصیت کے ہوں اور ان کو ملانے سے مرکب کسی اور قسم کا بن جائے، درخت لیموں کا لگایا جائے اور نشوونما پا کر وہ پھل آم کے دینے لگے، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسباب ایک خاص نوعیت کی حکومت کے فراہم ہوں، اُن کے مل کر کام کرنے کا ڈھنگ بھی اسی نوعیت کی حکومت کے نشوونما پانے کے لیے مناسب ہو، مگر ارتقائی مراحل سے گزر کر جب وہ تکمیل کے قریب پہنچے تو انہی اسباب اور اسی عمل کے نتیجے میں بالکل ایک دوسری ہی نوعیت کی حکومت بن جائے۔

یہ گمان نہ کیجیے کہ میں یہاں جبریت (Determinism) کو دخل دے رہا ہوں اور انسانی ارادہ و اختیار کی نفی کر رہا ہوں۔ بلاشبہ حکومت کی نوعیت متعین کرنے میں افراد اور جماعتوں کے ارادہ و عمل کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مگر دراصل میں یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جس نوعیت کا بھی نظامِ حکومت پیدا کرنا مقصود ہو، اُسی کے مزاج اور اُسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اُسی کی طرف لے جانے والا طرزِ عمل اختیار کرنا بہرحال

ناگزیر ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اٹھے، اسی قسم کے انفرادی کیریکٹر تیار ہوں، اسی طرز کا اجتماعی اخلاق بنے، اسی طرز کی لیڈرشپ ہو، اور اسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا تقاضا اس خاص نظام حکومت کی نوعیت فطرۃً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مدت تک جدوجہد کرنے سے ان کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کی تمدنی حالت سوسائٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظام حکومت کا جینا دشوار ہو جاتا ہے تب ایک طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظام حکومت ابھرتا ہے جس کے لیے ان طاقت ور اسباب نے جدوجہد کی ہو۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک بیج سے جب درخت پیدا ہوتا ہے اور اپنے زور میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو نشوونما کی ایک خاص حد پر پہنچ کر اس میں وہی پھل آنے شروع ہو جاتے ہیں جن کے لیے اس کی فطری ساخت زور کر رہی تھی۔ اس حقیقت پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو یہ تسلیم کرنے میں ذرا تأمل نہ ہوگا کہ جہاں تحریک، لیڈرشپ، انفرادی سیرت، اجتماعی اخلاق، اور حکمت عملی ہر ایک چیز ایک نوعیت کا نظام حکومت پیدا کرنے کے لیے موزوں و مناسب ہو، اور امید یہ کی جائے کہ ان کے نتیجہ میں بالکل ہی ایک دوسری نوعیت کا نظام پیدا ہوگا، وہاں بے شعوری، خام خیالی اور ضعف ادراک کے سوا کوئی چیز کام نہیں کر رہی ہے۔

اصولی حکومت

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ حکومت جس کو ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں، اس کی نوعیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قومیت کا عنصر اس میں قطعی ناپید ہے۔ وہ خالص ایک اصولی حکومت ہے۔ انگریزی میں میں اس کو (Ideological State) کہوں گا۔ یہ "اصولی حکومت" وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ ناآشنا رہی ہے اور آج تک ناآشنا ہے۔ قدیم زمانہ میں لوگ صرف خاندانوں یا طبقوں کی حکومت سے

واقف تھے۔ بعد میں نسلی اور قومی حکومتوں سے واقف ہوئے۔ محض ایک اصول "حکومت"
اس بنیاد پر کہ جو اس اصول کو قبول کرلے وہ بلالحاظ قومیت اسٹیٹ کو چلانے میں حصہ دار
ہوگا، دنیا کے تنگ ذہن میں کبھی نہ سما سکی۔ عیسائیت نے اس تخیل کا بہت ہی دھندلا
سا نقش پایا، مگر اس کو وہ مکمل نظامِ فکر نہ مل سکا جس کی بنیاد پر کوئی اسٹیٹ تعمیر ہوتا۔
انقلابِ فرانس میں اصولی حکومت کے تخیل کی ایک ذرا سی جھلک انسان کی نظر کے
سامنے آئی مگر نیشنلزم کی تاریکی میں گم ہوگئی۔* اشتراکیت نے اس تخیل کا اعادہ پھر چاہا، حتیٰ کہ
ایک حکومت بھی اس کی بنیاد پر تعمیر کرنے کی کوشش کی، اور اس کی وجہ سے دنیا کی سمجھ میں
یہ تخیل کچھ کچھ آنے لگا تھا، مگر اس کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں بھی نیشنلزم گھس گیا۔ ابتدا سے
آج تک تمام دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مسلک ہے جو قومیت کے ہر شائبہ سے پاک
کرکے حکومت کا ایک نظام خالص آئیڈیالوجی کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے اور تمام انسانوں کو
دعوت دیتا ہے کہ اس آئیڈیالوجی کو قبول کرکے غیر قومی حکومت بنائیں۔

یہ چیز چونکہ نرالی ہے، اور گردوپیش کی تمام دنیا اس کے خلاف چل رہی ہے اس
لیے نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی اس کو اور اس کے جزوی مضمرات (Implications) کو
سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ جو لوگ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں، مگر جن کے
اجتماعی تصورات تمام تر یورپ کی تاریخ اور یورپ ہی کے سیاسیات اور علومِ عمران
(Social Sciences) سے بنے ہیں، ان کے ذہن کی گرفت میں یہ تصور کسی طرح
نہیں آتا۔ بیرونِ ہند کے وہ ممالک جن کی بیشتر آبادی مسلمان اور سیاسی حیثیت سے
آزاد ہے، وہاں اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں جب زمامِ حکومت آئی تو ان کو حکومت کا
کوئی نقشہ قومی حکومت (National State) کے سوا نہ سوجھا، مگر وہ اسلام کے عہدِ عروج

---

* اس کی بنیاد نفرت پر تھی اس لیے کشت و خون ہی سے خود اپنی قوم کے لوگوں پر ظلم و ستم توڑے
گئے اور اس قدر بے دردی سے قتلِ عام کیا گیا کہ بیشتر اونچے طبقے کے خاندان مٹ گئے۔ اس کے بعد
اس کا نشانہ نیشنلزم کا راستہ ہوگیا۔ (مرتب)

کرنے کی تحریک خود ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنے سے شروع کی جا سکتی ہے!

خلافتِ الٰہیہ

اسلامی حکومت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُس کی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصور پر قائم کی گئی ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ[1] یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے۔ وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا طبقہ یا قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو بھی حاکمیت (Sovereignty) کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ حکومت کی صحیح شکل اس کے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے، اور یہ حیثیت صحیح طور پر صرف دو صورتوں سے قائم ہو سکتی ہے: یا تو کسی انسان کے پاس براہِ راست خدا کی طرف سے قانون اور دستورِ حکومت آیا ہو، یا وہ اس شخص کی پیروی اختیار کرے جس کے پاس خدا کی طرف سے قانون اور دستور آیا ہے۔ اس خلافت کے کام میں تمام وہ لوگ شریک ہوں گے جو اس قانون پر ایمان لائیں اور اس کی پیروی کرنے پر تیار ہوں۔ یہ کام اس احساس کے ساتھ چلایا جائے گا کہ ہم سب بحیثیت مجموعی، اور ہم میں سے ہر ایک فرداً فرداً خدا کے سامنے جواب دہ ہے، اُس خدا کے سامنے جو ظاہر اور پوشیدہ، ہر چیز کا جاننے والا ہے، جس کے علم سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی، اور جس کی گرفت سے ہم مر کر بھی نہیں چھوٹ سکتے۔ خلافت کی ذمہ داری جو ہمارے سپرد کی گئی ہے، وہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم لوگوں پر اپنا حکم چلائیں، اُن کو اپنا غلام بنائیں، ان کے سر اپنے آگے جھکوائیں، اُن سے ٹیکس وصول کر کے اپنے محل تعمیر کریں، حاکمانہ اختیارات سے کام لے کر اپنے عیش، اپنی نفس پرستی اور اپنی کبریائی کا سامان کریں، بلکہ یہ بارِ امانت ہم پر اس لیے ڈالا گیا ہے کہ ہم خدا کے قانونِ عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اس قانون کی پابندی

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میرا رسالہ "اسلام کا نظریۂ سیاسی"۔ (قدیم)

اور اس کے نفاذ میں ہم نے اگر ذرا سی کوتاہی بھی کی، اگر ہم نے اس کام میں ذرہ برابر بھی خود غرضی، نفس پرستی، تعصب، جانب داری یا بددیانتی کو دخل دیا تو ہم خدا کی عدالت سے سزا پائیں گے خواہ دنیا میں ہر سزا سے محفوظ رہ جائیں۔

اس نظریہ کی بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اپنی جڑ سے لے کر چوٹی سے چوٹی شاخوں تک ہر چیز میں دنیوی حکومتوں (Secular States) سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس کی ترکیب، اس کا مزاج، اس کی فطرت، کوئی چیز بھی ان سے نہیں ملتی۔ اس کو چلانے اور چلنے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت، خاص طرز کی سیرت، اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔ اس کی فوج، اس کی پولیس، اس کی عدالت، اس کے مالیات، اس کے قوانین، اس کے محاصل، اس کی انتظامی پالیسی، اس کی خارجی سیاست، اس کی صلح و جنگ کے معاملات، سب کے سب دنیوی ریاستوں سے مختلف ہیں۔ ان کی عدالتوں کے چیف جسٹس اس کی عدالت کے کلرک بلکہ چپراسی تک بننے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ ان کی پولیس کے انسپکٹر جنرل وہاں کانسٹیبل کی جگہ کے لیے بھی موزوں نہیں ٹھہرتے۔ ان کے جنرل اور فیلڈ مارشل وہاں سپاہیوں میں بھرتی کرنے کے قابل بھی نہیں۔ ان کے وزرائے خارجہ وہاں کسی منصب پر تو کیا فائز ہوں گے، شاید اپنے جھوٹ، دغا، اور بددیانتیوں کی بدولت جیل جانے سے بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ غرض وہ تمام لوگ جو ان حکومتوں کے کاروبار چلانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں، جن کی اخلاقی و ذہنی تربیت ہی کے رُو سے مناسبِ حال کی گئی ہو اسلامی حکومت کے لیے قطعی ناکارہ ہیں۔ اس کو اپنے شہری، اپنے ووٹر، اپنے کونسلر، اپنے اہل کار، اپنے سپاہی، اپنے جج اور مجسٹریٹ، اپنے محکموں کے ڈائرکٹر، اپنی فوجوں کے قائد، اپنے خارجی سفراء اور اپنے وزراء غرض اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزاء، اپنی انتظامی مشین کے تمام پرزے بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہیں۔ اس کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں، جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں، جن کی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان دنیوی نفع و نقصان سے زیادہ وزن رکھتا ہو، جو ہر حال میں اس

ضابطہ اور اُس ضابطۂ عمل کے پابند ہوں جس کے لیے مستقل طور پر بنا دیا گیا ہے، جن کی تمام
سعی و جہد کا مقصد صرف خدا کی رضا ہو، جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس
کی غلامی مسلط نہ ہو، جو تنگ نظری و تعصب سے پاک ہوں، جو مال اور طاقت کے
نشے میں بدمست ہو جانے والے نہ ہوں، جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے
نہ ہوں، جن کی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ جب زمین کے خزانے ان کے دستِ قدرت
میں آئیں تو وہ سچے امانت دار ثابت ہوں، جب بستیوں کی حکومت ان کے
ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیند سے محروم ہو جائیں اور لوگ ان کی حفاظت میں اپنی
جان، مال، آبرو، ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں، جب وہ فاتح کی حیثیت
سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو ان سے قتل و غارت گری، ظلم و ستم اور
بدکاری و شہوت رانی کا کوئی اندیشہ نہ ہو، بلکہ ان کے ہر سپاہی کو مفتوح ملک کے
باشندے اپنی جان و مال اور اپنی عورتوں کی عصمت کا محافظ پائیں، جن کی دھاک
بین الاقوامی سیاست میں اس وجہ سے ہو کہ اُن کی راستی، انصاف پسندی، اصولِ
اخلاق کی پابندی اور عہد و پیمان پر تمام دنیا میں اعتماد کیا جائے۔ اس قسم کے اور صرف اسی
قسم کے لوگوں سے اسلامی حکومت بن سکتی ہے۔ اور یہی لوگ اس کو چلا سکتے ہیں۔ رہے
مادہ پرست، افادی ذہنیت (Utilitarian Mentality) رکھنے والے لوگ، جو
دنیوی فائدوں اور شخصی یا قومی مصلحتوں کی خاطر ہمیشہ ایک نیا اصول بناتے ہوں، جن کے
پیشِ نظر نہ خدا ہو، نہ آخرت، بلکہ جن کی ساری کوششوں کا مرکز و محور اور ساری پالیسیوں
کا مدار صرف دنیوی فائدہ و نقصان ہی کا خیال ہو، وہ ایسی حکومت بنانے یا چلانے کے
قابل کہاں ہوں گے؟ اُن کا اس حکومت کے دفتر میں موجود ہونا ہی ایک عمارت میں
دیمک کی موجودگی کا حکم رکھتا ہے۔

اسلامی انقلاب کی سبیل

اسلامی حکومت کی اس اہمیت کو ذہن میں رکھ کر غور کیجیے کہ اس منزل تک پہنچنے کی
کیا سبیل ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں، کسی سوسائٹی میں جس قسم

کے نظری، اخلاقی، تمدنی اسباب و عوامل فراہم ہوتے ہیں، اُن کے تعامل سے اُسی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک درخت اپنی ابتدائی کونپل سے لے کر پورا درخت بننے تک تو لیموں کی حیثیت سے نشوونما پائے مگر بار آوری کے مرحلے پر پہنچ کر یکایک آم کے پھل دینے لگے۔ درحقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریۂ حیات، وہ مقصدِ زندگی، وہ معیارِ اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اسی اخلاقی روح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مورخ، مسلم ماہرینِ مالیات و معاشیات، مسلم ماہرینِ قانون، مسلم ماہرینِ سیاست، غرض ہر شعبۂ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نقطۂ نظر کے اعتبار سے مسلم ہوں، جن میں یہ قابلیت ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کر سکیں، اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخدا شناس ائمۂ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی سیادت (Intellectual Leadership) کا سکہ جما دیں۔[1] اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظامِ زندگی کے خلاف جدوجہد کرے جو گرد و پیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اس کے علمبردار مصیبتیں اٹھا کر، سختیاں جھیل کر، قربانیاں دے کر، مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں۔ آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جس کو ہر پرکھنے والا ہر طرح سے جانچ کر بے کھوٹ کامل عیار (Finest Standard) سونا ہی

---

[1] ملاحظہ ہو میرا مقالہ "نیا نظامِ تعلیم"۔ (قدیم)

پائے۔ یہی قربانی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے یہی اس مخصوص آئیڈیالوجی کا
مظاہرہ کریں جس کے علمبردار بن کر وہ اٹھے ہیں۔ اور ان کی ہر جنبش سے عیاں ہو کر رہے
بے لوث، بے غرض، راست باز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، با اصول، خدا ترس لوگ
انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں اس
میں ہر فرد انسان کے لیے عدل اور امن ہوگا۔ اس طرح کی جد و جہد سے سوسائٹی کے وہ
تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے اس تحریک میں کھنچ آئیں
گے، پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجے کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات اس
کے مقابلہ میں دبتے چلے جائیں گے، عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا،
اجتماعی زندگی میں اس مخصوص نظام حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے گی، اور اس بدلی
ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائے گا۔ آخرکار ایک لازمی
اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی نظام حکومت قائم ہو جائے گا جس کے لیے اس طرح زمین
تیار کی گئی ہو۔ اور جوں ہی کہ وہ نظام قائم ہوگا اس کو چلانے کے لیے ابتدائی اہلکاروں
سے لے کر وزراء اور نظماء تک ہر درجہ کے مناسب کل پرزے اس نظام تعلیم و
تربیت کی بدولت موجود ہوں گے جس کا ذکر ابھی میں کر چکا ہوں۔

یہ ہے اس انقلاب کے ظہور اور اس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جس کو
اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ دنیا کے انقلابات کی تاریخ آپ کے
سامنے ہے۔ آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ایک خاص نوعیت کا انقلاب
اسی نوعیت کی تحریک، اسی نوعیت کے لیڈر اور کارکن اور اسی نوعیت کا اجتماعی
شعور اور تمدنی و اخلاقی ماحول چاہتا ہے۔ انقلاب فرانس کو وہی خاص اخلاقی و ذہنی
اساس درکار تھی جو روسو، والٹیر اور مونٹسکیو جیسے لیڈروں نے تیار کی۔ انقلاب روس
صرف مارکس کے افکار اور لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈرشپ اور ان ہزاروں اشتراکی کارکنوں ہی
کی بدولت رونما ہو سکتا تھا جن کی زندگیاں اشتراکیت کے سانچے میں ڈھل چکی تھیں۔
جرمنی کا نیشنل سوشلزم اسی مخصوص اخلاقی، نفسیاتی اور تمدنی زمین ہی میں جڑ پکڑ سکتا تھا جو ہیگل،

فلسفے گھڑتے ، نیٹشے ، اور جیمز سے عملیت کے نظریات اور چرچل کی لیڈرشپ لے لیا۔
اسی طرح سے اسلامی انقلاب بھی صرف اسی صورت میں برپا ہو سکتا ہے جب کہ ایک علمی
تحریک ، قرآنی نظریات و تصورات اور نبوی سیرت و کردار کی بنیاد پر اٹھے اور اجتماعی زندگی
کی مادی، دینی، اخلاقی، نفسیاتی اور تہذیبی بنیادوں کو طاقت اور جد و جہد سے بدل ڈالے۔
یہ بات کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قوم پرستانہ ذہنیت کی کوئی تحریک جس کا سرچشمہ
باطنی کلچر و تعلیم ہو جو مغربی فلسفہ سے ہی پیدا ہوتا ہے اور جس کی بنیاد مادی اخلاقیات
(Utilitarian Morals) اور مصلحت پرستی (Pragmatism) پر ہو، اسلامی
انقلاب کو کس طرح برپا کر سکتی ہے؟ میں اس قسم کے معجزات پر یقین نہیں رکھتا جن پر فرانس
کے سابق وزیر اعظم موسیو بریاں یقین رکھتے تھے۔* میں تو اس کا قائل ہوں کہ جیسی تدبیر کی جائیگی
ویسے ہی نتائج برآمد ہوں گے۔

خام خیالیاں

چلئے یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم ان کے تمام دردوں کی دوا
ہے: "اسلامی حکومت" یا "آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام" کے نعرے تک پہنچنے کی سعی
یہ بھی جاری ہے کہ مسلمان قوم ہیں، قوم سے مرکب ہے وہ سب ایک مرکز پر جمع ہوں،
متحد ہوں اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام کریں۔ لیکن در اصل یہ قوم پرستانہ
پروگرام ہے۔ جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لیے جد و جہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریقہ
اختیار کرے گی خواہ وہ ہندو قوم ہو یا سکھ یا جرمن یا اطالوی۔ قوم کے عشق میں ڈوبا
ہوا ایک لیڈر، جو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب چالیں چلنے میں ماہر ہو اور جس میں
حکم چلانے کی خاص قابلیت موجود ہو، ہر قوم کی سربلندی کے لیے مفید ہوتا ہے، خواہ

---

* مسٹر ویکہم سٹیڈ نے پیرس میں کا لکھا ہے کہ موسیو بریاں نے، جو اس وقت وزیر اعظم تھے،
پیرس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب فرانس کو صرف ایک معجزہ ہی بچا سکتا ہے اور میں
معجزات کا قائل ہوں۔ (مرتب)

مدد سے باضابطہ ہر ہٹلر یا مسولینی۔ ایسے [illegible] لاکھوں نوجوان جو قومی عزائم کے لیے اپنے لیڈر کی اطاعت میں منظم حرکت کر سکتے ہوں، ہر قوم کا جھنڈا بلند کر سکتے ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ جاہلیت پر ایمان رکھتے ہوں یا جمعیت پر۔ پس اگر مسلمان ایک نسل و [illegible] کی تربیت کا نام ہے اور پیش نظر مقصد صرف اس کا بول بالا کرنا ہے تو اس کے لیے واقعی یہی سبیل ہے جو تجویز کی جا رہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک قومی حکومت بھی میسر آ سکتی ہے اور جمہوری وطنی حکومت میں اچھا خاصا حصہ بھی مل سکتا ہے۔ لیکن اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے منتہیٰ تک پہنچنے کے لیے یہ پہلا قدم بھی نہیں بلکہ اُلٹا قدم ہے۔

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس تعداد میں کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ اُن سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لیے جو تدبیریں کفار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے موکل کی پیروی کرتے وقت خدا کے خوف سے اُتنا ہی خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیرمسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پا کر یا ایک مسلمان عہدہ دار حکومت پا کر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیرمسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اس کی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کر کے ایک منظم گلہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے ان کو لومڑی کی ہوشیاری سکھانا، یا فوجی تربیت سے ان میں بھیڑیے کی درندگی پیدا کر دینا جنگل کی فرمانروائی حاصل کرنے کے لیے تو مفید ہو سکتا ہے، مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کون ان کی اخلاقی برتری تسلیم کرے گا؟ کس کی نگاہیں ان کے سامنے عزت سے جھکیں گی؟ کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لیے جذبۂ احترام پیدا ہوگا؟ کہاں ان کے "انفاسِ قدسیہ" سے

يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا کا منظر دکھا سکے گا، کس جگہ ان کی دعالی
امامت کا سکہ جمے گا، اور زمین پر بسنے والے کہاں ان کا خیر مقدم اپنے نجات دہندوں
کی حیثیت سے کریں گے؟ اعلائے کلمۃ الحق جس چیز کا نام ہے اس کے لیے تو صرف
ان کارکنوں کی ضرورت ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور خدا کے قانون پر نفع و
نقصان کی پروا کیے بغیر چلنے والے ہوں، خواہ وہ نسلی مسلمان قوم میں سے ملیں یا
کسی دوسری قوم سے بھرتی ہو کر آئیں۔ ایسے دس آدمی اس مقصد کے لیے زیادہ قیمتی ہیں
بہ نسبت اس کے کہ ان ذخیرہ جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں ۲۰ لاکھ یا پچاس لاکھ کی تعداد
میں بھرتی ہو جائے۔ اسلام کو تانبے کے ان سکوں کا مقدار مطلوب نہیں ہے جن پر
اشرفی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہو۔ وہ سکے کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے
کہ ان نقوش کے پیچھے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایک سکہ جعلی اشرفیوں
کے ڈھیر سے اس کے نزدیک زیادہ قیمتی ہے۔

پھر جس لیڈرشپ کی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ضرورت ہے وہ ایسی لیڈرشپ
ہے جو ان اصولوں سے ایک انچ بھی ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو جن کا بول بالا کرنے کے
لیے اسلام اٹھا ہے، خواہ اس ہٹ کی بدولت تمام مسلمان بھوکے ہی کیوں نہ مر جائیں
بلکہ تہ تیغ ہی کیوں نہ کر دیئے جائیں۔ ہر معاملہ میں اپنی قوم کا فائدہ تلاش کرنے والی
اور اصول سے بے نیاز ہو کر ہر اس تدبیر کو جس میں قوم کی بہتری نظر آئے، اختیار
کر لینے والی لیڈرشپ اور وہ لیڈرشپ جس میں تقویٰ اور خدا ترسی کا رنگ مفقود ہو،
اس مقصد کے لیے قطعی ناکارہ ہے جس پر اسلام نے اپنی نظر جما رکھی ہے۔

پھر وہ نظامِ تعلیم و تربیت جس کی بنیاد اس مشہور مقولہ پر رکھی گئی ہے کہ "چلو تم
ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" اس اسلام کی خدمت کے لیے کس طرح موزوں ہو سکتا ہے
جس کا قطعی ناقابلِ ترمیم فیصلہ یہ ہے کہ ہوا خواہ کسی طرف کی ہو تم بہرحال اس راستہ
پر چلو جو خدا نے تمہارے لیے معین کر دیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج اگر آپ
کو ایک خطۂ زمین حکومت کرنے کے لیے دے بھی دیا جائے تو آپ اسلامی اصول پر

اس کی اوپری شکل میں خفیف سی تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ
اُس وقت کا حال ہے جب کہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اب میں یہ
سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر قائم ہوگا وہ اس بنیادی اصلاح میں
آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے
جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر
نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی سیرت و کردار کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اُس بے لاگ
عدل و انصاف اور بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی
حکومت چلائی جاتی ہے، تو ان کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے لوگ منتخب ہو کر
پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آ سکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملے گا جو مردم
شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار
سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی
یہ ہیں کہ ہم اُسی مقام پر کھڑے ہیں جس پر غیر مسلم حکومت میں تھے، بلکہ اس سے بھی بدتر
مقام پر، کیونکہ یہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا لیبل لگا ہوگا، انقلاب کا راستہ
روکنے میں اُس سے بھی زیادہ جری اور بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔
غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے، "مسلم قومی حکومت" ان کی
سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی
غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔ پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی
"قومی حکومت" کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہو سکتی ہے۔
اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی
کوشش کرنی پڑے گی، اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی امداد کے بغیر، بلکہ اس کی مزاحمت
کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا، تو ہم آج ہی سے یہ راہ عمل کیوں نہ اختیار
کریں، اور اس نام نہاد مسلم حکومت کے انتظار میں اپنا وقت یا اس کے قیام کی کوشش
میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جس کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے

میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی مل سکتی ہے اور وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نری عقیدت مندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے اسی طرف رجوع کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام پیشواؤں میں سے صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل و نقشہ، داخلی و خارجی پالیسی، اور نظم مملکت تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ لہٰذا میں اسی ماخذ سے اس تحریک کے طریق کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوتے ہیں تو آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز معاشی انتفاع (Economic Exploitation) بھی ہو رہا تھا اور اخلاقی نظام کے بخیے ادھڑے ہوئے تھے۔ خود آپ کے اپنے ملک میں بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے لئے فوری تدبیر کا تقاضا کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، طوائف الملوکی اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ ایران سے ملحق مشرقی اور جنوبی عرب کے تمام ساحلی علاقے، عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلط میں تھے۔ شمال میں حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گروہ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سود خوری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مغربی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اس کے ہم مذہب اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف

ہی کیوں نہ ہو، بلکہ صرف اس چیز کی اطاعت کرو، خدا کے سوا تمام الٰہوں کو چھوڑ دو اور صرف
اسی ایک خدا کی بندگی قبول کرو۔

یہی وجہ ہے کہ اس کی نگاہ میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے،
یا وہ کسی درجہ کے وقتی ہی رہتے۔ آپ اسلام ہی ہے کہ آگے چل کر اس عنوان سے متعلق
کی اطاعت نہیں کی اور ان سب کو ایک ایک کر کے حل کیا۔ مگر ابتدا میں ان سب کی طرف سے
نظر پھیر کر ہی ایک چیز پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر
سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی بنیادی
علت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار (Independent) اور غیر ذمہ دار (Irresponsible)
سمجھنا، بالفاظ دیگر آپ اپنا الٰہ بن بیٹھنا ہے، یا پھر یہ ہے کہ وہ اللہ العالمین کے سوا کسی دوسرے
کو صاحب امر تسلیم کرے، خواہ وہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز جب تک
جڑ میں موجود ہے، سارا نظام بگاڑ سے کبھی اوپری اصلاح، انفرادی بگاڑ یا اجتماعی
خرابیوں کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دور کیا جائے گا
اور کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لے گی۔ لہٰذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف
اسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری کی ہوا کو نکالا
جائے اور اسے بتایا جائے کہ جس دنیا میں رہتا ہے وہ در حقیقت بے بادشاہ کی سلطنت
نہیں ہے، بلکہ فی الواقع اس کا ایک بادشاہ موجود ہے، اور اس کی بادشاہی تیرے تسلیم
کرنے کی محتاج نہیں ہے، تیرے ماننے سے ہٹ نہیں سکتی ہے، نہ تو اس کے حدود سلطنت
سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے، یہیں اپنے سارے وسائل و اختیارات کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم
ایک احمقانہ خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان و وبال تیرے ہی اوپر عائد ہو گا۔
عقل اور حقیقت پسندی (Realism) کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اس کے حکم
کے آگے سر جھکا دے اور مطیع بندہ بن کر رہ۔ دوسری طرف اس کو اطاعت کا یہ پہلو بھی
دکھایا جائے کہ اس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک، ایک
ہی مختار کار ہے۔ کسی دوسرے کو یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ واقع میں کسی کا

حکم چلتا ہے۔ اس لیے تو اس کے سوا کسی کے بندے نہیں۔ کسی کا حکم نہیں۔ کسی کے آگے سر نہ جھکانا۔ یہاں کوئی ہز ہائینس نہیں ہے۔ ہائینس صرف ایک ہی کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہز ایکسیلنسی نہیں ہے۔ ایکسیلنسی کی صفت اسی ایک کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈ شپ نہیں ہے۔ لارڈ شپ بالکلیہ اسی ایک کا منصب ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز (Law Giver) نہیں ہے۔ قانون اسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حق دار و سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی ان داتا، کوئی مالک و مختار، کوئی حاجتیں سننے والا اور فریاد رس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں۔ رب اور حاکم صرف ایک ہے۔ لہٰذا ہر قسم کی غیر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کرکے اور اسی ایک کا ہو کر، جیسے اسے منظور ہو رہنا، یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت از سر نو ایک نئے نقشے پر بنتی ہے اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدم سے لے کر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہوں گے اسی بنیاد پر ایک نئے طریقے سے حل ہوتے ہیں۔

درحقیقت حضرت محمد صلعم نے اسی بنیادی اصول کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہید کا استعمال کیے براہ راست پیش کر دیا۔ انہوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی پیچیدہ راستہ تجویز نہیں کیا کہ پہلے پولیٹیکل یا سوشل ادارہ قائم کرکے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے، پھر اس اثر سے کام لے کر ملکی اختیارات حاصل کیے جائیں، پھر ان اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو جھکاتے ہوئے اس مقام تک لے آئیں۔ یہ سب کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا اور اٹھتے ہی اس نے لا الٰہ الا اللہ کا اعلان کر دیا۔ اس سے کم کسی چیز پر ایک لمحے کے لیے بھی اس کی نظر نہ ٹھہری۔ اس کی وجہ محض پیغمبرانہ جرأت اور جوش نہیں ہے۔ دراصل اسلامی تحریک کا فطری طریق ہی یہی ہے۔ وہ اثر، ذریعہ نفوذ و اقتدار چاہے جو صورت ہو ذرائع سے

پیدا کیا جائے۔ اس اصول سے اسلام میں کچھ بھی مفر نہیں۔ جو لوگ لا الٰہ الا اللہ کے سوا
کسی اور جڑ بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہوں وہ اس بنیاد پر تعمیر جدید کرنے میں
آپ کے کسی کام نہیں آ سکتے۔ اس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو آپ کی طرف
لا الٰہ الا اللہ کی آواز سن کر ہی آئیں، اسی چیز میں ان کے لیے کشش ہو، اسی حقیقت
کو وہ زندگی کی بنیاد مانتے ہوں، اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اٹھیں۔ لہٰذا
اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبر اور حکمتِ عمل کی ضرورت ہے
اس کا تقاضا یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز اسی دعوت توحید سے
کیا جائے۔

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں
اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری، یا غیر اللہ کی حاکمیت و
اربابیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر
نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپ کے مؤذن کو اشھد ان لا الٰہ الا اللہ
کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے
کہ کیا پکار رہا ہوں، نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے،
لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے، اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر
اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرمانروا نہیں ہے، میں کسی حکومت کو
تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود اختیار (Jurisdiction)
تک میں نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے، کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم
نہیں، کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں
مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب کا باغی اور سب سے منحرف ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ
اس صدا کو کبھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے نہ
جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آ جائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو ایسا محسوس
ہو گا کہ گویا یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بچھو

تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو نکالنے اور بیکاروں سے چھانٹ کر الگ نکال پھینکنے کی
اس کے سوا نہ تھی کہ یہ لوگ ایسی بھٹی میں سے گزر کر نکلتے۔

پھر جو لوگ اس کے ان کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے
نہیں، بلکہ محض حق و صداقت کے لیے اور صرف خدا اور اس کی رضا کی خاطر صاحب وقت کا
مقابلہ کرنا پڑتا۔ اس کے لیے وہ پٹے، اس کے لیے بڑے دکھ اس کے لیے دنیا بھر کی
جفاؤں کا تختۂ مشق بنے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں وہ پختہ اسلامی ذہنیت پیدا ہو گئی
جس کی ضرورت تھی۔ ان کے اندر خالص اسلامی سیرت پیدا ہوئی۔ ان کی خدا پرستی
میں خلوص کا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں یکسو ہو کر اسلامی
کامل ہونا ایک لازمی امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اٹھتا ہے اور اس کی
راہ میں کشمکش، جدوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، فاقہ، جلاوطنی وغیرہ
کے مرحلوں سے گزرتا ہے تو بہ تدریج جس قدر یہ بلائیں پڑتی ہیں اس مقصد کی تمام کیفیات اس کے
قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اس کی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
اس مقصد کی تکمیل میں معاونت کے لیے نماز ان پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پراگندگی اور
ایمان کمزور ہو جانے ... اپنے نصب العین پر ان کی نگاہ جمی رہے، جس کو وہ حاکم مانتے
ہیں اس کی حاکمیت کا بار بار اقرار کر کے وہ اپنے عقیدے میں مضبوط ہو جائیں، جس
کے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے اس کا عالم الغیب والشہادۃ
ہونا، اس کا مالک یوم الدین ہونا، اس کا قاہر فوق عبادہ ہونا پوری
طرح ان کے ذہن نشین ہو جائے، اور کسی حال میں بھی اس کی اطاعت کے سوا دوسرے
کی اطاعت کا خیال تک ان کے دل میں نہ آنے پائے۔

ایک طرف دشمنان حق کی مخالفت اس طرح بڑھ رہی تھی اور دوسری طرف اسی کشمکش
کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پیچھے پڑے
ہیں تو خواہ مخواہ ان کے اندر معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس
لیے؟ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی

ان کی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اس لیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی
صداقت ان پر منکشف ہوئی ہے۔ قرآن کے دور میں تجسس سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا
کہ اس چیز کو معلوم کریں۔ آخر یہ کیا چیز ہے جس کے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت
کر رہے ہیں۔ پھر جب انھیں معلوم ہوتا کہ وہ چیز ہے قالوا اللہ، اور اس سے انسانی زندگی
میں اس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے۔ اور اس دعوت کو لے کر ایسے لوگ اٹھے ہیں جو
محض صداقت و حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں، اور جان، مال،
اولاد ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں۔ تو ان کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ مکہ کے بڑے بڑے متعصب بڑے
بڑے پکے جاہلی بے باک ہوتے گئے تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ تحریک ابھری تھی اور اس نے
پروا کر رکھی تھی یہ جو ہر طرح کی کہ بجز ان لوگوں کے جن کو ذوق وجاہت کے بجز یا جاہ پرستی کی
جہالت یا اغراض دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا، باقی سب لوگ اس تحریک کی طرف
کھنچتے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشش کی مزاحمت کرتا رہا، مگر یہ
ناممکن تھا کہ جو صاحب عقل و بصیرت ہے اس کو اس طرف کھنچنا ہی پڑا۔

اس سلسلے میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے مقاصد کی
اور ہر اس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا۔ ان کی ہر بات، ہر عمل
اور ہر حرکت سے اسلام کی روح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔
یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جس کی تشریح کا یہاں موقع نہیں۔ مگر مختصر چند نمایاں
باتوں کا میں یہاں ذکر کروں گا۔

آپ کی بیوی حضرت خدیجہؓ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار خاتون تھیں۔ اور وہ ان کے
مال سے تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرتؐ کا سارا
تجارتی کاروبار بیٹھ گیا کیونکہ ہر وقت اپنی دعوت میں مصروف رہنے اور تمام عرب کو اپنا دشمن
بنا لینے کے بعد یہ کام نہیں چل سکتا تھا۔ جو کچھ سرمایہ موجود تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے
اس تحریک کے پھیلانے پر چند سال میں کھا دیا۔ آخرکار نوبت یہاں تک آئی کہ جب
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کل

چاہتا تھا۔ جہاں تک اس کو حاصل ہونا تھا یہ ایک لمحہ کو بھی میسر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جو بات پیش کی یہ کہا کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنا لیں گے، عرب کی حسین ترین عورت آپ کے نکاح میں دے دیں گے، دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں ڈال دیں گے بشرطیکہ آپ اس تحریک سے دست بردار ہو جائیں۔ مگر یہ شخص جو انسانوں کی خیر کے لیے اٹھا تھا۔ اس نے ان سب چیزوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا۔

قریش اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ ہم تمہارے پاس کیسے آ کر بیٹھیں اور تمہاری باتیں کیسے سنیں جب کہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، حبشی، رومی، فارسی، کمین لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے زیادہ نیچے طبقے کے لوگ ہیں ان کو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے، انہیں ہٹا دو تو ہم آ سکتے ہیں۔ مگر یہ شخص جو انسانوں کی برابری کا اعلان کرنے آیا تھا اس نے غریبوں کی خاطر امیروں کو اپنی مجلس سے نکال دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ اپنا کام اپنے قبیلہ، اپنے خاندان کسی کے متعلق کچھ امتیاز نہیں کیا، یہی چیز نے واضح نتیجہ دیا کہ آپ انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اٹھے ہیں، اور اسی چیز نے آپ کی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی خاطر اٹھتے تو غیر ہاشمیوں کو اس تحریک سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ بنی ہاشم کے لیے بھی یہ چاہتے کہ قریش کے اقتدار کو کسی طرح بحال کریں تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لیے اٹھتے تو حبش کے بلال، روم کے صہیب اور فارس کے سلمان کو کیا غرض تھی کہ اس کام میں آپ کا ساتھ دیتے۔ جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص انسانیت تھی، ہر ذاتی، خاندانی، قومی، نسلی غرض سے بالکل بے لاگ تھی۔

مکہ سے جب آپ کو ہجرت کرنی پڑی اور تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپ کے پاس رکھوائی تھیں حضرت علی کے سپرد کر کے گئے کہ یہ سب ہر ایک کی امانت اس کو پہنچا دینا۔ دنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے لے کر چلتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی جان

بجائے خود کافی ہے بلکہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسیح علیہ السلام کے چند اقوال ایک خاص ترتیب کے ساتھ نقل کر دیئے جائیں جن سے ان کی تحریک کے ارتقائی مراحل پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ فقرے موجودہ زمانے کے حالات کی مناسبت سے بہت عجیب لگتے ہیں جن میں سیدنا مسیح علیہ السلام نے اہل فلسطین کو حکومتِ الٰہیہ کی دعوت دی تھی اس لیے ان کے طریقِ عمل میں ہم کو ان سے ہدایات مل سکتی ہیں۔

• فقیہوں میں سے ایک نے —— اس سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کونسا ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ اوّل یہ ہے۔ اے اسرائیل سن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے[1] اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ —— فقیہ نے اس سے کہا اے استاد، کیا خوب! تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں۔

(مرقس ۱۲: ۲۸-۳۲)

• تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔

(لوقا ۴: ۸)

• پس تم اس طرح دعا مانگا کرو، اے ہمارے باپ[2] تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔ (متی ۶: ۹-۱۰)

آخری آیت میں حضرت مسیح نے اپنے نصب العین کو واضح کر دیا ہے۔ یہ جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ خدا کی بادشاہت سے ان کی مراد محض روحانی بادشاہت تھی،

۱؎ خداوند، الٰہ، دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ (قدیم)

۲؎ یہودی اصطلاح میں باپ کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوتا تھا۔ اس سے خالق اور مربی کو باپ کہا جاتا تھا اور اس کے معنی میں بیٹے کا لفظ اس کی مخلوق ہے۔ (قدیم)

سامنے حاضر کیے جاؤ گے۔" (۱۰ : ۱۹ ، ۱۵)

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں
اور بھائیوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی
اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔
کیونکہ تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ ایک برج بنانا چاہے تو پہلے بیٹھ کر لاگت
کا حساب نہ کر لے کہ آیا میرے پاس اس کے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں۔
ایسا نہ ہو کہ جب نیو ڈال کر تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر اس پر
ہنسنا شروع کریں کہ اس شخص نے عمارت شروع تو کی مگر تیار نہ کر سکا ———
پس تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کر دے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔"

(لوقا ۱۴ : ۲۶-۳۳)

یہ تمام آیات صاف صاف وضاحت کرتی ہیں کہ مسیح علیہ السلام محض یکسوئی کا پرچار کرنے نہیں
آئے تھے بلکہ پورے نظام تمدن و سیاست کو بدل دینا ان کے پیش نظر تھا جس میں رومی
سلطنت، یہودی ریاست، فقیہوں اور فریسیوں کے اقتدار اور سب الغرض تمام بندگانِ نفس و
ہوائے نفس سے جنگ کا خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ لوگوں کو پہلے ہی بتا دیتے تھے کہ جو کام
میں کرنے جا رہا ہوں وہ نہایت خطرناک ہے اور میرے ساتھ اسی کو آنا چاہیے جو ان تمام خطرات
کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

"شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا
بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ
بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے
ساتھ دو کوس چلا جا۔" (متی ۵ : ۳۹ - ۴۱)

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے ان سے نہ ڈرو

۔ رومی سلطنت میں ہر فوجی کو بیگار لینے کا حق تھا اور وہ جسے چاہتا بیگار میں پکڑ لیتا تھا۔ (مترجم)

"فقیہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن اُن کے سے کام نہ کرو۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے، باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انہیں اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں۔ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربی[1] کہلانا پسند کرتے ہیں۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دوگنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔"

"اے اندھے راہ بتانے والو! تم مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔" (متی ۲۳: ۲-۲۸)

---

[1] ربی سے مراد عالمانِ شریعت ہیں۔ (مترجم)

جو اس وقت کے علماء اور حاملانِ شریعت کا مسلک تھا۔ وہ علم رکھنے کے باوجود محض بندگیٔ نفس کی وجہ سے آپ ہی گمراہ تھے اور عام لوگوں کو بھی گمراہ کر رہے تھے اور اس انقلاب کے راستے میں روڑی پتھر سے بڑھ کر وہی حائل تھے۔

• اس وقت فریسیوں نے جا کر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں۔
پس انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں کے ساتھ اس کے پاس بھیجا اور انہوں نے (یعنی شاگردوں نے) کہا کہ اے استاد ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پروا نہیں کرتا ——
ہمیں بتا تو کیا سمجھتا ہے قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے ان کی شرارت جان کر کہا اے ریاکارو مجھے کیوں آزماتے ہو؟ جزیہ کا سکہ مجھے دکھاؤ۔ وہ ایک دینار اس کے پاس لے آئے۔ اس نے ان سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انہوں نے کہا قیصر کا۔ اس پر اس نے کہا جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو۔

(متی ۲۲ : ۱۵–۲۰)

اس قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل سوال یہ ایک چال تھی۔ فریسی اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے چاہتے تھے کہ حضرت مسیح کو کسی نہ کسی طرح وقت کی حکومت سے تصادم کرا دیا جائے اور تحریک کے جڑ پکڑنے سے پہلے حکومت کے ذریعے اسے کچلوا دیا جائے۔ اسی لیے ہیرودی ریاست کی سی آئی ڈی کے سامنے یہ سوال اٹھایا گیا کہ قیصر کو ٹیکس دیا جائے یا نہیں۔ جواب میں حضرت مسیح علیہ السلام نے جو دو حرف کہے ان کی اصل روح اور ان کے بعد کی اور ظاہری سب اس معنی میں لے رہے ہیں کہ جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو اور اطاعت بر اس

۱؎ مسیح علیہ السلام کے زمانے میں فلسطین کے ایک حصے میں جس کو یہودیہ کہتے تھے رومی حکومت کا براہِ راست ایک حصہ ریاست تھی جس کے مالک ہیرود کہلاتے تھے اور ان کی ریاست ہیرودی ریاست کہلاتی تھی۔
ہیرودیوں سے مراد اس ریاست کی پولیس یا سی آئی ڈی کے لوگ ہیں۔ (مترجم)

حکومت سے الگ رہنے کو جو تمہارے سامنے موجود ہو۔ لیکن حضرت مسیح علیہ السلام نے نہ تو یہ فرمایا کہ قیصر کو ٹیکس دیتے رہو۔ کیونکہ ایسا کہنا اُن کی دعوت کے خلاف تھا۔ اور نہ یہ فرمایا کہ اسے ٹیکس نہ دیا جائے۔ کیونکہ ابھی وقت تک مسیح کی تحریک اس مرحلے تک نہیں پہنچی تھی کہ ٹیکس روکنے کا حکم دیا جاتا۔ اس لیے انہوں نے یہ لطیف بات کہہ دی کہ قیصر کا مال اس کی صورت تو قیصر ہی کو واپس کر دو۔ اور جس کو خدا نے پیدا کیا ہے وہ خدا کی راہ میں صرف کر دو۔

اس سازش میں ناکام ہونے کے بعد فریسیوں نے خود مسیح علیہ السلام کے حواریوں میں سے ایک کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ کسی ایسے موقع پر مسیح کو گرفتار کرائے جب کہ عام لوگوں کا خطرہ نہ ہو۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور یہودہ اسکریوتی نے مسیح کو پکڑوا دیا۔

> "پھر ان کی ساری جماعت اُٹھ کر اسے پیلاطس (رومی حاکم) کے پاس لے گئی اور انہوں نے الزام لگانا شروع کیا کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکانے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا ——— پیلاطس نے سردار کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا کہ میں اس شخص میں کوئی قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر اُبھارتا ہے ——— وہ چلا چلا کر سر ہو گئے کہ اسے صلیب دی جائے اور ان کا چلانا کارگر ہوا۔"

(لوقا ۲۳: ۱-۲۳)

اس طرح دنیا میں حضرت مسیح علیہ السلام کا مشن اُن لوگوں کی بدولت ختم ہو گیا جو اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وارث کہتے تھے۔ تاریخی شواہد کی رُو سے حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت کا کل زمانہ ڈیڑھ سال اور تین سال کے درمیان رہا ہے۔ اس مختصر مدت میں اُنہوں نے اتنا ہی کام کیا جتنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی

کے ابتدائی دو تین سال میں کیا تھا۔ اگر کوئی شخص انجیل کی مذکورہ بالا آیات کا مقابلہ قرآن مجید کی کل مکی سورتوں اور زمانۂ قیام مکہ کی احادیث سے کرے گا تو دونوں میں بڑی مماثلت پائے گا۔

ایک صالح جماعت کی ضرورت

دنیا میں اس وقت بڑے زور کے ساتھ توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے[1]۔ ہم نہیں جانتے کہ أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَنْ فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا۔ یعنی اہل زمین کو ان کے کرتوتوں کی سزا ہی دینے کا ارادہ کیا گیا ہے یا اس توڑ پھوڑ کے بعد کوئی صالح چیز بھی بننے والی ہے۔ مگر ظاہر آثار سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ نوع انسانی کی امامت اب تک جس تہذیب کے علمبرداروں کو حاصل رہی ہے، اس کی عمر پوری ہو چکی ہے، ان کے امتحان کا زمانہ ختم ہو گیا ہے، اور سنت اللہ کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ ان کو اور ان کی اس جاہلی تہذیب کو دنیا کے انتظام سے بے دخل کر دیا جائے۔ اُن کو جو مہلت عمل کرنے کا حق دیا گیا تھا وہ ختم ہو چکا۔ وہ اپنے تمام امکانات اور اپنی تمام خفی و جلی قابلیتوں کا پورا پورا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ ان کے اندر شاید اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی ہے جو ظاہر نہ ہو چکی ہو۔ لہٰذا غالب گمان یہی ہے کہ عنقریب وہ میدان سے ہٹائے جانے والے ہیں، اور یہ زبردست کشمکش درحقیقت اسی لیے برپا ہوئی ہے کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے خاتمہ کی رسم خود ہی ادا کر دیں۔ اس کے بعد یہ بالکل ممکن ہے کہ دنیا میں پھر ایک

---

[1] یہ اشارہ ہے دوسری جنگ عظیم کی طرف جو اس وقت پوری شدت کے ساتھ جاری رہی تھی۔ (مرتب)

فلسفے کا نقطۂ عروج ہے جس طرح آخری اسلامی تحریک کے زوال اور موجودہ جاہلی تہذیب
کی پیدائش کے درمیان گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسی ٹوٹ پھوٹ کے دوران
ہی کسی نئی تعمیر کی صورت نکل آئے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت، قومی جماعیت (نیشنل سوشلزم) اور اشتراکیت (کمیونزم)
کی جو طاقتیں اس وقت آپس میں متصادم ہیں یہ دراصل الگ الگ تہذیبیں نہیں ہیں کہ ان
کے درمیان انتخاب، اور ان میں سے کسی کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہو۔ حقیقت میں یہ
ایک ہی تہذیب کی تین شاخیں ہیں۔ ایک ہی تصورِ کائنات، ایک ہی تصورِ انسان، ایک
ہی نظریۂ حیات اور ایک ہی اساسی اخلاق ہے جس پر ان تینوں کی تعمیر ہوئی ہے۔ انسان
کو حیوان سمجھنا، دنیا کو بے خدا فرض کرنا، علوم طبیعی سے انسانی زندگی کا قانون اخذ کرنا، اور
اخلاق کی بنیاد تجربہ، مصلحت اور خواہشات پر رکھنا، یہ ان سب کی مشترک بنیاد ہے۔
ان کے درمیان فرق صرف اس حیثیت سے ہے کہ اسی جاہلی تہذیب نے سب سے پہلے
فرد کی آزادی اور قوموں کی خود مختاری کا نعرہ بلند کیا تھا جس سے قومی ریاستوں کے ساتھ
سرمایہ دارانہ جمہوریت پیدا ہوئی اور مدت ہائے دراز تک انسانیت کو تباہ و برباد کرتی
رہی۔ پھر جب اس کے ظلم و ستم انسانی صبر کی حد تک پہنچ گئے تو اسی تہذیب نے
اشتراکی انقلاب کو بطور علاج پیش کیا۔ مگر بہت جلدی ظاہر ہو گیا کہ یہ علاج اصل مرض سے
بھی بدتر تباہ کن ہے۔ آخر کار اسی تہذیب نے پھر ایک دوسری تجویز سامنے رکھی جس کا نام
فاشزم یا نیشنل سوشلزم ہے اور چند سال کے تجربے نے ثابت کر دیا کہ یہ ام الخبائث
کی آخری پیداوار فتنہ انگیزی و شرباری میں پچھلے دونوں رشتہ داروں سے بھی بازی لے
گیا ہے۔

اب دنیا کے لیے اس تہذیب کو اور زیادہ آزمانے کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے۔ جو
آدمی کو جانور سمجھ کر اور اس جانور کو بے لگام فرض کر کے اپنا کام شروع کرتی ہے اور اس
کے اندر جوع البقر سے لے کر بدترین قسم کی درندگی تک ہر وہ بیماری پیدا کر دیتی ہے
جو آدمیت کے حق میں نہایت مہلک ہے۔ درحقیقت یہ پوری تہذیب اپنی تمام

کی شکل میں دیکھے جا رہے ہیں۔ یہ تخلیقی قابلیتوں کے ثمرات جنہوں نے آج فاسد مگر
زوروں کی صورت اختیار کی ہے۔ یہ صنعتی ترقی کے پھل جو آج کھلے جنگ کی بھیانک
شکل میں نمودار ہو رہے ہیں۔ یہ وسائل نشر و اشاعت کمال جن سے نئی دنیا میں جھوٹ
پھیلانے اور قوموں میں منافرت کے بیج بونے کا کام لیا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ انسان کو اول آزاد چھوڑ
دینے اور اس کو اپنے آپ سے اور اپنی مادی قابلیتوں اور صلاحیتوں سے بہرہ ور کر دینے
کے بے حاصل کام ہیں۔ اور اس کا منطقی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ نوع انسانی دل شکستہ اور مایوس
ہو کر صدیوں کے لیے پھر اسی بے ہوشی کی حالت میں مستغرق ہو جائے۔

جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں انسانیت کو اس دردناک انجام سے اگر کوئی چیز بچا
سکتی ہے تو وہ صرف یہی صحیح نظام اور ایک صالح جماعت کا برسرکار آنا ہے۔

مگر وہ کونسا نظام ہو سکتا ہے جس کے لیے آج کامیابی کا کوئی امکان متوقع ہو!

مشرکانہ جاہلیت جس پر دنیا کی بیشتر قدیم تہذیبیں قائم ہوئی تھیں اب اس
کے احیاء کا کوئی امکان نہیں۔ شرک کی جڑیں کٹ چکی ہیں۔ جاہل عوام پر چاہے اس کا
تسلط باقی ہو، مگر علم و عقل رکھنے والے لوگ اب اس وہم میں مبتلا نہیں ہو سکتے کہ کائنات
کے نظام کو بہت سے خدا چلا رہے ہیں اور انسانی فوز و سعادت کا سر رشتہ دیوتاؤں
یا دیویوں سے وابستہ ہے۔ علاوہ بریں یہ حقیقت ہے کہ مشرکانہ نظریہ سے انسانی زندگی
کے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ پیچیدگیاں کچھ اور بڑھ جاتی ہیں۔ سب سے بڑی
مشکل جس نے اس وقت دنیا کو پریشان کر رکھا ہے نوع انسانی میں وحدت کا فقدان
ہے۔ مگر شرک اس مشکل کو حل نہیں کرتا۔ بلکہ وحدت پیدا کرنے کے بجائے مزید تفریق و تقسیم
کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا کسی مشرکانہ فلسفہ کے لیے نئی دنیا میں برسر اقتدار آنے
کا کوئی امکان نہیں ہے۔

راہبانہ جاہلیت دنیا میں کبھی کوئی طاقت ور تحریک نہیں بن سکی ہے۔ ترک دنیا، تشنج اور
تصوف اور بدھ مت کے نظریات، جو جسم کو مردہ اور جسمانیت کو پست اور قوت فکر کو
ایمان کی کشمکش اور جنگ میں سست کر دینے والے ہیں، اپنے اندر اتنی جان ہی نہیں رکھتے کہ ان

کے بل پر کوئی ایسی تہذیب پیدا ہو سکے جو زمین کا انتظام چلانا قوموں کو سکھا سکتی ہو اور دنیا کی امامت و پیشوائی کے منصب جلیل پر فائز ہو سکتی ہو۔ کوئی سادہ لوح ہی اس تہذیب میں مدد ڈھونڈنے کی جتنی چاہے کوشش کر دیکھے۔ یہ نظریات کبھی کسی جینیا کے مقام سے آگے بڑھ کر ایک صالح تمدن کی تخلیق اور ایک عادل سلطنت کی تاسیس، اور ایک مہذب تہذیب کی تعمیر تک نہیں پہنچ سکتے۔ لہٰذا وہ سدھی بدوی قومیں تو ان نظریات سے چپک کر پڑی رہ سکتی ہیں مگر کسی سدھی اور ابھرنے والی قوم کے تخیل کو کبھی اپنی طرف نہیں کھینچ سکیں گے۔

رہی جاہلیت خالصہ تو اس احساس کی پیداوار کا اب دنیا کو آغاز کار کا تجربہ ہو چکا ہے کہ حقیقت جو ہے وہ اس سے ماورا کچھ نہیں ہے۔ انسان کا اپنے آپ کو جانور فرض کرنا، جانوروں کی زندگی سے تنازع للبقا، اور انتخاب طبعی اور بقائے اصلح کا قانون نہ پہلے اخذ کرنا، مادی فوائد اور لذتوں کو مقصود حیات ٹھیرانا، تجربات اور مصلحتوں کو اخلاق کا معیار قرار دینا، اور کسی فوق الانسانی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم نہ کرنا، جو کچھ نتائج پیدا کر سکتا تھا وہ سب اپنی تمام تلخیوں کے ساتھ سامنے آ چکے ہیں۔ ان نظریات کی بدولت انسان کو جو کچھ ملا ہے وہ قومی و نسلی تعصبات ہیں، رنگ و نسل کی برتری کے دعوے ہیں، قومی ریاستوں کی ہوسناکی و سیاسی رقابتیں ہیں، امپیریلزم اور استعمار اور معاشی لوٹ کھسوٹ ہیں، افراد سے لے کر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں تک کا اپنے معاملات میں ہر اخلاقی قید سے آزاد ہو جانا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کا وحشی جانوروں کا کام کرنا اور دوسرے انسانوں کے ساتھ جانوروں کا سا بلکہ بے روح مشینوں کا سا سلوک کرنا ہے۔ یہ نظریات اگر جمہوریت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو ظلم اور کسب حرام اور فحش اور بے حیائی کی آزادی ملتی ہے اور اگر اشتراکیت یا اجتماعیت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو بھیڑ بکریوں کے گلے کی طرح ایک ڈکٹیٹر یا ایک چھوٹی سی پارٹی کے حوالے کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ انہیں جس طرح چاہے ہانکے، دوہے اور جو چاہے بنا لے۔ یہ پھل جو ان نظریات سے پیدا ہوئے ہیں، کسی اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ اس شجر خبیث کی عین فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اس

کہ اب انسانیت کا مستقبل اسلام پر منحصر ہے۔ انسان کے اپنے بنائے ہوئے تمام نظریات ناکام ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کسی کے لیے کامیابی کا اب کوئی موقع نہیں۔ امکان میں اب اتنی وسعت بھی نہیں ہے کہ پھر کسی فلسفہ کی تصنیف اور اس کی آزمائش پر اپنی قسمت کی بازی لگا سکے۔ اس حالت میں صرف اسلام ایک ایسا نظریہ رکھتا ہے جس سے صحیح طرح کی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں، جس کے ذریعے انسان کامیاب ہو جانے کا امکان ہے، اور جس کی پیروی اختیار کر کے انسان کی تباہی ٹل سکتی ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیا بس مفتوح ہونے کے لیے تیار بیٹھی ہے، اسلام کی فوجوں کے ایک دھماکے اور اس پر ایمان لانے کے لیے ایک دعوت عام شائع ہونے کی دیر ہے، پھر ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ سب سرنگوں ہوتے چلے جائیں گے۔ ایک تہذیب کا استیصال اس طرح اچانک نہیں ہوا کرتا کہ کل تھی اور آج نابود ہو گئی۔ اسی طرح دوسری تہذیب کا قیام بھی اس طرح وقتی نہیں ہوتا کہ ایک شب میں پیدا ہو جائے اور کل کسی منتر کے زور سے ایک عظیم الشان قصر بن کر کھڑا ہو۔ مٹنے والی تہذیب کے افکار، اصول، طریقے، نقشے اور نظام دلوں اور دماغوں پر، علوم و آداب پر، اخلاق و معاشرت پر اپنا اثر چھوڑ جاتے رہتے ہیں۔ اس اثر کا استیصال خود بخود نہیں ہو جاتا، کرنے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح مٹنے والی تہذیب کے علمبردار بھی زوال پذیر ہونے کے باوجود سالہا سال تک زمین پر قبضہ جمائے رہتے ہیں۔ وہ خود جگہ چھوڑ کر نہیں ہٹ جاتے، ہٹانے سے ہٹتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس نئی تہذیب پر نئی عمارت بنانا بھی کوئی کھیل نہیں ہے کہ آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور وہ خود بن جائے۔ اس کام کے لیے ایک زبردست تمدنی، سیاسی اور فکری تحریک کی ضرورت ہے جو ایک طرف علم و فکر کی طاقت سے پرانی تہذیب کی جڑیں اکھاڑ دے اور دوسری طرف علوم و فنون و آداب کو اپنے مخصوص نظری مبادی پر از سر نو مدون کرے، حتیٰ کہ ذہنی دنیا پر اس طرح چھا جائے کہ لوگ اسی کے طرز پر سوچا اور محسوس کیا کریں۔ ایک طرف ان پرانے سانچوں کو توڑ دے جن میں انسانیت ڈھلا کرتی تھی... دوسری طرف نئے سانچے تیار کرے جن میں نئے اخلاق اور نئی سیرتوں کے آدمی ڈھلنے لگیں۔ ایک طرف پرانے نظام تمدن و

سیاست کو بند کر دے اور دوسری طرف ایک پورا نظام تمدن و سیاست اپنے اصولوں
پر عملاً قائم کر دے۔

پس دنیا کو اگر تمدن کے خطرات سے بچانے اور اسلام کی رحمت سے بہرہ ور
کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں یہ نظریہ پیش کر دیا جائے۔ اس نظریہ کے
ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس
نظریہ پر سچا ایمان رکھتے ہوں۔ ان کو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہوگا اور وہ
صرف اسی طرح دیا جا سکتا ہے کہ جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اس کے خود مطیع بنیں جس
ضابطہ پر ایمان لاتے ہیں اس کے خود پابند ہوں جن اخلاق کو نیک کہتے ہیں اُن کا خود نمونہ
بنیں، جس چیز کو فرض کہتے ہیں اس کا خود التزام کریں، اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اُسے
خود چھوڑیں۔ اس کے بغیر تو اُن کی صداقت آپ ہی مشتبہ ہوگی کجا کہ کوئی ان کے آگے
سر تسلیم خم کرے۔ پھر ان کو اس فاسد نظام تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً
بغاوت کرنی ہوگی۔ اُس سے اور اس کے پیرووں سے تعلق توڑنا ہوگا۔ اُن تمام فائدوں،
لذتوں، آسائشوں اور اُمیدوں کو چھوڑنا ہوگا جو اس نظام سے وابستہ ہوں، اور رفتہ
رفتہ اُن تمام نقصانات، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا جو نظام غالب کے
خلاف بغاوت کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر انہیں وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو ایک فاسد
نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس انقلاب
کی جدوجہد میں مال بھی قربان کرنا ہوگا، اپنے اقارب عزیز بھی ترک کرنے پڑیں گے،
اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑے گا، اور قید اور جلاوطنی اور
ضبطی اموال اور تباہی اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے، اور وقت پڑے تو
جانیں بھی دینی پڑیں گی۔ ان راہوں سے گزرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب ہوا ہے
نہ اب ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ نظریہ کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت
جب تک نہ ہو، محض نظریہ، خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ ہو، کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو
کر ذہنوں میں کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ نظریہ کی کامیابی کے لیے خود اس کے اصولوں کی

چھوڑ دیئے جائیں گے اور انہیں آزمائش کی بھٹی میں تپایا نہ جائے گا جب کہ ان سے
پہلے جو گزرے ہیں ان میں جنہوں نے بھی ایمان کا دعویٰ کیا ہے ان سب کو
ہم نے آزمایا ہے، یہ ضروری ہے کہ اللہ دیکھے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۔ (بقرہ : ۲۱۴)

• کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ کیفیت تو گزری ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکی ہے؟ ان پر سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے حتیٰ کہ رسول اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً ۔ (توبہ : ۱۶)

• کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ ہیں جنہوں نے سعی و جہد کا حق ادا کیا اور اللہ اور رسول اور اہلِ ایمان کے سوا کسی سے قلبی تعلق نہ رکھا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ ۚ وَلَئِنْ جَاءَ نَصْرٌ مِنْ رَبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۚ أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ ۔ وَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنَافِقِينَ

(عنکبوت : ۱۰-۱۱)

• لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے مگر جب

مقابلہ کیوں نہیں کیا یا دشمنوں کی ایذا سے ایسے ڈرے جیسے اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔ اور اگر تیرے رب کی طرف سے فتح نصیب ہو جائے تو یہی لوگ کہیں گے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے۔ کیا اللہ اہلِ دنیا کے دلوں سے خوب واقف نہیں ہے، مگر ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ مومن کون ہیں اور منافق کون۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ۔ (البقرہ - ۱۵۵ - ۱۵۷)

"ہم ضرور تم کو خطرات، فاقوں سے اور جان و مال کے نقصانات سے آزمائیں گے، اور کامیابی کی بشارت دو ان صبر کرنے والے لوگوں کو جنہیں جب مصیبت آ پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ ایسے لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایتیں ہیں اور رحمت ہے، اور یہی لوگ راہِ راست پانے والے ہیں۔"

قرآن سب کچھ بتانے کے ساتھ اس حقیقت پر متنبہ کر دیتا ہے کہ

وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلَٰكِنْ لِيَبْلُوَ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ۔ (محمد - ۴)

"اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا، مگر وہ تم ہی سے کچھ لوگوں کو کچھ لوگوں کے ذریعے آزماتا ہے۔"

یعنی یہ سمجھنا کہ اللہ اپنے باغیوں کی سرکوبی خود نہیں کر سکتا اس لیے آپ سے مدد مانگتا ہے نہیں، وہ اتنی زبردست طاقت رکھتا ہے کہ چاہے تو ایک اشارے میں ان کو تباہ کر کے رکھ دے اور اپنے دین کو قائم کر دے مگر اس نے یہ جہاد اور محنت و قربانی کا بار تم پر اس لیے

ناگاہ ہے کہ وہ تم انسانوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں آزمانا چاہتا ہے۔ جب تک باطل
پرستوں سے تمہارا تصادم نہ ہو، اور اس تصادم میں مصائب و شدائد اور خطرات و مہالک
پیش نہ آئیں، سچے اہلِ ایمان جھوٹے مدعیوں سے ممیّز نہیں ہو سکتے، اور جب تک انسانوں
میں سے کھوٹا اور کھرا چھٹ کر الگ نہ ہو جائیں وہ جتھا نہیں بن سکتا جو خلافتِ الٰہیہ کی ذمہ داری
سنبھالنے کا اہل ہو۔

لہٰذا آج دنیا کا مستقبل درحقیقت اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ کوئی نظریۂ حق انسان کو ملتا
ہے یا نہیں، بلکہ نظریۂ حق تو موجود ہے، الحمدللہ۔ اگر منحصر ہے تو اس امر پر ہے کہ انسانوں
میں سے کوئی ایسا گروہ نکلتا ہے یا نہیں جو سچا ایمان دار، دُھن کا پکا اور اپنی ہر عزیز و
محبوب چیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ بھلا اب کہاں مل سکتے ہیں؟ وہ تو بس ایک مبارک
دور میں پیدا ہوئے تھے اور پھر خالق نے اس سانچے کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔ لیکن یہ محض
ایک وہم ہے اور یہ وہم انہی لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جنہیں خود اپنے آپ سے
دوری ہے۔ دنیا میں ہر قابلیت اور صلاحیت کے آدمی ہر زمانہ میں پائے گئے ہیں اور پائے
جاتے ہیں۔ جہاں شاعرانہ خصوصیت رکھنے والے اور ضعیف الارادہ لوگ اور سہولت پسند
اشخاص ہمیشہ پائے گئے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں، وہاں ایسے لوگ بھی ہر زمانہ میں
موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جو کسی چیز پر ایمان لانے کے بعد اس کو سربلند کرنے کے
لیے سر دھڑ کی بازی لگا سکتے ہیں۔ آج آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک دو
نہیں ہزاروں انسان ایسے ہیں جو ہٹلر اور جرمنی پر ایمان لائے ہیں اور اپنے اس ایمان
کی خاطر ہوائی جہازوں سے عین دشمن کے ملک میں جست لگاتے ہیں جہاں ان کو معلوم ہے
کہ بے شمار شکاری ان کی گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ روس کا انقلاب جو ابھی ہم میں پچیس
سال پہلے ہی کی بات ہے، اس کی تاریخ آپ دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ ہزارہا آدمی جو اشتراکی
نظریات پر ایمان رکھتے تھے، مسلسل نصف صدی تک ہر قسم کی قربانیاں دیتے رہے،
سائبیریا کے جہنم میں بھیجے گئے، پھانسی پر چڑھائے گئے، جلاوطنی کی مصیبت میں برسوں تک

اضافے

جواب: پاکستان کے متعلق آپ میرے مفصل بیانات "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم میں ملاحظہ فرمائیے۔ میرے نزدیک پاکستان کے مطالبہ پر یہودیوں کے قومی وطن کی تشبیہ چسپاں نہیں ہوتی۔ فلسطین فی الواقع یہودیوں کا قومی وطن نہیں ہے۔ اُن کو وہاں سے نکلے ہوئے دو ہزار برس گزر چکے ہیں۔ اُسے اگر ان کا قومی وطن کہا جاسکتا ہے تو اُسی معنی میں جس معنی میں یورپ کی آریہ نسل کے لوگ وسط ایشیا کو اپنا قومی وطن کہہ سکتے ہیں۔ یہودیوں کی اصل پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ایک ملک سابق ان کا قومی وطن ہے اور وہ اسے تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ بلکہ ان کی اصل پوزیشن یہ ہے کہ ایک ملک جو اُن کا قومی وطن نہیں ہے اور اُن کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم کو دنیا کے مختلف گوشوں سے سمیٹ کر وہاں بسایا جائے اور اُسے بزور ہمارا قومی وطن بنا دیا جائے۔ برخلاف اس کے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ جس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے وہ بالفعل مسلمانوں کا قومی وطن ہے۔ اور مسلمانوں کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ موجودہ جمہوری نظام میں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے ساتھ لگے رہنے سے ان کے قومی وطن کی سیاسی حیثیت کو جو نقصان پہنچتا ہے اُس سے اس کو محفوظ کیا جائے اور متحدہ ہندوستان کی ایک آزاد حکومت کے بجائے ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوں۔ یعنی بالفاظ دیگر وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کا قومی وطن جو بالفعل ہے اس کو اپنی آزاد حکومت الگ قائم کرنے کا حق حاصل ہو جائے۔

یہ چیز بجنسہ وہی ہے جو آج دنیا کی ہر قوم چاہتی ہے اور اگر مسلمانوں کے "مسلمان" ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے انہیں محض ایک قوم کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان کے اس مطالبہ کے حق بجانب ہونے میں کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اصولاً اس بات کے مخالف ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم پر سیاسی و معاشی حیثیت سے مسلط ہو۔ ہمارے نزدیک ہر قوم کا حق ہے کہ اس کی سیاسی و معاشی باگیں اس کے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ اس لیے ایک قوم ہونے کی حیثیت سے اگر مسلمان یہ مطالبہ کرتے ہیں تو جس طرح دوسری قوموں کے معاملہ میں یہ مطالبہ صحیح ہے اسی طرح ان کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ لیکن ہمیں اس چیز کو نصب العین بنانے پر جو اعتراض ہے وہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک اصولی جماعت اور ایک نظام کی داعی

اور علم بردار جماعت ہونے کی اصل حیثیت کو نظر انداز کر کے محض ایک "قوم" ہونے کی حیثیت اختیار
کرلی ہے۔ اگر وہ اپنی اصل حیثیت کو قائم رکھتے تو ان کے لیے قومی وطن اور اس کی آزادی کا سوال
ایک نہایت حقیر سوال ہوتا، بلکہ حقیقتاً سرے سے وہ ان کے لیے پیدا ہی نہ ہوتا۔ اب وہ کروڑوں
ہو کر ایک ذرا سے خطے میں بھی حکومت حاصل کر لینے کو ایک انتہائی نصب العین بنا رہے ہیں؛
لیکن اگر وہ نظامِ اسلامی کے داعی ہونے کی حیثیت اختیار کریں تو تنہا ایک مسلمان ساری دنیا
پر اپنی دینی، درحقیقت اُس نظام کی جس کا وہ داعی ہے، حکومت کا داعی ہو سکتا ہے اور
صحیح طور پر سعی کرے تو اسے حاصل بھی کر سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۲ء)

مسلم لیگ سے اختلاف کی نوعیت

مسلم لیگ کی مجلس عمل کی جانب سے حسب ذیل سوالنامہ جاری کیا گیا ہے:-

جن اصولی، عملی اور تہذیبی بنیادوں پر ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی تنظیم
اصلاح، ان حالات کے مطابق جو پیش آ رہے ہیں، ہو رہی ہے کیا وہ
اصول، روایات اور نقطۂ نظر کے مطابق ممکن ہے؟ براہ کرم حسب ذیل امور پر
اپنی تفصیلی رائے تحریر کیجیے:-

(الف) ایک ایسا قابلِ عمل دستور تجویز کیجیے جس کے ذریعہ قومی اجتماعی ترقی کا مقصد
کے لیے مسلمانوں کے مخصوص قومی مفاد کی بنا پر اتحاد پیدا کیا جا سکے۔

(ب) ایک ایسا اقتصادی نقشہ مرتب کیجیے جو اصولِ اسلام کے ساتھ
مطابقت رکھتا ہو۔

(ج) ہندوستانی مسلمان جن خصوصی حالات میں گھرے ہوئے ہیں انہیں
ذہن میں رکھ کر بتائیے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اگر، اور جب وہ ایسی ریاستیں
حاصل کر لیں جن میں ان کی اکثریت ہو تو ایک ایسا نظامِ حکومت قائم کر سکیں جس
میں مذہب اور سیاست کے درمیان ایک خوشگوار ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔

(د) اسلامی اصول، روایات، عقائد اور نظریات کے مطابق ایک ایسی اسکیم مرتب کیجیے جو مسلمانوں کے معاشرتی، تہذیبی اور تعلیمی پہلوؤں پر حاوی ہو۔

(س) ملی و قومی بہبودی کی خاطر ہندوستان میں مختلف اور منتشر جماعتوں کو ایک مرکز کے ماتحت منظم کرنے کے لیے طریق کار اور نظام اس طرح مرتب کیجیے کہ اس میں اسلام پر اعتقاد رکھنے والے ہر شخص کے احساسات، میلانات، اغراض اور مختلف ضروریات کا لحاظ ہو۔"

اس استفسار کا جو جواب ہماری طرف سے بھیجا گیا وہ درج ذیل ہے:

آپ نے جو تفصیلی سوالات دریافت کیے ہیں وہ دراصل ایک ہی بڑے سوال کے اجزا ہیں۔ پھر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان مسائل کو الگ الگ لینے اور ان پر الگ الگ رائے ظاہر کرنے کے بجائے اس بڑے سوال کو ایک وقت سامنے لے آیا جائے جس کے یہ سب اجزا ہیں؟ وہ بڑا سوال یہ ہے کہ مسلمان کس طرح وہ اصلی مسلمان بنیں جنہیں بنانا قرآن کا اصل منشا تھا؟ یہ ہے اصل سوال اور اس کے حل ہونے سے باقی سب سوالات خود بخود حل ہو جائیں گے۔

میرے پاس اس سوال کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ پہلے اسلام کو، جو کچھ کہ وہ ہے اور جو کچھ کہ انسان سے اس کے مطالبات ہیں، واضح طور پر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا جائے اور ان سے شعوری طور پر اسے قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ پھر جو لوگ اسے جاننے اور سمجھنے کے بعد قبول کریں اور اپنے طرز عمل سے ثابت کریں کہ واقعی انہوں نے اسے قبول کیا ہے، ان کو ایک پارٹی کی صورت میں منظم کرنا شروع کیا جائے، اور باقی مسلمانوں میں مسلسل تبلیغ و تفہیم کا سلسلہ اس ارادہ کے ساتھ جاری رکھا جائے کہ بالآخر ہمیں اس پارٹی میں پوری قوم کو جذب کر لینا ہے۔

اس پارٹی کے سامنے صرف ایک ہی نصب العین ہو، یعنی اسلام کو بحیثیت ایک نظام زندگی کے زمین پر قائم کرنا، اور اس کا ایک ہی اصول ہو، یعنی اسلام کے خاص طریقہ پر چلتے رہنا خواہ وہ طریقہ دنیا کو مرغوب ہو یا نہ ہو، اور غیر اسلام کے ساتھ ہر مداہنت و مصالحت (Compromise)

زبردستی مسلط ہو کے رہ جائے گی۔ دوسری طرف مسلم لیگ یہ ثابت کر رہی ہے
کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور وہ اپنی قومی حکومت قائم کرنے کے خواہشمند
ہیں۔ ان دونوں کا فیصلہ رائے دہندوں کے ووٹوں پر منحصر ہے۔ ایسی صورت
میں ہم کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے؟ کیا ہم لیگ کے حق میں ووٹ دیں اور دلوائیں؟
یا خاموش بیٹھے رہیں؟ یا خود اپنے نمائندے کھڑے کریں؟

جواب:- آپ کے ذہن پر ملک کے موجودہ سیاسی حالات کا غلبہ ہے۔ اس لیے آپ
کو اس وقت دو ہی نقشے نظر آتے ہیں جن میں ہندوستان کے مسلمان بٹے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اگر آپ
ذرا وسیع نگاہ سے دیکھیے تو ان دو نقشوں کے علاوہ آپ کو اور بہت سے اخلاقی، فکری،
تمدنی، مذہبی اور سیاسی و معاشی نقشے نظر آئیں گے جو اس وقت مسلمانوں پر مسلط ہو چکے ہوئے
ہیں۔ اور یہ ایک فطری سزا ہے جو اللہ کی طرف سے ہر اس قوم کو ملا کرتی ہے جو کتاب اللہ کی
حامل ہونے کے باوجود اس کے اتباع سے منہ موڑے اور اس کے منشا کے مطابق کام کرنے
سے جی چرائے۔ اس سزا سے اگر مسلمان بچ سکتے ہیں تو وہ صرف اس طرح کہ اپنے اس اصل و
بنیادی جرم سے باز آجائیں جس کی پاداش میں ان پر یہ نقشے مسلط ہوئے ہیں۔ اور اس کام کے
لیے کوشش کرنے لگیں جس کی خاطر انہیں کتاب اللہ دی گئی تھی۔ لیکن اگر وہ اس سے منہ موڑتے
ہیں اور پھر جو تدبیریں چاہیں کر کے دیکھ لیں، یقینی بات ہے کہ کسی ایک نقشے کا بھی سدباب
نہ ہو گا، بلکہ ہر تدبیر چند اور نقشے برپا کر دے گی۔

آپ نے جو سوال جماعت اسلامی کی توجہ اور فیصلے کے لیے پیش کیا ہے اس کے
متعلق میں دو باتیں واضح طور پر عرض کیے دیتا ہوں تاکہ آپ کو اور آپ کی طرح سوچنے والے
اصحاب کو آئندہ اس مسئلہ میں کوئی الجھن درپیش نہ آئے۔

اول یہ کہ پہلے آپ اس جماعت کے مقصد قیام کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ یہ جماعت کسی ملک
یا قوم کے وقتی مسائل کو سامنے رکھ کر وقتی تدابیر سے ان کو حل کرنے کے لیے نہیں بنی ہے،
اور نہ اس کی بنا کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے جس وقت جو
اصول چلتے نظر آئیں ان کو اختیار کر لیا جائے۔ اس جماعت کے سامنے تو صرف ایک ہی نگیر

اور اصل وہ بڑی مسئلہ ہے جس کی لپیٹ میں ہر ملک اور ہر قوم کے حادث وقتی مسائل آ جاتے ہیں اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی دنیوی فلاح اور اخروی نجات کس چیز میں ہے؟ پھر اس مسئلے کا ایک ہی حل اس جماعت کے پاس ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمام بندگانِ خدا (جن میں ہندوستان کے مسلمان بھی شامل ہیں) ایک صحیح معنوں میں خدا کی بندگی اختیار کریں اور اپنی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس کے سامنے جھکا دیں اور ان اصولوں کی پیروی میں سپرد کر دیں جو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں پائے جاتے ہیں۔ ہمیں اس مسئلے اور اس کے اس واحد حل کے سوا دنیا کی کسی دوسری چیز سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور جو شخص بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہتا ہو اسے لازم ہے کہ ہر طرف سے نظر ہٹا کر پوری جمعیتِ خاطر کے ساتھ اس شاہراہ پر قدم جمائے چلتا رہے۔ اور جو شخص ابھی تک اس راہ میں یکسو نہیں ہے، جس کے ذہن کو اپنے ملک یا اپنی قوم کے وقتی مسائل بار بار اپنی طرف کھینچتے ہوں اور جس کے قدم بار بار دوسری کی تحریکوں کی طرف پھسلتے ہوں جو دنیا میں فی الحال رائج ہیں، اس کے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ پہلے انہی ہنگامی تحریکوں میں جا کر اپنا دل بھر لے۔

دوم یہ کہ ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں بھی آپ ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیں۔ موجودہ انتخابات یا آئندہ ہونے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جو کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو، بہرحال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیتِ جمہور (Sovereignty of the People) کے اصول پر قائم ہوتا ہے، اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں اس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے جس کے لیے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے عقیدۂ توحید کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو، اور آخری سند (Final Authority) خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتابِ الٰہی کے تحت ہو، نہ کہ اس سے بے نیاز ہو کر۔ یہ ایک اصولی معاملہ ہے جس کا تعلق عین

ہمارے ایمان اور ہمارے اساسی عقیدے سے ہے۔[1] اگر ہندوستان کے علماء اور عامۂ مسلمین اس حقیقت سے ازبکل بے تعلق ہیں اور قومی مصلحتیں ان کے لیے مقتضیاتِ ایمانی سے اہم تر بن گئی ہیں تو اس کی جوابدہی وہ خود اپنے خدا کے سامنے کریں گے۔ لیکن ہم کسی فائدے کے لالچ اور کسی نقصان کے اندیشے سے اس مشرکانہ جمہوری نظام کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت نہیں کر سکتے۔ آپ خود ہی سوچ لیجیے کہ جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہوں وہ آخر کس طرح انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں؟ کیا ہمارے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو ہم کتاب اللہ کی سند سے غیر اللہ کی قانون سازی کو شرک قرار دیں، اور دوسری طرف خود اپنے ووٹوں سے ایسے لوگوں کو منتخب کرنے کی کوشش کریں جو خدا کے آئینی اختیارات غصب کرنے کے لیے اسمبلی میں جانا چاہتے ہیں؟ اگر ہم اپنے عقیدے میں صادق ہیں تو ہمارے لیے اس معاملہ میں صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنا سارا زور اس اصول کے منوانے پر صرف کر دیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے اور قانون سازی کتابِ الٰہی کی سند پر مبنی ہونی چاہیے۔ جب تک یہ اصول نہ مان لیا جائے ہم کسی انتخاب اور کسی رائے دہی کو حلال نہیں سمجھتے۔

(ترجمان القرآن۔ ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۵ء)

---

[1] یہی وجہ ہے کہ جماعتِ اسلامی نے تقسیم کے بعد انتخابات میں حصہ لینے اور اسمبلیوں کی رکنیت حاصل کرنے کا اس وقت تک جواز تسلیم نہیں کیا جب تک پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے قرار داد مقاصد (Objectives Resolution) پاس کر کے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت تسلیم نہ کر لی۔

(مرتب)

واضح طور پر ہونا۔ اب غور طلب یہ ہے کہ مسلمان جن کے متعلق آپ فرماتے ہیں وہ
کس غرض کے لیے "مسلم" نامی ایک جماعت بنائے گئے تھے؟ کیا اس غرض کے لیے کہ
وہ اس امرِ حق کو جو قرآن سے ثابت ہے دنیا کے سامنے پیش کریں، اس کو تسلیم کرائیں،
خود اپنی زندگی کو اس پر قائم کریں اور دنیا میں اس کو جاری کرنے کے لیے اپنی پوری قوت صرف
کردیں؟ یا اس غرض کے لیے کہ اس کے بالکل برعکس جو باطل بھی دنیا میں قائم ہو جائے
(اور خود ان کی اپنی غفلتوں کی بدولت قائم ہو) اس کی موافقت کریں اور اس کو اپنا لیں محض
اس کشمکش سے اس لیے گریز کرتے رہیں کہ کہیں ان کے مفاد کو نقصان نہ پہنچ جائے؟
اگر پہلی بات ہے تو مسلمان غلط برتاؤ کر رہے ہیں، معذور نہیں ہیں، اور ان کا عذر اگر اسی غفلت
سے وابستہ ہے تو وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس کی پروا کی جائے۔ اور ایسی صورتِ حال
میں ایک سچے مسلمان کو اپنی قوم کے ساتھ غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے امرِ حق کو قائم
کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، خواہ اس کی قوم اس کا ساتھ دے یا نہ دے۔ اور اگر آپ دوسری
بات کے قائل ہیں تو پھر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حق کو حق جاننے کے باوجود غیر
حق طریقہ پر اگر مسلمان قوم کی مصلحت کی خاطر آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔

یہ اندیشہ اکثر ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر ہم جمہوریت سے پرہیز کریں تو ان پر غیر مسلم قابض ہو کر نظام
حکومت کے تمام ملک و حقوق پر چھا جائیں گے اور اگر نظامِ باطل کے کل پرزے ہم نہیں تو دوسرے
بن جائیں گے اور اس طرح زندگی کے سارے کاروبار پر قابض ہو کر وہ ہماری ہستی ہی کو
ختم کر دیں گے، حتیٰ کہ اسلام کا نام لینے والے باقی ہی نہ رہیں گے کہ تم ان سے خطاب کر سکو۔
لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اندیشے جتنے ہولناک ہیں اس سے زیادہ خام خیالی کے نمونے ہیں۔ اگر
ہمارا منشا یہ ہوتا کہ صرف ایک منفی پالیسی اختیار کر کے مسلمان زندگی کا سارا کاروبار چھوڑ دیں
اور گوشوں میں جا بیٹھیں تو یہ اندیشے ضرور کسی حقیقت پر مبنی ہوتے۔ لیکن ہم اس نفی کے ساتھ
ساتھ ایک اثبات بھی تو پیش کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اس نظام کے ساتھ وفاداری
کرنے کے بجائے دنیا میں نظامِ حق قائم کرنے کے لیے منظم سعی شروع کریں اور دوسری قوموں
کے ساتھ اپنے دنیوی مفاد کے لیے کشمکش اور مزاحمت کرنے کے بجائے ان کے سامنے

وہ دین حق پیش کریں جس کی پیروی میں تمام انسانوں کی فلاح ہے، اور قرآن کے ذریعہ سے، سیرت محمدی کے ذریعہ سے اور اخلاق اسلامی کے ذریعہ سے دنیا میں فکری، اخلاقی، معاشی، اور تمدنی و سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں۔

ہماری اس دعوت کے جواب میں دو صورتیں پیش آ سکتی ہیں،

ایک یہ کہ تمام ہندوستان کے مسلمان، جن کی تعداد دس کروڑ ہے اور جن کے پاس مادی وسائل اور ذہنی اور مادی ترقی اور عروج پانے کی طاقتوں کی کمی نہیں ہے، بیک وقت ہماری اس دعوت کو قبول کر لیں اور ذہنی، اخلاقی اور عملی تمام حیثیتوں سے اسلام کے سچے داعی بن جائیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو آپ جو اندیشہ کر رہے ہیں کہ سب کچھ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور میں یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان ہی نہیں دنیا کا ایک بڑا حصہ آپ کے ہاتھ آ جائے گا، ہندوستان میں اقلیت اور اکثریت کا جھگڑا دیکھتے دیکھتے ختم ہو جائے گا، ہندوستان میں خالص اسلامی حکومت کا قیام ہونے سے کوئی طاقت نہ روک سکے گی، بہت قلیل مدت کے اندر مسلمان ممالک کی بھی کایا پلٹ جائے گی اور وہ قومیں جو آج مادی دنیا پر چھائی ہوئی ہیں مسخر ہونے سے محفوظ نہ رہ سکیں گی۔

دوسری صورت یہ پیش آ سکتی ہے، اور یہی زیادہ متوقع بھی ہے، کہ مسلمانوں میں سے بتدریج تھوڑی تھوڑی تعداد میں پاک نفس اور اعلیٰ درجہ کے ذہن رکھنے والے لوگ ہماری اس دعوت کو قبول کرتے جائیں گے اور جب تک یہ لوگ ایک گروہ منظم ہو کر ایک طاقت بنیں، عام مسلمان اپنے لیڈروں کی پیروی میں وہی کچھ کرتے رہیں گے جو ایک مدت سے کرتے رہے ہیں اور اب کر رہے ہیں۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ وہ خطرہ پیش نہیں آ سکتا جس کا آپ اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں، کیونکہ خود مسلمانوں کی عظیم الشان اکثریت وہ سب کام کرنے کے لیے موجود رہے گی جن کے نہ کرنے سے آپ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا قومی مفاد ہلاک ہو جائے گا۔ البتہ اگر یہ سارے کام ہوتے رہیں اور صرف وہی ایک کام نہ ہو جس کی طرف ہم بلا رہے ہیں اور اگر ہم بھی اسی تحریک اور اس کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے محض قوم اور اس کے مفاد کی فکر میں ان باطل راہوں کی طرف دوڑ جائیں جو آج اسلام اور مسلم مفاد کے نام سے ہو

مجالس قانون ساز کی رکنیت شرعی نقطۂ نظر سے

سوال: کیا مسلمان بحیثیت مسلمان ہونے کے اسمبلی کی ممبری جائز ہے یا نہیں؟
اگر نہیں تو کیوں؟ یہاں مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے نمائندے اسمبلی کی رکنیت
کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور ان کی طرف سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے
مجھ پر بار بار زور پڑ رہا ہے، حالانکہ جماعت کا مطالبہ یہی ہے۔ اگرچہ جناب کا
جس کی اشاعت حاکمیت کے نظریے پر قائم ہونے والی اسمبلی اور اس کی
رکنیت دونوں شرعاً ناجائز ہو جاتی ہیں، مگر تاوقتیکہ معقول وجہ پیش
نہ کرسکوں، ووٹ کے مطالبہ سے چھٹکارا پانا دشوار ہے۔

جواب: اسمبلی کے متعلق یہ سمجھ لیجیے کہ موجودہ زمانے میں جتنے جمہوری نظام بنے
ہیں (جن کی ایک شاخ ہندوستان کی موجودہ اسمبلیاں بھی ہیں) وہ اس مفروضے پر مبنی
ہیں کہ باشندگان ملک اپنے معاملے کے متعلق تہذیب و تمدن، سیاست، معیشت، اخلاق
اور معاشرت کے اصول وضع کرنے اور ان کے مطابق تفصیلی قوانین و ضوابط بنانے کا حق
رکھتے ہیں اور اس قانون سازی کے لیے رائے عام سے بالاتر کسی سند کی ضرورت نہیں
ہے۔ یہ نظریہ اسلام کے نظریے سے بالکل برعکس ہے۔ اسلام میں توحید کے عقیدے کا لازمی
جزو یہ ہے کہ لوگوں کا اور تمام دنیا کا مالک اور فرماں روا اللہ تعالیٰ ہے، ہدایت اور حکم

دینا اس کا کام ہے اور لوگوں کا کام یہ ہے کہ اس کی ہدایت اسلامی کے مطابق اپنے لیے قانونِ زندگی اختیار کریں، نیز اگر اپنی آزادیِ رائے استعمال کریں بھی تو ان حدود کے اندر کریں جن حدود میں خود اللہ تعالیٰ نے ان کو آزادی دی ہے۔ اس نظریے کی رو سے قانون کا ماخذ اور تمام معاملاتِ زندگی میں مرجع اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرار پاتی ہے، اور اس تصور سے ہٹ کر قول اور کر جمہوری نظریے کا قبول کرنا گویا عقیدۂ توحید سے منحرف ہو جانا ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جو اسمبلیاں یا پارلیمنٹیں موجودہ زمانے کے جمہوری اصول پر بنی ہیں ان کی رکنیت حرام ہے، کیونکہ ووٹ دینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اپنی رائے سے کسی ایسے شخص کو منتخب کرتے ہیں جس کا کام موجودہ دستور کے تحت وہ قانون سازی کرنا ہے جو عقیدۂ توحید کے سراسر منافی ہے۔ اگر علمائے کرام میں سے کوئی صاحب اس چیز کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں تو ان سے اس کی دلیل دریافت کیجیے۔[1]

اس کے جواب میں یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ چونکہ یہ نظام مسلط ہو چکا ہے اور زندگی کے سارے معاملات اس سے متعلق ہیں، اس لیے اگر ہم انتخابات میں حصہ لے کر اور نظامِ حکومت میں شریک ہونے کی کوشش نہ کریں تو ہمیں فلاں اور فلاں نقصانات پہنچیں گے۔ ایسے دلائل سے کسی ایسی چیز کو جو اصولاً حرام ہو، حلال ثابت نہیں کیا جا سکتا، ورنہ شریعت کی کوئی حرام چیز ایسی نہ رہ جائے گی جس کو مصلحتوں اور ضرورتوں کی بنا پر حلال نہ ٹھیرا لیا جائے۔ اضطرار کی بنا پر حرام چیزیں استعمال کرنے کی اجازت شریعت میں پائی تو جاتی ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ خود اپنی غفلتوں سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کر کے اضطرار کی حالتیں پیدا کریں، پھر اس اضطرار کو دلیل بنا کر تمام محرمات کو اپنے لیے حلال کرتے جائیں اور اس اضطرار کی حالت کو ختم کرنے کے لیے کوئی کوشش نہ کریں۔ جو نظام اس

---

[1] اس مسئلہ کو پوری تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہیں تو میری کتاب "اسلامی ریاست" ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب)

پُرامن انقلاب کا راستہ

سوال: ذیل میں چند شبہات پیش کرتا ہوں۔ براہِ کرم اپنے نظریات کی توضیح فرما کر انہیں صاف کیجیے۔

(۱) ترجمان القرآن کے گزشتہ سے پیوستہ پرچے میں ایک سائل کا سوال شائع ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی منظم اسٹیٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا، مگر حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ایک منظم اسٹیٹ تھا اور انہوں نے جب ریاست کو اقتدار کو منتقل کرنے پر آمادہ پایا تو آگے بڑھ کر قبول کر لیا اور یہ طریق کار اختیار نہیں کیا کہ پہلے مومنین صالحین کی ایک جماعت تیار کریں۔ کیا آج بھی جب اسٹیٹ اس قدر کئی گنا زیادہ ہمہ گیر ہو چکا ہے، اس قسم کا طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے پورا پورا اطمینان نہیں ہوا۔ مجھے جو دریافت کرنا ہے کہ ہم حضرت یوسف علیہ السلام کا اتباع کرنا ہی کیوں چاہیے؟ جب کہ ہمارے لیے تو صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ واجب الاتباع ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کی بادشاہت کی پیش کش کو رد کر کے اپنے ہی طور پر جداگانہ ریاست کی تعمیر و تشکیل کا کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور ہمارے لیے یہی طریق کار اب بھی ہے۔ واضح فرمائیے کہ میری رائے

پڑے گی؟

یا نظام باطل سے کامل بے تعلقی منقطع ہو جائے اور مسلمان ایک خالص اسلامی ماحول پیدا کر لے، لیکن اگر یہ صورت ناممکن ہو جیسا کہ ظاہر ہے تو پھر کون سا مسلک ہے کہ وہ تعاون تو اضطراراً جائز رکھا جائے جس سے یہ نظام کا حقہ مستحکم ہو کر دن بدن مضبوط سے مضبوط تر ہو رہا ہے، اور ان صورتوں سے اختیاراً دست کشی کر لی جائے جہاں کسی قدر اسلامی مقاصد بھی حاصل کرنا ممکن ہو۔ اگر ہم اور مسلک میں کسی وجہ تسمیہ کا ہونا لازم ہے تو ایسی صورت میں اس کو مسلک (چلنے کی راہ) کے بجائے عقوبۃً موقف (ٹھہرنے کی جگہ) کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

• کوثر کے اسی نمبر کے افتتاحیہ میں مولانا غلام رسول خان مہر نے بھی اسی مسئلہ پر بحث فرمائی ہے جس کے مطالعہ سے اس سلسلہ میں اور بھی الجھن پیدا ہو جاتی ہے اور مجبوراً تعقل کا شائبہ نقص کی حد کو پہنچ جاتا ہے۔ آپ جہاد کے لیے دو شرطیں مقرر فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"اس کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ وہ باختیار امیر کی قیادت میں ہو، کسی دوسرے نظام قاہر و مسلط کے اندر رہتے ہوئے جہاں کسی با اختیار امیر کا وجود ناممکن ہے قتال کرنا بدامنی اور فساد ہے جہاد تو نہیں۔"

پھر علم مزید ترجیح کا محتاج نہیں۔ با اختیار امیر کی قیادت کے بغیر جہاد فساد ہے اور امیر کا وجود کسی دوسرے قاہر و مسلط نظام کی موجودگی میں ناممکن ہے۔[1]

اس تمہید کی صحت تسلیم کر لینے کے بعد نظام حق قائم ہونے کی صرف یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ قاہر و مسلط نظام کے ارکان خود بخود مہربانی کر کے مسلمانوں پر سے اپنا قہر و تسلط اٹھالیں اور انہیں کامل آزاد ماحول میں چھوڑ کر خود کہیں چلے جائیں تاکہ مسلمان

---

[1] یہ محض ایک لفظی بحث ہے۔ ہم کو ثر نے اس مقام پر جس جہاد سے بحث کی ہے وہ جہاد بالسیف ہے نہ کہ جہاد جو جدوجہد کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اس دوسری قسم کے جہاد کے لیے با اختیار امیر کی شرط کا کوئی بھی قائل نہیں۔ (مدیر)

جواب

یہ مضمون دراصل متعدد مغالطوں یا غلط فہمیوں کا مجموعہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کر کے یہاں ہم صرف تین بڑی اور بنیادی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) صاحب مضمون کی پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ "اگر مسلمانوں کو قانون سازی کا غیر مشروط حق حاصل ہے تو اس حق کا غیر مشروط ہونا ہی اس امر کی ضمانت ہے کہ یہ لوگ صحیح قانون مرتب کرنے میں آزاد ہیں، یعنی ان کو اختیار حاصل ہوگا کہ ایسے قانون مرتب کریں جس میں تنزیل منزل من اللہ کتاب کو مانا جائے"۔ بظاہر یہ بات بڑی معقول معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی تھوڑی سی تحلیل کرنے سے اس کی حقیقت بالکل کھل جاتی ہے کہ یہ مغالطہ یا غلط فہمی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ آزادی کا ایک مفہوم یہ ہے کہ انسان کو یا انسانوں کے کسی گروہ کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل ہو، اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ کوئی انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ اپنا یہ اصول قرار دے اور اس نظریے پر کاربند ہو کہ وہ اپنے عمل میں خود مختار ہے اور خدا اپنی خواہش اور صوابدید کے سوا کسی اعلیٰ ہدایت سے امر و نہی کے احکام لینے اور اپنے معاملات میں رہنمائی حاصل کرنے کا پابند نہیں ہے۔ ان دونوں مفہومات میں سے پہلے مفہوم کی آزادی تو انسان کی فطری مسئولیت و ذمہ داری کی اساس ہے جس کی بنا ہی پر وہ شریعت الٰہیہ کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ یہ آزادی مومن ہونے کے لیے بھی اسی طرح ناگزیر ہے جس طرح کافر ہونے کے لیے۔ اسے ایمان و اسلام کی راہ میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور کفر و معصیت کی راہ میں بھی۔ اس کو بجائے خود نہ کفر کہا جا سکتا ہے نہ ایمان، بلکہ یہ ایک شرط مقدم ہے جس کے حصول کے بغیر کوئی فرد یا گروہ نہ ایمان کی راہ پر چل سکتا ہے نہ کفر کی راہ پر۔ بخلاف اس کے دوسری قسم کی آزادی قطعی طور پر ایک کافرانہ آزادی ہے اور کسی فرد یا قوم کا اسے بطور ایک نظریہ و مسلک کے اختیار کرنا یہی معنی رکھتا ہے کہ اس نے ایمان کے بجائے کفر کی راہ اپنے لیے انتخاب کی ہے، کیونکہ کفر اس کے سوا کسی اور چیز کا نام ہی نہیں ہے کہ انسان اپنے آپ کو ہدایت الٰہی سے بے نیاز قرار دے کر اپنے نظریات و

اصل میں خود مختاری کا طریقہ اختیار کرے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں جس دستور پر حکومت خود اختیاری کا نظام اس وقت قائم کیا گیا ہے اور جس طرح پر آئندہ اس دستور کا نشوونما ہو رہا ہے اس کی بنیاد آیا صرف پہلی ہی قسم کی آزادی ہے یا دوسری قسم کی آزادی بھی اس میں شامل ہے؟ جو شخص ہندوستان کے موجودہ نظام حکومت سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ پورا نظام غیر دینی، لادینی ریاست (Secular State) کے نظریہ پر مبنی ہے۔ اور اب جو اس کا زیادہ ترقی یافتہ ارتقا ہو رہا ہے اس میں بھی یہ بات اصل واساس کے طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ وہ بھی "جمہوری" جمہوری ریاست کے قاعدہ پر مبنی ہوگا۔ یعنی اس میں باشندگانِ ملک کو صرف یہی آزادی حاصل نہیں ہوگی کہ اپنے لیے جو دستور چاہیں اختیار کریں، بلکہ اس کی بنیاد لازماً اس نظریہ پر قائم ہوگی (اور ہو رہی ہے) کہ حاکمیت (Sovereignty) جمہور کی ہے اور قانون سازی میں رائے عام سے بالاتر کسی کتاب الٰہی اور ہدایت خداوندی سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بنا پر یہ پورا نظام دراصل ایک کافرانہ نظام ہے، اس کی بنیاد اسلام کی بنیاد سے متضاد ہے اور اس کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے اس میں داخل ہونا تقاضائے ایمان کے خلاف ہے۔ یہ آواز اگر صرف "پٹھان کوٹ" سے اٹھی ہے تو اس میں بے چارے "پٹھان کوٹ" کا کوئی قصور نہیں، قصور اُن دوسری جگہوں کا ہے جہاں سے یہ اٹھنی چاہیے تھی مگر نہ اٹھی۔

یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم اس نظام کے اندر داخل ہو کر اس کو اسلام کی طرف پھیر لیں گے۔ اس کے اندر داخل ہونا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ پہلے اس کے بنیادی نظریے کو تسلیم کیا جائے۔ اور اس کے بنیادی نظریے کو تسلیم کرنا اسلام کے بنیادی نظریے سے انکار کا ہم معنی ہے۔ لہٰذا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ بالجزم اس کے خلاف ڈٹیں اور اپنی تمام تر کوشش پہلے یہ اصول

ل یعنی اس کی کاروبار و کارکردگی میں شریک و حصہ دار ہو کر۔
ل ظاہر ہے کہ جہاں اور حکومت کی مشنری سے باہر رہنا ہے وہاں اس تمدن سے باہر نکل جانا بھی اس حکومت کے تحت ممکن ہے۔

ہم ان حقائق کو سمجھتے ہیں اور اس بنا پر ہمارے نزدیک وہ تدابیر ناقابلِ عمل ہیں جن سے ہمارے محترم معترض نگار اور ان کے طرز پر سوچنے والے بہت سے مسلمان اسلامی نظام کے قیام کی اُمیدیں وابستہ کیے بیٹھے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس مقصد تک پہنچنے کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ موجودہ صورت میں ہندوستان کا سیاسی نظام جس ڈھنگ پر چل رہا ہے اور جس راہ پر وہ آگے بڑھتا نظر آتا ہے اس سے فی الحال ہم قطع نظر کریں اور اپنی ساری قوت اس بنیادی کام پر صرف کریں جس کے ذریعے سے نظامِ زندگی میں اسلامی طرز کا انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی جو جماعتیں حقیقی صورتِ معاملہ کو اس طرح نہیں سمجھ رہی ہیں وہ اپنے طرزِ عمل میں مختار ہیں، جس طرح وہ کام کرنا چاہیں کریں۔ ہم ان کے خلاف خواہ مخواہ کوئی معرکہ آرائی نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ پچھلے زمانے کی غلطیوں کی بدولت اس وقت فوری طور پر ایسی کوئی قوت فراہم نہیں کی جا سکتی جس سے وقتی صورت کی موجودہ رَو پر وہ اثر ڈالا جا سکے جو اسلام کے مقصد کے لیے مطلوب ہے۔ اس لیے ہم اس وقت کی سیاسی کشمکش میں دخل دینا تضییعِ وقت بھی سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے بھی اس سے احتراز کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس وقت ہم اپنے اصول سے ہٹے بغیر سیاسی جدوجہد میں حصہ نہیں لے سکتے۔ نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس وقت سیاسی معاملات کا فیصلہ خواہ کچھ بھی ہو جائے اور اس کے نتائج آگے چل کر خواہ کتنے ہی خوفناک نکلتے نظر آئیں، لیکن اگر ہم اس پروگرام پر ٹھیک ٹھیک عمل درآمد کرنے میں کامیاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۱ سے) کی آزادی حاصل تھی جیسا کہ مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہندو ریاستی حکومت نے چنانچہ اس وقت کی پنجاب، بنگال، آسام اور پنجاب تینوں صوبے، دو دو کے حصوں میں تقسیم کر دیئے گئے، اور وہ تجویز جس وقت جواب سے تقسیم ہند کے رقبے پر آبادی کی بڑی تعداد اسلامی ہوگی ایسی اسکیم میں شامل تھا۔ اس طرح مشرقی میں مسلم آبادی کا تناسب ۰۰ فیصد سے زیادہ فیصدی ہو گیا۔ اس کے بعد پاکستان کی اسلامی ریاست بنانے میں جیسی جیسی دشواریاں پیش آئی ہیں ان سے اب کوئی بھی ناواقف نہیں ہے۔ (مرتب)

ہو گئے ہیں جس سے میل نظر ہے اور اس کا تسلسل رہتا ہے، بالآخر ختم کر دینی ہوگی اور ان سارے تعصبات کی تلافی ہو جائے گی جو اس وقت کے انتخابات سے ہمیں پہنچی ہے۔ ہمارا پروگرام مختصر یہ ہے:

(۱) مسلمانوں کے اس مخلوط مجموعہ میں سے صالح اہل ایمان کے عنصر کو چھانٹ کر اعلیٰ درجہ کی اخلاقی تربیت کے ساتھ منظم کیا جائے اور ان کو اس کام کے لیے تیار کیا جائے کہ وہ مسلم قومیت کے بجائے خود اسلام کو ایک اصولی تحریک کی حیثیت سے لے کر اٹھ سکیں۔

(ب) اس گروہ کے ذریعہ سے عام مسلمین میں اسلامی شعور و فہم اور اسلام اور غیر اسلام کی تمیز پیدا کی جائے۔ ان کی اخلاقی قدروں (Moral Values) کو تبدیل کر کے خالص اسلامی قدریں ان کے ذہن نشین کی جائیں۔ ان میں اسلامی نظام زندگی کے قیام کا شعوری ارادہ (محض موہوم اور مبہم ارادہ نہیں بلکہ واضح اور شعوری ارادہ) پیدا کیا جائے اور ان کی رائے عام کو اس حد تک تیار کر دیا جائے کہ اگر جمہوری طریقوں پر ملک میں انقلاب کرنا ممکن ہو تو خالص اسلامی طرز پر کام کرنے والی جماعت کے سوا کوئی دوسرا گروہ انہیں بیوقوف بنا کر یا ان کے سامنے غیر اسلامی مقاصد پیش کر کے ان سے ووٹ نہ حاصل کر سکے۔ اور اگر جمہوری طریقے قابل عمل نہ ہوں تو وہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ ہو جائیں۔

(ج) مسلمانوں اور غیر مسلموں کی موجودہ سیاسی کشمکش سے جو تعصبات ہندوستان کے غیر مسلموں میں پیدا ہو گئے ہیں ان سے بالاتر ہو کر غیر مسلموں کے سامنے اسلامی نظام زندگی کو اور ان اخلاقی بنیادوں کو جن پر یہ نظام زندگی قائم ہوتا ہے، پیش کیا جائے۔ اور پوری حکمت، جانفشانی اور خالص تبلیغی اسپرٹ کے ساتھ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں یہ ممکن ہو کہ غیر مسلموں کا بھی ایک صالح عنصر اسلامی نظام زندگی کا معتقد اور اس کے قیام کا طالب ہو جائے اور اسلامی نظام کا قیام صرف موجودہ مسلمان قوم کی رائے عام پر منحصر نہ رہے بلکہ ان قوموں کی رائے عام کی بھی کمک مزید ہو جائے جو آج غیر مسلم ہیں اور جن کو مسلمانوں کی موجودہ قومیت پرستانہ جنگ نے اسلام کے خلاف سخت تعصبات میں مبتلا کر رکھا ہے۔

اس پروگرام میں جب ہم ایک قابل لحاظ حد تک کامیاب ہو جائیں گے (اور ہمیں یقین ہے کہ جس طرز پر ہم کام کر رہے ہیں اس سے ان شاء اللہ ہم کو کامیابی ضرور ہوگی) تب ہم ملک

کے معاملے پر نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ آیا اس وقت یہاں جمہوریت اتنی ترقی کر چکی ہے کہ دستورِ حکومت میں کوئی اصولی تغیّر صرف اس بنیاد پر ہو سکتا ہے کہ رائے عام اس تغیّر کی خواہش مند ہے۔ اگر یہ صورت ہم نے موجود پائی تو ہم وقت کے دستورِ حکومت کو تبدیل کرنے اور اسلامی اصول پر نیا دستور بنانے کا مطالبہ ملک کی رائے عام کے سامنے پیش کریں گے، اس تغیّر کے لیے رائے تیار کریں گے، اور وقت کے سیاسی نظام پر دباؤ ڈالیں گے کہ وہ ایک نئی دستور ساز اسمبلی (Constituent Assembly) منتخب کرے جو اس امر کا فیصلہ کرے کہ ملک کا آئندہ دستور کیا ہو۔ اس اسمبلی کے الیکشن میں ہم پوری کوشش کریں گے کہ رائے عام کی تائید سے ہم کو اکثریت حاصل ہو اور ہم ملک کا دستور اسلامی اصولوں پر قائم کریں۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس پروگرام کو ایک بڑا لمبا پروگرام سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید اس کے پورا ہونے میں دو تین صدیاں لگ جائیں گی، اس لیے اُن کے نزدیک یہ کوئی عملی پروگرام نہیں ہے بلکہ اسے خیالی پلاؤ سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس پروگرام میں صبر آزما اور دیر طلب کام صرف اس ابتدائی صالح گروہ کی تعلیم و تربیت کا ہے جو اسلامی انقلاب کی ایک وسیع تحریک کا ہراول بن سکے۔ ایسے ایک گروہ کی تنظیم کے بعد یہ تحریک اس طرح پھیلے گی جیسے خشک گھاس میں آگ پھیلتی ہے۔ وقت کے تعین کی پیشین گوئی تو میں نہیں کر سکتا، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس ابتدائی مرحلے کے گزرنے کے بعد ہماری منزلِ مقصود اتنی دور نہیں رہے گی جتنی بہت سے لوگ [illegible] اپنے خیال میں فرض کیے بیٹھے ہیں۔ تاہم اگر وہ دور بھی ہو تو چونکہ منزل حق وہی ہے اس لیے ہم اس کی طرف دور تک چلتے رہنا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں بہ نسبت اس کے کہ جلدی پہنچنے کے شوق میں غلط گمراہ کن راہوں میں اپنی قوت صرف کریں یا نادانی کے ساتھ غلط مقصد کے حصول میں اپنی قوت ضائع کریں۔

(۳) تیسری غلط فہمی جس میں صاحب مضمون کے ساتھ بہت سے سادہ لوح مسلمان مبتلا ہیں، یہ ہے کہ مسلم لیگ کی پیدا کردہ موجودہ فضا اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ عام مسلمانوں کے ووٹوں سے صالح مومنین کا ایک گروہ منتخب ہو سکتا ہے جو وقت کی سیاسی قیادت کو

اسلامی نصب العین کی طرف بڑھنے کے قابل ہو۔ یہی بنا پر یہ حضرات کہتے ہیں کیسا نادر موقع مل رہا ہے اور تم اسے کھوئے دیتے ہو۔ اندھے ایمان کی بات تو دوسری ہے کہ اس میں تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور جب کوئی تحریک خوب غل اور جنگار کے ساتھ طوفانی رفتار سے چل رہی ہو تو عام طبائع میں اندھے ایمان کا اشتعال پیدا ہو ہی جایا کرتا ہے لیکن جب ہم تحقیق کی نگاہ ڈال کر ان نقشوں کا جائزہ لیتے ہیں جو مسلم لیگ نے پیدا کیا ہے تو ہمیں کسی نادر تو درکنار غیر نادر موقع کا بھی نشان نہیں ملتا۔

مسلم لیگ کی تحریک کے متعلق پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کے بنیادی تصورات، اس کا نظام ترکیبی، اس کا مزاج اور اس کی اسپرٹ، اس کا طریق کار اور اس کے مقاصد سب کچھ وہی ہیں جو قومی اور قوم پرستانہ تحریکوں کے ہوا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مسلمانوں کی قومی تحریک ہے اور مسلمان کی ہر چیز "اسلامی" بن جایا کرتی ہے اس لیے خواہ مخواہ اسے بھی اسلامی تحریک سمجھ لیا گیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل ایک دوسری ہی چیز ہوتی ہے جس کا کوئی شائبہ بھی مسلم لیگ کی قومی تحریک میں نہیں پایا جاتا۔ اور یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اسلام اپنے مخصوص طریق کار سے جس منزل تک پہنچنا چاہتا ہے اس تک آپ ایک قوم پرستانہ تحریک کے ڈھنگ اختیار کرکے پہنچ جائیں۔ ہر منزل اپنی نوعیت کے لحاظ سے اپنی ہی ایک مخصوص راہ رکھتی ہے۔ آپ اسلام کی منزل مقصود کو پہنچنا چاہیں تو آپ کو اسلامی تحریک ہی کی مخصوص راہ پکڑنا اور اسے اختیار کرنا پڑے گا۔ قوم پرستی کے طریقے اختیار کرکے آپ قومیت کی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں مگر یہ توقع کرنا نہایت پراگندہ خیالی ہے کہ ان ڈھنگوں سے آپ اسلامی منزل مقصود پر جا پہنچیں گے۔ اس نکتہ کی توضیح کا یہاں موقع نہیں ہے۔ میں اس سے پہلے تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ ایک اصولی تحریک اور ایک قوم پرستانہ تحریک میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ضرورت ہو تو پھر اس کی تشریح کر سکتا ہوں۔ یہاں میں اشارۃً صرف اتنی بات واضح کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ایک اصولی تحریک کے کارکنوں کو یہ خبر دینا کہ تمہارے لیے قوم پرستانہ تحریک نے بڑے اچھے مواقع پیدا کر دیے ہیں کسی بصیرت و دانشمندی کا ثبوت نہیں ہے۔

اس کی مثال تو بالکل ایسی ہے جیسے کسی مدرسہ فلسفہ کی خبر دی جائے کہ وہ جیل تیار کر رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ مسلم لیگ کسی حد تک مفید ہو بھی سکتی تھی تو شاید اس صورت میں ہوتی جب کہ مسلمانوں کی یہی قوم پرستانہ تحریک میں کم از کم ثانوی حیثیت ہی سے مذہبیت کا کچھ عنصر موجود ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہاں اس کا بھی فقدان ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ لیگ فی الواقع مسلمانوں کو اسلام اور اس کی تہذیب اور اس کے احکام کی اطاعت سے روز بروز دُور تر لیے جا رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام مسلمانوں کے جذبات کو ابھارنے کے لیے اس میں اسلام کا نام بہت لیا جاتا ہے، اور یہی نمائشی باتیں بھی کچھ کر دی جاتی ہیں جن سے اوپر لیگ کے گہرے مذہبی ہونے کا ثبوت بہم پہنچ جائے۔ لیکن یہ چیزیں صرف سطحی بین لوگوں کو دھوکے میں ڈال سکتی ہیں۔ حقیقت جو کچھ ہے وہ ہر صاحب نظر کے سامنے بالکل بے نقاب ہے۔ لیگ کی قیادت، اس کی پالیسی کی تشکیل، اس کے پورے نظام کی کارفرمائی، اور اس کی ساری قوت محرکہ اس وقت مسلمان قوم کے ایک ایسے طبقے کے ہاتھ میں ہے جو زندگی کے جملہ مسائل میں دین کے بجائے دُنیوی (Secular) نقطۂ نظر سے سوچتا ہے، اور اسلام کو نظرانداز کرتا ہے، اسلام کے بجائے مغربی اصول حیات کا معتقد اور مقلد ہے، دینی تعلق کے بجائے قومیت کے تعلق کی بنا پر مسلمانوں کی حمایت و وکالت اُسی طرح کر رہا ہے جس طرح ہر قوم پرست کیا کرتا ہے، وہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ یہ گروہ خود بحیثیت اسلام کے اصول و احکام کی خلاف ورزی کرنے میں بیباک ہے بلکہ اس کی رہنمائی و سربراہ کاری کی وجہ سے مسلمانوں میں بالعموم اسلام کے احکام کی خلاف ورزی اور اس خلاف ورزی میں بیباکی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، ملّت کی دینی حس مُردہ ہو رہی ہے اور ان پر وہ ذہنیت بڑی تیزی کے ساتھ چھا رہی ہے جو اپنی اصل کے لحاظ سے قطعاً ایک دُنیا پرستانہ ذہنیت ہے گو "مسلم قوم کے مفاد" اور "ملت کی زندگی کے بقا" کا نام دے کر اس پر اسلامیت کا جھوٹا ملمع چڑھایا جا رہا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ اس صورت حال کے پیدا کرنے کی ذمہ داری میں ان مذہبی پیشواؤں کی گردن بھی برابر کی شریک ہے جن کے ہاتھ میں تحریک خلافت کے زمانے سے مسلمانوں کی قیادت کی باگیں تھیں اور جنھوں نے مسلمانوں کے عام احساسات کے علی الرغم ہندوستانی قوم پرستی کے

سر دار خود مسلک پر مولانا کے مسلمانوں کو ہر دوستی عقد جب ہمسایوں کی گود میں دھکیل دیا لیکن
اسباب خواہ کچھ ہوں یہ امر بجائے خود حقیقت ہے کہ مسلم لیگ کی پیدا کی ہوئی موجودہ فضا مسلم
کے لیے کوئی موافق فضا نہیں ہے بلکہ تباہی کا راستہ اور ماسلاد مذہب ہے جس میں خاص دینی نقطۂ نظر
سے کام لینے کے رجحان کو اور کمزور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میں تو ان لوگوں کو لیگ کے حق میں یہ
لوگوں کو بھی ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے جو اسلام کے ساتھ مسلمانوں میں اور سچے دل سے اسلام
کی بہتری چاہتے ہیں۔ مگر مجھے ان کی سادہ لوحی پر بڑا ترس آتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نیشنلزم کا راستہ
لے رہے ہیں جس کا انتخاب ترکی کے بعض نیک نیت مسلمانوں نے پچھلی جنگ عظیم کے بعد
کیا تھا اور اس کا بڑا انجام دیکھ لیا۔ انہوں نے بھی اسی طرح قومی تحفظ کی خاطر اور مسلمان قوم کا تحفظ
تو ایک مقدس مذہبی کام ہی ہوتا ہے، مصطفیٰ کمال اور اس کی قوم پرست پارٹی کو زمام اقتدار سونپی
تھی۔ وہ بھی اسی طرح مذہبی تاویلیں کر کے دینی کی طرف اس کی ہر پیش قدمی کو گوارا کرتے تھے۔
اور یہی وہ بھی اپنے دلوں میں سوچ سوچ کر تسلی دیا کرتے تھے کہ اس وقت تو قوم کا تحفظ مقدم ہے اور
اس لیے [illegible] کی [illegible] کو برداشت کر لینا چاہیے، جب یہ وقت گزر
جائے گا تو انشاء اللہ ہمارا کارواں جادۂ اسلام کی طرف پھر مڑ جائے گا۔ مگر وہ کارواں جو اپنے آپ
کو بے دین قیادت کے ہاتھوں میں خود دے چکا تھا اسے پھر اسلام کی راہ پر جانے کی توفیق
نصیب نہ ہوئی۔

اب ذرا دینی پہلو سے قطع نظر کر کے محض قومیت کے نقطۂ نظر سے اس معاملہ کا
جائزہ لیجیے جو مسلم لیگ نے اس وقت پیدا کی ہے۔ اس کا یہ پہلو خواہ کتنا ہی شاندار ہو کہ مسلمانوں
میں ایک عام قومی حرکت پیدا ہو گئی ہے اور وہ ایک مرکزی مقصد سے وابستہ ہو
گئے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ لیگ کی یہ تحریک محض ایک جذباتی ہیجان ہے جو محض
قوم پرستی کے نعروں اور مذہب کے جوش سے مسلمانوں میں محرک اٹھا ہے۔ اس ہیجان
کے نیچے کوئی سوچا سمجھا نقشہ نہیں ہے، کوئی واضح منصوبہ نہیں ہے، کوئی تعمیری کام نہیں ہے

لہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان ایک واضح منصوبہ ہے۔ لیکن کسی منصوبے کے لیے محض ایک نام (حوالہ [illegible])

کو حصول مقصد کے لیے عاقلانہ عزم کر سکے ۔ کانگریس کی طرح کوئی جماعت نہیں ہے جو قابلِ استناد
سیرت اور ایک منظم نظر رکھتی ہو اور کوئی ایسی قیادت نہیں ہے جو ایک عمومی تحریک کو چلانے
کی اہل ہو ۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں میں جو حرکت پیدا ہوئی ہے وہ لیگ اور اس کی قیادت نے
پہلے بغیر کسی نقشے کے مطابق پیدا نہیں کی بلکہ جس طرح مسلمانوں کی قومی صلاحیت اور ان کے لیڈروں
کی تنگ نظر سیاست سے مسلمانوں میں خود بخود ایک احساسِ خطر اور ہیجان و اضطراب پیدا ہو گیا
تھا اور اس حالت میں جب مسلمانوں نے دیکھا کہ وہ مذہبی اور سیاسی لیڈر جن کی طرف وہ
تحریکِ خلافت کے زمانے سے رجوع کرتے رہے تھے ، ان کے کسی کام نہیں آ رہے تو جس نے بھی
آگے بڑھ کر ان کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھایا اس کا دامن انہوں نے تھام لیا ۔ اب یہ محض قسمت کی بات
ہے کہ اس ہیجان کی حالت میں جو رہنمائی ان کو میسر آئی وہ بجز کاغذی اشخاص اور سیاسی کی طاقت
ڈھونڈنے کے اور کسی راز جنگ اور طریق رہنمائی سے واقف نہیں ہے ۔ اور یہ کھیل چونکہ کسی تیاری
اور کسی نقشے کے بغیر کھیلا گیا تھا اس لیے اس کا کوئی نتیجہ اس کے سوا نہ ہوا کہ مسلمانوں کے قومی
کیرکٹر کی کمزوری مزید بے نقاب ہو گئی اور ان کی ہوا پہلے سے زیادہ اکھڑ گئی ۔ سب سے زیادہ
افسوس ناک معاملہ جس نے لیگ کی موجودہ رہنمائی کا نتیجتاً نااہل ہونا واضح کر دیا ہے اشتراکیوں
کا معاملہ ہے ۔ اس گروہ کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ اس کی وفاداریاں اور ہمدردیاں روس
کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کی رہنمائی کی باگیں ماسکو والوں کے ہاتھ میں ہیں ۔ کوئی قوم جو اپنے
گھر میں آزاد ہونا یا رہنا چاہتی ہو ، اپنے درمیان ایسے ایک گروہ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں
دے سکتی جو کسی بیرونی طاقت کے اشاروں پر کام کرتا ہو ۔ اسی وجہ سے کانگریس نے اس گروہ کو

دیکھیے مقدمہ ... جتنا ہو جاتا ہے کسی ذہن رکھتا کہ وہ مقصد ایک اسلامی مقصد ہے ۔ جس چیز کو پاکستان
کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ قطعی مبہم ہے اور اس کی اصل تعبیر غالباً ایک جمہوری لادینی
حکومت کے سوا کچھ نہ ہوگی ۔ مگر یہ بات محض اس لیے صاف صاف بیان نہیں کی جاتی کہ کہیں وہ
مسلمان جو اسلامی نظام کے قیام کی امید لگائے بیٹھے ہیں اس سے مایوس نہ ہو جائیں ۔

(مترجم)

تقسیم سے قبل
ہندوستان کے مسلمانوں کو آخری مشورہ

(یہ وہ تقریر ہے جو ۲۶ اپریل ۱۹۴۷ء کو جماعت اسلامی کے اجلاس منعقدہ مدراس میں کی گئی تھی۔)

رفیقو اور دوستو: اس وقت ہم ہندوستان کی تاریخ کے ایک بہت نازک اور فیصلہ کن مرحلے سے گزر رہے ہیں اور یہ مرحلہ جس طرح ہندوستان کے باشندوں کی قسمت کے لیے فیصلہ کن ہے اُسی طرح ہماری اس تحریک کے لیے بھی فیصلہ کن ہے۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس موقع پر ہم پوری ہوشمندی کے ساتھ دیکھیں کہ وہ مقصد کیا ہے جس کے لیے ہم کام کرنا چاہتے ہیں، اور وہ کیا حالات ہیں جن میں ہمیں کام کرنا ہے، اور وہ کس رخ پر جا رہے ہیں کی رفتار پر یہ حالات جا رہے ہیں اور ان میں سے ہمیں اپنا راستہ نکالنا ہوگا، اسی طرح سمجھیں، اور ہماری پوری بصیرت کے ساتھ یہ جائزہ لیں کہ موجودہ اور آئندہ حالات میں ہمیں کس طرز عمل کی پابندی کرنا ہے۔

ہماری اس تحریک کا مقصد جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں صاف اور واضح الفاظ میں یہ ہے کہ ہم اس صحیح طریقِ زندگی کو جس کا نام اسلام ہے، انفرادی اور اجتماعی طور پر قائم کریں، اپنے قول و عمل سے اس کا ٹھیک ٹھیک مظاہرہ کریں، دنیا کو اس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کریں کہ اسی طریقِ زندگی میں اس کے لیے صلاح اور سعادت ہے، اور موجودہ باطل نظاموں کی جگہ وہ نظامِ حق برپا کرنے کی جدوجہد کریں جو سراسر اسی طریقِ زندگی پر مبنی ہو۔ اس

اُسے پہنچا سکیں۔

ہندوستان میں اس وقت جو حالات رونما ہیں وہ بظاہر جدید دعوت کے لحاظ سے نہایت مایوس کن ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ سب لوگوں پر ان حالات کا کس قدر شدید اثر پڑ رہا ہے۔ ملک کی مختلف قومیں قومی خود غرضی میں بُری طرح مبتلا ہیں اور قوم پرستی کا جنون بڑھتے بڑھتے اس منزل پر پہنچ گیا ہے کہ اس سے وہ حرکات سرزد ہو رہی ہیں جنہیں اگر جانوروں سے بھی منسوب کیا جائے تو وہ بھی توہین محسوس کریں۔ قومی کشاکش نے جنگ کی اور جنگ نے وحشت و درندگی کی شکل اختیار کرلی ہے۔ پہلے زبانیں ہی تک تھی کہ ہر قوم ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنے دعوے اور مطالبے زور سے پیش کر رہی تھی اور اس پر تُو تُو میں میں کا سلسلہ چل رہا تھا، مگر اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ مختلف قومیں ایک دوسرے کا نام و نشان تک مٹا دینے کے درپے ہیں۔ انہوں نے اپنی رہنمائی کا کام ایسے ایسے لیڈروں اور اخبار نویسوں کے سپرد کر دیا ہے جو انہیں ہر روز خود غرضانہ قوم پرستی کی شراب، نفرت و عداوت کا زہر گھول کر پلاتے ہیں اور ان کی حیوانیت بڑھتی ہوئی قومی خواہشات کی وکالت میں انصاف اور اخلاق کی ساری حدوں کو پھاندتے چلے جاتے ہیں۔ اخلاقی تصورات کے لیے ان کے دل و دماغ میں سرے سے کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔ تمام اخلاقی حدود اب قومیت کے تابع ہو گئے ہیں۔ جو کچھ قومی مفاد اور قومی خواہشات کے مطابق ہے وہی سب سے بڑا اخلاق ہے، خواہ وہ جھوٹ ہو، خیانت ہو، ظلم ہو، سنگدلی اور بے دردی ہو، یا اور کوئی ایسی چیز جو دنیا کے معروف اخلاقیات میں ہمیشہ سے بدی سمجھی جاتی رہی ہے۔ برعکس اس کے سچائی، انصاف، دیانت، رحم، فرض شناسی، انسانیت سب گناہ قرار پا چکے ہیں اگر وہ قومی مفاد کے خلاف پڑتے ہوں یا قومی خواہشات کے حصول میں مانع ہوں۔

ان حالات میں کسی ایسی دعوت کے لیے کام کرنا سخت مشکل ہے جو قوم پرستی کو نظر انداز کرکے انسانیت کو خطاب کرتی ہو، جو قومی خواہشات کو چھوڑ کر خالص اصولِ حق کی طرف بلاتی ہو، اور قومی خود غرضیوں کو توڑ کر عالمگیر انصاف قائم کرنا چاہتی ہو۔ جنونِ قومیت کے اس دور میں ایسی دعوت کی آواز سننے کے لیے نہ ہندو تیار ہیں نہ مسلمان، سکھ

ہیں کہ تم ہماری قوم کے افراد ہو۔ تمہارا فرض تھا کہ قوم کے جھنڈے تلے جمع ہو کر قومی ترقی
کرتے، لیکن تم نے الگ جماعت بنا کر دی اور اخلاق اور اصول حق کی رٹ لگانی شروع کر دی!
تمہاری اس حرکت بے ہنگام سے قوم کی طاقت منتشر ہوتی ہے اور قومی مفاد کو نقصان پہنچتا
ہے۔ لہٰذا ہم تمہیں قوم کا دشمن سمجھتے ہیں خواہ تمہاری دعوت اسی اسلام کی طرف ہو جس کا نام
لے کر ہم یہ قومی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف ہندوؤں کے پاس جائیے تو وہ خیال
کرتے ہیں کہ ان لوگوں کی بات دل کو تو ضرور لگتی ہے، مگر ان سے ہم کو اسی طرح چوکنا رہنا
چاہیے کیونکہ یہ ہیں تو اسی قوم کے افراد جس سے ہماری لڑائی ہے، کیا خبر کہ یہ اصولی صورت
بھی مسلمان قومیت ہی کو فروغ دینے کے لیے ایک دوسری تدبیر ہو۔

لیکن یہ حالات خواہ کتنے ہی حوصلہ شکن اور صبر آزما ہوں، بہرحال مستقل نہیں ہیں بلکہ
عنقریب بدل جانے والے ہیں۔ اس وقت آپ کے لیے طریق عمل یہ ہے کہ صبر اور
تحمل، اخلاق سے اپنا کام کیے جائیں۔ الجھنے والوں کے ساتھ نہ الجھیں، نادان لوگوں کی باتوں
پر برافروختہ نہ ہوں۔ جن لوگوں میں دوست اور دشمن تک کی تمیز باقی نہیں رہی ہے اور جو لوگ
جوش جنون میں اب خود اپنے بھلے اور برے تک کا ہوش نہیں رکھتے وہ اگر جہالت اور جاہلیت
پر اتر آئیں تو آپ شریف آدمیوں کی طرح ان کے مقابلے سے ہٹ جائیں اور ان کی بیہودگیوں
کو خاموشی سے سہہ لیں۔ اس کے ساتھ آپ کو چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ معقول طریقہ سے اپنی
دعوت مسلم اور غیر مسلم سوسائٹی کے ان سب لوگوں تک پہنچائیں جو معقول بات کو سننے اور
اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس طریقہ پر اگر آپ نے عمل کیا تو ایک طرف
آپ کی اخلاقی برتری کا سکہ بیٹھ جائے گا اور دوسری طرف وہ فضا بھی ایک حد تک تیار
ہو جائے گی جو آنے والے حالات میں تحریک کے لیے ضروری ہے۔

جس تغیر کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ عنقریب ملک تقسیم ہو جائے گا۔
ہندوؤں کو ان کی اکثریت کے علاقے اور مسلمانوں کو ان کی اکثریت کے علاقے الگ مل جائیں
گے۔ دونوں اپنے اپنے علاقوں میں پوری طرح خود مختار ہوں گے اور اپنی مرضی کے مطابق اپنے
اسٹیٹ کا نظام چلائیں گے۔ یہ بڑا تغیر ان تمام نقشوں کو بالکل بدل دے گا جن پر اس وقت تک

حالات بچتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسری قوموں کے مسائل اور ان کی نوعیتیں بالکل بدل جائیں گی۔ ان کو بالکل ایک دوسری ہی صورت حال سے سابقہ پیش آئے گا۔ جس ڈھنگ پر اس وقت تک انہوں نے اپنے قومی رویہ اور اپنی تحریکات و جماعتی نظام کو قائم کر رکھا ہے وہ بڑی حد تک بے معنی اور ناکارہ ہو رہے گا۔ ہمارے ہم وطنوں میں ان سب کو سوچنا پڑے گا کہ جو کچھ اب تک وہ کرتے رہے ہیں اس سے انہیں کہاں تک فائدہ پہنچا ہے اور اب اس نئے دور زندگی میں ان کے لیے راہ عمل کیا ہے۔ ان کے بہت سے ابھرے ہوئے عقیدے اس وقت بے معنی ہو جائیں گے۔ ان کے خیالات اور تعصبات کے لیے اس وقت کوئی جگہ نہ ہوگی۔ آج کے نعرے اس وقت کھوٹے سکے ہوں گے جنہیں کوئی مفت کو بھی نہ پوچھے گا۔ جن بنیادوں پر انہوں نے اپنی قومی تحریکیں اور جماعتیں قائم کی ہیں وہ خود بخود ڈھے جائیں گی۔ اس لیے عجب نہیں ہے کہ ملک کی بہت سی پارٹیاں اپنی طبعی موت مر جائیں گی بلکہ بعید نہیں کہ جو لوگ آج انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں کل وہی ان کو اپنے مصائب و آلام کا اصل سبب سمجھنے لگیں۔

آنے والے دور میں ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے حالات بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے، اور چونکہ ہمیں دونوں علاقوں میں کام کرنا ہوگا اس لیے ہمیں بھی اپنی تحریک کو دو مختلف طریقوں پر چلانا پڑے گا۔ بلکہ بعید نہیں کہ نظام جماعت کو بھی دو حصوں میں بانٹ دینا پڑے تاکہ ہر حصہ اپنے اپنے علاقے کے حالات کے مطابق مناسب پالیسی پر خود چل سکے اور اس کے لیے ضروری اختیارات خود رکھے۔ جہاں تک مسلم علاقے کا تعلق ہے اس پر تو میں یہاں کوئی بحث نہ کروں گا، کیونکہ اس کے لیے موزوں مقام شمالی مغربی حلقہ کا اجتماع ہے جو عنقریب ہونے والا ہے۔ آپ کے سامنے مجھے صرف ہندو ہندوستان کے مستقبل پر گفتگو کرنی ہے کہ یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کو آئندہ کن حالات سے سابقہ پیش آنے والا ہے اور ان حالات میں آپ کو کس طرح کام کرنا ہوگا۔

سب سے پہلے مسلمانوں کے معاملہ کو لیجیے۔ ہندو اکثریت کے علاقے میں مسلمان عنقریب یہ محسوس کریں گے کہ جس مسلم قوم پرستی پر انہوں نے اپنے اجتماعی رویہ کی بنا رکھی تھی وہ

انہیں بیابانِ مرگ میں لا کر چھوڑ گئی ہے اور ان کی قومی جنگ، جسے وہ بڑے جوش و خروش سے بغیر سر پیر کے لڑ رہے تھے، ایک ایسے نتیجہ پر ختم ہوئی ہے جو ان کے لیے تباہی کے سوا اپنے اندر کچھ نہیں رکھتا۔ جن جمہوری اصولوں پر ایک مدت سے ہندوستان کا سیاسی ارتقا ہو رہا تھا اور جنہیں ہم مسلمانوں نے بھی قومی حیثیت سے تسلیم کر کے اپنے مطالبات کی ترتیب کی تھی، انہیں دیکھ کر ایک نظر میں معلوم کیا جا سکتا تھا کہ ان اصولوں پر بننے والے نظم حکومت میں ہر کچھ حق ہے اکثریت کا حق ہے۔ اقلیت کا اگر حق ہے تو خیرات کے طور پر دست نگر ہونے کی حیثیت سے، نہ کہ حق کے طور پر حریف اور مدِّ مقابل اور شریک کی حیثیت سے۔ یہ ایک ظاہر و باہر حقیقت تھی، مگر مسلمانوں نے اس کی طرف سے جانتے بوجھتے آنکھیں بند کر لیں اور اس دوہری حماقت کا ارتکاب کیا کہ ایک طرف تو نظام حکومت کے لیے مغرب کے انہی جمہوری اصولوں پر راضی ہو گئے اور دوسری طرف خود ہی قومیت سے تقسیم ملک کا یہ اصول پیش کیا کہ جہاں ہم اکثریت میں ہیں وہاں ہم حاکم اور تم محکوم ہو، اور جہاں تم اکثریت میں ہو وہاں تم حاکم اور ہم محکوم ہوں۔ کئی سال کی تلخ اور خونریز کشمکش کے بعد اب یہ مرکب حماقت کامیابی کے مرحلے میں پہنچ گئی ہے، اور جس چیز کے لیے اقلیت کے صوبوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان خاص طور سے لڑ رہے تھے وہ حاصل ہوا چاہتی ہے، یعنی اکثریت کی آزاد خود مختار حکومت جس میں وہ بحیثیت ایک قوم کے محکوم ہوں گے اور محکوم بھی اُس اکثریت کے جس سے وہ برسوں تک قومی جنگ لڑتے رہے تھے۔

ہندوستان اب جس تقسیم کے طریقوں پر بن رہا ہے وہ ہندوؤں کا قومی اسٹیٹ ہوگا۔ قومیت و جمہوریت کے جن نظریات پر مسلمان اور ہندو ملک تقسیم کر کے اپنی قومی تحریکوں کی اساس بنا چکے ہیں ان کی بنیاد پر کوئی قومی اسٹیٹ اپنے اندر کسی دوسری دینی قوم کے وجود کو گوارا نہیں کر سکتا الّا یہ کہ وہ اکثریت سے الگ اپنی مستقل قومیت کی مدعی ہو اور پھر اس قومیت کے دعوے کے ساتھ اپنے مخصوص قومی مطالبات بھی رکھتی ہو۔ یہ چیز صرف اُسی وقت تک چل سکتی تھی جب تک ملک میں اقتدار ایک بیرونی قوم کا تھا اور ہندو مسلمان دونوں اس کے محکوم تھے۔ صرف اُسی وقت یہ ممکن تھا کہ اقلیت بھی اکثریت کی طرح

مسلم اقلیت سے کریں گے اور اسی طرح مسلمانوں کو بھی آئینی تحفظات مل جائیں گے جو ہندو پاکستان میں ہندوؤں کے لیے چاہیں گے۔ لیکن آغاز کار میں یہ تجویز خواہ کیسی ہی خوش آئند نظر آئے، مجھے یقین ہے اور تجربہ بتا دے گا کہ آگے چل کر یہ قطعاً ناکام ہوگی[1]۔ ہم صاف دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں منزل قومی ریاست کی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔ اس طرز ریاست کے جو نتائج مغرب میں نکل چکے ہیں وہی یہاں نکل کر رہیں گے۔ اقلیت کی جُداگانہ قومیت اور قومی حقوق اور مطالبوں کو نہ مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ زیادہ مدت تک برداشت کر سکے گا اور نہ ہندوؤں کا قومی اسٹیٹ۔ خصوصاً جب یہ دونوں اقلیتیں اپنی اپنی ہم قوم بیرونی ریاست کی طرف استمداد کا ہاتھ پھیلائیں گی اور اپنے ملک کی حکومت کے بجائے بیرونی حکومت سے وفاداری، دلچسپی اور محبت کی پینگیں بڑھائیں گی تو ان کا وجود ہندوستان و پاکستان دونوں کے لیے ناقابل برداشت ہو جائے گا۔ ابتدا میں خواہ کیسے ہی اطمینان بخش آئینی تحفظات دونوں نے ایک دوسرے کی اقلیتوں کو دیئے ہوں، رفتہ رفتہ عملاً ان کو ختم کر دیا جائے گا، روز مرہ کے برتاؤ میں اقلیتوں کا استیصال کرنے والی پالیسی چل پڑے گی، دونوں حکومتیں اپنی اپنی قومی اقلیتوں کی خاطر ایک دوسرے پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گی اور یہ دو طرفہ یا تو جنگ تک نوبت پہنچے گی ـــــ جس کے نتیجے کے متعلق پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی، ـــــ یا دونوں کو اس پر راضی ہونا پڑے گا کہ ایک حکومت ہندوؤں کے ساتھ اور دوسری حکومت مسلمانوں کے ساتھ جو برتاؤ چاہے کرے۔

دوسرا ذریعہ تحفظ یہ بتایا جاتا ہے کہ اقوام متحدہ کے نظام (United Nations Organisation) سے اس معاملہ میں مدد لی جا سکے گی۔ لیکن جو لوگ اس نظام کے مزاج کو کچھ بھی جانتے ہیں وہ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس ذریعہ تحفظ کے بل پر کوئی دبی ہوئی

---

[1] اپریل ۱۹۵۰ء میں پاکستان نے اس کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں لیاقت نہرو پیکٹ وجود میں آیا۔ لیکن اس سے ہندوستان کی مسلم اقلیت کا جیسا کچھ تحفظ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ (جدید)

تو کتنے دن جی سکتی ہے۔ ویسے تو اقوام متحدہ کے نظام سے فرقہ کسی ایسے ہی معاملے میں کیا جا
سکتا ہے جس میں کوئی بیرونی قوت اور نمایاں مداخلت واقع ہو گئی ہو۔ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے
معاملات تو وہ مجبوری طور پر حل کر سکتا ہی نہ ہو جائیں۔ بہرحال اس نظام میں قابل حل واقعہ
قرار نہیں پا سکتے۔ وہی بظاہر معمولی باتیں کہ جن پر بحث کیا جا سکتا ہے جو غیر معمولی
کے حالات سے بالکل بدل جاتی ہیں مگر ہمارے نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی حیات ایسی دقتوں کو
بالکل ختم کر دینے والی ہیں۔ پھر اس نظام نے اب تک تو یہ ثابت نہیں کیا ہے کہ وہ بالکل
بے لوث انصاف کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے ارکان صرف یہی نہیں دیکھتے کہ معاملہ
بجائے خود کیسا ہے اور اس میں انصاف کا تقاضا کیا ہے بلکہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شکایت
جس حکومت کے خلاف کی گئی ہے اس سے ہماری اپنی حکومتوں کے تعلقات کیسے ہیں اور آیا
اسے مجرم کر دینا ہماری حکومتوں کی مصلحت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس حالت میں کون کہہ
سکتا ہے کہ آئندہ زمانہ میں نظام اقوام متحدہ کے اندر ہندوستان اور پاکستان کی اضافی
(Relatives) پوزیشن کیا ہوگی اور کس کی بات وہاں زیادہ وزن دار ہوگی۔

تیسرا ذریعہ ہجرت اور تبادلۂ آبادی کا بیان کیا جاتا ہے۔ ہجرت کا مطلب یہ ہے کہ
مسلمان خود ہندوستان چھوڑ چھوڑ کر پاکستان میں چلے جانے شروع ہوں۔ اور تبادلۂ آبادی کا
مطلب یہ ہے کہ دونوں حکومتیں باہمی قرارداد سے ایک نظم کے ساتھ اپنی اپنی ہم قوم آبادی
کو اپنے علاقے میں منتقل کر لیں۔ ان میں سے پہلی صورت قابل عمل ہے مگر وہ ہندوستان
کے مسلمانوں کا مسئلہ حل نہ کر سکے گی۔ کیونکہ اس صورت میں وقتاً فوقتاً صرف کھاتے پیتے
لوگ یا بہت بدحواس خطر زدہ خاندان ہی بھاگ کر ہی چلے قسمت آزمائی ہی حل کر سکیں گے۔
مسلمانوں کی عام آبادی جہاں اب بس رہی ہے وہیں بستی رہے گی اور اس کا کسی بڑے
پیمانے پر خود بخود ہجرت کرنا ممکن نہ ہوگا، الا یہ کہ کسی وقت خدانخواستہ وہ حالات پیش آجائیں
جو پنجاب وغیرہ میں پیش آ گئے ہیں۔ رہی دوسری صورت، تو مجھے امید نہیں کہ آئندہ پچاس سال
تک ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں اور ڈھائی کروڑ غیر مسلموں
کو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر منتقل کرنے کا انتظام کر سکیں گی، خواہ وہ دل سے ایسا کرنا

سارے ہندوستان کے پاکستان بن جانے کے امکانات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے لیکن
اُس وقت میری موت انہیں دشمن کی موت یا ایک دیرینہ دوست کی موت محسوس ہوتی۔
اب واقعات انہیں مجبور کر کے بطور مسلمان قوم کے مقام پر کھینچ لائے ہیں۔ اب ان کے لیے
زندگی کی راہ صرف ایک ہی رہ گئی ہے اور وہ اسلام کی ـــ اصل اور حقیقی اور خالص اسلام
کی ـــ راہ ہے۔ دوسری راہیں زندگی کی نہیں بلکہ خودکشی یا سزائے موت یا طبعی وفات
کی راہیں ہیں۔

یہ وقت جس کے آنے کی میں خبر دے رہا ہوں اب بہت قریب آ گیا ہے۔ جونہی کہ ہندوستان
کی سیاست اس موجودہ دور سے ختم ہو کر نیا دور شروع ہوگا، اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کو اپنی
واقعی یاس انگیز پوزیشن کا اصل احساس شروع ہو جائے گا۔ یہ ایک بڑی تحریک کے ظہور کا
کا وقت ہوگا اور تحریک خلافت کے انجام سے کہیں زیادہ خطرناک ہوگا۔ تحریک خلافت
کی ناکامی نے مسلمانوں پر جو جمود و انتشار طاری کیا تھا، اگرچہ نہایت سخت تھا مگر مہلک
نہ تھا۔ اب اگر وہ کیفیت کہیں پھر طاری ہوئی تو قطعاً مہلک ثابت ہوگی۔ ایسے اس وقت
ملک کے رہنماؤں سے مایوس ہو کر کوئی بے رہنمائی اور کوئی خارجی امید اگر مسلمانوں نے نہ پائی
تو ان پر گھبراہٹ اور وحشت اطوار کی مسلط ہو جائے گی۔ کوئی خلیفۂ مسلمین کی طرف دوڑے گا
کوئی کمیونسٹ گروہ کی طرف پلٹے گا، کوئی ہجرت کی تیاری کرے گا، کوئی مایوسی کی حالت میں
ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے گا، اور کوئی دل برداشتگی کے عالم میں، یا محض احمقانہ جھنجھلاہٹ
کی بنا پر ہاری ہوئی قومی جنگ کو پھر برپا کر کے، صرف اپنے اوپر بلکہ اپنے ہزاروں لاکھوں
بے گناہ بھائیوں پر بھی تباہی کا طوفان اٹھا دے گا۔ اس نازک وقت کے لیے ابھی سے
ایک ایسا منظم گروہ تیار رہنا چاہیے جو ہوش میں آنے والے مسلمانوں کے سامنے بروقت
صحیح راہ عمل پیش کر سکے، ان کی ذکی بدحواس قوتوں کو غلط راہوں اور غلط کاریوں سے بچا کر
ایک روشن نصب العین کے گرد سمیٹ سکے، اور ان کو اس کے بعد حقیقی کامیابیوں کی بشارت
دے سکے۔ میری دعا ہے کہ آپ ہی کا یہ گروہ اس خدمت کے انجام دینے کی توفیق پائے
اور اس وقت کے آنے سے پہلے پہلے اس حد تک طاقتور اور منظم اور مستعد ہو جائے کہ ضرورت

انجام دے سکے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ ذرا ہندو ہندوستان کی اکثریت کے مستقبل کا بھی جائزہ لیں۔ میں آپ لوگوں سے اکثر کہتا رہا ہوں کہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کا جتنا امکان مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہے قریب قریب اتنا ہی امکان غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی ہے۔ میری اس بات کو بہت سے لوگ ایک فرضی تخیل آرائی کا نتیجہ سمجھتے ہیں، اور بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید تصوف کا کوئی نکتہ ہے جو ہم ہی کو سوجھتا ہے۔ اس لیے کہ ان کو ایک طرف تو یہ نظر آتا ہے کہ غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک مضبوط متحد اور منظم بلاک بنی ہوئی ہے۔ اس کے اندر کہیں کوئی خلل یا شگاف نہیں ہے جہاں سے اس کے ٹوٹنے کا امکان ہو۔ اس پر قوم پرستی کا نشہ پوری طرح مسلط ہے۔ ہندوستان کا پورا نظام حکومت نہایت مستحکم طریقے سے اس کے ہاتھوں میں آچکا ہے اور جو تھوڑی سی کسر باقی ہے وہ عنقریب پوری ہوئی جاتی ہے۔ اس حالت کو دیکھتے ہوئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہاں اسلامی انقلاب کا راستہ کدھر سے نکل سکے گا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ مضبوط بلاک جو آپ کے سامنے نظر آرہا ہے، اور بظاہر ٹھوس بھی محسوس ہوتا ہے، اس کی ساخت کو ذرا سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ یہ کن اجزا سے مرکب ہے اور ان کی پیوستگی کی ماہیت کیا ہے۔

ہندوستان کے ان کروڑوں غیر مسلموں کو جس چیز نے متحد اور منظم کیا ہے وہ کوئی مستقل نظریۂ حیات، کوئی مضبوط فلسفۂ زندگی اور کوئی شعوری نصب العین نہیں ہے کہ اس کا متزلزل ہونا مشکل ہو، بلکہ وہ محض ایک قوم پرستی کا جذبہ ہے جو ایک طرف اجنبی اقتدار کے خوف اور دوسری طرف مسلم قوم پرستی کے مقابلہ میں ابھر آیا تھا۔ قوم پرستی کا فطری خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف کسی مخاصم و مزاحم اور حریف طاقت ہی کے مقابلہ میں پیدا ہوا کرتی ہے، اسی کی مخالفت و مزاحمت ہی سے غذا پاتی ہے، اور جب تک وہ طاقت مقابل میں موجود ہو اسی وقت تک باقی رہتی ہے۔ جونہی کہ مزاحمت ختم ہوئی اور قوم پرستی کا مقصد حاصل ہوا یہ جذبہ آپ سے آپ سرد پڑ جاتا ہے، اور عملی زندگی کے دوسرے اہم تر مسائل لوگوں کی توجہ اپنی

طرف کھینچ لیتے ہیں اور وہ عناصر جو محض قوم پرستی کے جذبے سے باہم پیوستہ ہوئے تھے بکھرنے لگتے ہیں۔ ہندو قوم پرستی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ بھی دو پاؤں پر کھڑی ہوئی تھی ان میں سے ایک ——— یعنی انگریزی اقتدار سے نجات پانے کا جذبہ ——— ختم ہوا چاہتا ہے۔ اس کے بعد صرف دوسرا پاؤں باقی رہ جاتا ہے، یعنی مسلم قوم پرستی کے مقابلے کا جذبہ۔ جو پاکستان کے بن جانے کے بعد اس کا قائم رہنا بھی مشکل ہے۔ بشرطیکہ ہندو علاقے کی مسلمان اقلیت اپنے مسئلے کو حل کرنے کی کوئی ایسی راہ نکال لے جس سے نہ تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی و نزاع کے اسباب پیدا ہوں اور نہ ہندوستان کے اندر مسلم قوم پرستی کے دعووں اور مطالبوں کو دبانے کے لیے ہندو قوم پرستی کے مشتعل ہونے کا کوئی موقع باقی رہے۔ یہ حکمت اگر ہندو علاقے کے مسلمانوں کو حاصل ہو گئی تو پھر دیکھیے گا کہ نیشنلسٹ لیڈر اور قومی مذہبی جمعیتوں کے مبلغین سرحدی خطرے اور جنگ کا ہوا پیش کر کے ہندو قوم پرستی کو زندہ اور مشتعل رکھنے کی خواہ کتنی ہی کوشش کریں، وہ بہرحال ٹوٹ کر رہے گی اور مختلف و متضاد عناصر جن کی ترکیب سے یہ قوم پرستی بنائی گئی ہے، بکھر کر رہیں گے۔ اس لیے کہ اس ملک کے اندر خود اس کے اپنے عناصر ترکیبی کے درمیان جو تمدنی، معاشرتی بے انصافیاں، جو معاشی ناہمواریاں، جو اغراض و مفاد کی کشمکشیں، اور جو طبقاتی منافرتیں موجود ہیں، وہ بیرونی خطرات کے ہٹتے ہی اپنے آپ کو نمایاں کریں گی اور ملک کے آئندہ نظام، اختیارات کی تقسیم، حقوق کے تعین اور سماجی نظام کی تشکیل کے مسائل لازماً ان کو آپس میں پھاڑ دیں گے۔ اس تفرقے کے لیے ایسے طاقتور اور فطری اسباب موجود ہیں کہ اسے رونما ہونے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔

ہندوستان کا موجودہ سماجی نظام کچھ اس طرز پر بنا ہے کہ وہ بے شمار طبقات پر مشتمل ہے جن میں سے بعض بعض پر چڑھے ہوئے اور بعض ان سے دبے ہوئے ہیں۔ ان طبقوں کے درمیان پیدائشی برتری و پستی، اور اونچ نیچ کا تصور گہری جڑوں کے ساتھ جما ہوا ہے اور اس کو تناسخ کے فلسفے سے اور زیادہ مضبوط کر دیا گیا ہے۔ پست طبقوں کے حق میں یہ یقین پیدا کیا گیا ہے کہ وہ پستی ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور یہ ان کے پچھلے کرموں کا [illegible]

نتیجہ ہے جسے انہیں ہر حال بھگتنا ہی پڑے گا، جیسے برہمنوں کی برتری کا فلسفہ بے بنیاد ہے۔ اور
اونچے طبقوں کے حق میں یہ احساس پیدا کیا گیا ہے کہ وہ پیدائشی برتری کے مالک ہوتے ہیں۔
برتری ان کا حق ہے اور ان کے پچھلے کرموں کا نتیجہ ہے اور اس کو بدلنے کی کوشش قانونِ قدرت
کے خلاف ہے۔ اس سماجی نظام میں ہر اونچا طبقہ نیچے والے طبقے کے سر پر جوتوں سے کھڑا ہے
اور اسے دبائے ہوئے ہے۔ معاشرت کے ہر پہلو میں اونچ اور نیچ کا اظہار ہے۔ قدم قدم پر
بے شمار بے انصافیاں ہیں۔ تمدن کے ہر گوشے میں امتیاز رائج ہے، خواہ کھانے پینے کا معاملہ
ہو یا رہن سہن کا یا شادی بیاہ کا، اور اس امتیاز میں صرف تفریق ہی کا نہیں بلکہ تحقیر اور تذلیل کا
عنصر بھی شامل ہے۔ مثلاً یہ کہ اونچے طبقے اس بات کو کبھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں
ہیں کہ نیچے طبقوں کے مرد اور عورتیں ان کے سے لباس اور زیور پہنیں۔ حال ہی کی بات ہے
کہ راجپوتانہ کے گوجروں اور جاٹوں نے اس بات پر ہنگامہ برپا کر دیا تھا کہ چمار وغیرہ نیچے طبقوں
نے ـــــ جو جنگ کی وجہ سے خوشحال ہو گئے ہیں اور کچھ باہر کی ہوا بھی کھا آئے ہیں ـــــ
اپنی عورتوں کو ان کی عورتوں کے سے لباس اور زیور پہنانے شروع کر دیئے ہیں۔ باوجودیکہ
یہ جاٹ اور گوجر خود بھی اپنے ساتھ راجپوتوں کے ایسے ہی سلوک کی تلخی محسوس کرتے ہیں،
مگر پھر بھی انہوں نے اس بات کو اپنی توہین قرار دیا کہ چمار اٹھ کر معاشرت میں ان کے ہم سر
بنیں۔ چنانچہ جگہ جگہ ان کی برادری نے زور لگانا شروع کیا کہ ان غریبوں کو زبردستی
اسی پستی میں دھکیل دیں جس سے وہ اٹھنا چاہتے ہیں۔

سماجی نظام اسی ڈھنگ کے مذہبی نظام کی ترتیب پر قائم ہے اور اس کے قدیم [illegible] چلا آ رہا
پر جدید سرمایہ داری کی خصوصیات کا اور اضافہ ہو گیا ہے۔ جو طبقے قدیم اجتماعی نظریات اور مابعد
الطبیعی فلسفوں (Metaphysical Philosophies) کی مدد سے اونچی کرسیوں پر قابض ہو
چکے ہیں، انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے کہ ملک کی تمدنی زندگی میں برتری کو اپنے
لیے مخصوص کر لیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہی ملک کی دولت اور اس کے وسائل پیداوار پر بھی
قابض ہو گئے ہیں اور نیچے کی کرسیوں پر بیٹھنے والے عام انسانوں کے لیے انہوں نے زندگی بسر
کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں چھوڑی ہے کہ وہ قسمت کے ساتھ ان کی خدمت اور مزدوری

کریں۔ اس معاشی نظام میں محروم اور مفلس پیشہ طبقوں کے ساتھ جو بے انصافیاں اور زیادتیاں پائی جاتی ہیں ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔ پھر اُونچے طبقوں نے خود اپنے دائرے میں بھی ظلم و ناانصافی کی بہت سی شکلیں اختیار کر لی ہیں جن کی رو سے کم لوگ خوشحال اور زیادہ لوگ بدحال ہیں۔ مثلاً شہزادگی، ان کا مشترکہ خاندانی جائیداد کا طریقہ (Joint Family System) یا وراثت میں بڑے لڑکے کا حق (Rule of Primogeniture) جیسے طریقے اور بہت سے طریقے ایسے ہیں جو دولت اور اس کے ذرائع کو سمیٹ کر چند لوگوں کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں اور بہت سوں کو محروم اور دست نگر بنا دیتے ہیں۔ انہی طریقوں سے جن ہاتھوں میں دولت سمٹ جاتی ہے وہ سرمایہ داری کے تمام اختیارات کے ذریعے صنعت، تجارت اور املاک پر مسلط ہوتے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔

اب جو سیاسی نظام بنایا جا رہا ہے اس کی تصنیف میں لفظ بڑے جوش سے جمہوریت، اجتماعی انصاف (Social Justice) مساوات اور مواقع کی یکسانی (Equality of Opportunities) کے بڑے شاندار الفاظ بہت خوبی اور دلکش زبان میں درج کیے جا رہے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان الفاظ کی اصل قیمت ان کے لفظوں میں نہیں ان کے عملدرآمد میں ہے۔ ہم کو جو کچھ دیکھنا ہے وہ یہ ہے کہ اس سیاسی نظام کی تشکیل، تعمیر اور تنظیم کے لیے مسلم لیگ کے وہی طبقے آگے ہیں جو سماجی اور معاشی نظام کی اوپر والی سیڑھیوں پر تشریف فرما ہیں ——— نہیں بلکہ چھائے ہوئے ہیں ——— اور تجربے نے ہمیں بتا دیا ہے کہ ان طبقوں نے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی سیاسی قوت اور ذرائع کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ اس لیے کم سے کم اب تک بھی ہندوستان کو بہت کچھ تجربہ ہو چکا ہے اور آئندہ بھی اسے دیکھتے ہوئے مشکل سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ لوگ اپنی سیاسی طاقت کو معاشی انصاف قائم کرنے میں استعمال کریں گے۔

یہ حالات اپنے اندر اتنی تفصیل رکھتے ہیں جنہیں ملک کی عام آبادی شدت کے ساتھ محسوس کر رہی ہے۔ اب تک قوم پرستی کے نشے نے اس احساس کو کسی حد تک دبا رکھا تھا، اور لوگ اس امید پر چپ بیٹھے تھے کہ ملک کا انتظام جب ہمارے ہاتھ میں ہوگا

تو یہ بے انصافیاں ختم ہو جائیں گی۔ جب انتظام کے اختیارات جب نئی امراج اہل ملک کی طرف
منتقل ہو جائیں گے تو یہ سوال زیادہ اہمیت حاصل کر لے گا کہ ان اختیارات کو کس طرح استعمال
کیا جائے جس سے ملک میں حقیقی مساوات قائم ہو۔ ہندوستان کے مستقبل کی باگیں اس وقت
ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جو ہندو کلچر کی پرانی روایات کے ساتھ مغربی یورپ اور امریکہ کے
طریق زندگی اور کچھ مرغوب اجزاء ملانا چاہتے ہیں۔ یہ بڑا فائدہ اگرچہ ہے کہ اس طرح سے وہ
ایک نمائشی جمہوریت، ایک ظاہری مساوات اور ایک فرضی عدل قائم کرنے میں تو غالباً کامیاب
ہو جائیں گے مگر اس کی تہہ میں بدستور وہی بے انصافیاں، وہی نابرابریاں اور وہی تفریقیں برقرار
رہیں گی جو اس وقت پائی جاتی ہیں۔ کیونکہ تفریق و امتیاز ہندو کلچر کی رگ رگ میں پیوست ہے جس
کے ہوتے کسی حقیقی جمہوریت کا قیام غیر ممکن ہے۔ اور اس کے ساتھ مغربی نظریات کا جوڑ لگنے
سے اس کے سوا کچھ حاصل ہونے کی امید نہیں کی جا سکتی کہ اونچے طبقوں کی برتری سرمایہ داری
کی ایجنسیوں اور دولت کے ذریعہ سے مضبوط تر ہو جائے۔ اس لیے یہ امر قریب قریب یقینی
نظر آتا ہے کہ یہ لوگ بہت جلدی ہندوستان کی عام آبادی کو مایوس کر دیں گے۔ ان کے ہاتھوں
انصاف قائم نہ ہو سکے گا اور کچھ زیادہ دیر نہ لگنے پائے گی کہ ہندوستانی عوام کسان، مزدور،
اور نیچے طبقے کے محروم لوگ کسی دوسرے منصفانہ نظام کی طلب میں بے چین ہونے
لگیں گے۔

اشتراکیت اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ جونہی کہ ہندوستان آزادی
اپنے منتہا کو پہنچنے کے بعد مکمل ہو چکی اور اس کی سیاسی شکل اور اس کا نظام واضح ہو، اس کے شگافوں
میں سے اپنا راستہ نکالنے کی کوشش کرے گی اور یہاں کے باشندوں کو انصاف کی امیدیں دلا کر
سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہے گی۔ مگر اشتراکیت کے پاس ان بے انصافیوں کو ختم کرنے
کے لیے کوئی ایسا پروگرام نہیں ہے جو خود ظلم سے، بے انصافی سے، کشت و خون اور
فتنہ و فساد کی جنگ جاری رکھنے سے پاک ہو۔ یہ ہندوستان کو ہمیشہ فرقہ وارانہ منافرت
اور نزاع کی جگہ طبقہ وارانہ منافرت اور نزاع کا شکار بنائے گا۔ اب تک جہاں ہندو اور مسلمان
کے جھگڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے کے سر پھاڑتے اور گھر جلاتے رہے ہیں وہاں اب

مذہب کے جھگڑے کی بنا پر وہی کشت و خون کرنے لگیں گے، ایک طبقہ دوسرے طبقے کے خلاف اسی طرح نفرت اور غصے سے بھڑک اٹھے گا جس طرح آج ایک فرقہ دوسرے فرقے کے خلاف بھڑک اٹھتا ہے۔ فرقہ پرستی اور قوم پرستی کی جگہ طبقاتی منافرت پرستاری سے جنگ اور انصاف کے حقیقی بنیادی اصول جس طرح آج قومی جنگ کے زمانے میں ناکام ہیں، اسی طرح اس وقت طبقاتی جنگ کے زمانے میں بھی ناکام ہوں گے۔ برسر اقتدار طبقے محروم طبقوں کو محروم رکھنے کے لیے ڈٹ جائیں گے، اور محروم طبقے ان کی جگہ لے کر انہیں محروم کر دینے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیں گے۔ اس طرح ہندوستان یا پاکستان ملک اس کی مسلسل آماجگاہ رہے گا، اور آخرکار اگر بفرض محال اشتراکی انقلاب کامیاب ہو گیا تو یہ ایک طویل مدت تک یہاں روس کی طرح اونچے طبقوں کو ان کی زمینوں، جائدادوں اور کارخانوں سے بے دخل کرنے کے لیے سخت کشت و خون اور ظلم و جبر کا بازار گرم رہے گا۔ پھر اشتراکی نظام قائم ہو جانے کے بعد ویسی ہی ڈکٹیٹرشپ یہاں بھی قائم ہو گی جیسی روس میں ہے۔ اسی طرح ملک کی پوری آبادی کو ایک جابرانہ اور ہمہ گیر (Totalitarian) اقتدار کے شکنجے میں کس دیا جائے گا، اسی طرح لوگ زبان اور قلم و ضمیر کی آزادی سے محروم ہو جائیں گے، اسی طرح تمام ذرائع کا اقتدار چند لوگوں کے ہاتھوں میں آ جائے گا، اور اسی طرح بندگان خدا کو اتنی آزادی بھی حاصل نہ رہے گی کہ اس نظام کی سختیوں سے دل برداشتہ ہوں تو کچھ چیخ پکار کریں، یا اس حالت کو بدلنے کے لیے کوئی سیاسی تنظیم اور اجتماعی کوشش کر سکیں ——— اور ان سب سے بڑھ کر اس اشتراکی انقلاب سے جو نقصان ہندوستان کو پہنچے گا وہ یہ ہے کہ پچھلی صدیوں کے انحطاط کے باوجود جو تھوڑی بہت روحانی اور اخلاقی قدریں ہندوستان کی تہذیب میں باقی ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی اور یہ ملک سراسر ایک مادہ پرست ملک بن کر رہ جائے گا۔

اس تمام سے اگر کوئی چیز ہندوستان کو بچا سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ اگر وہ ایک ایسے نظام فکر و عمل کو لے کر اٹھے جس میں کامل درجے کی اور حقیقی روحانی و اخلاقی قدریں بھی ہوں، مساوات اور سب لوگوں کو اجتماعی انصاف بھی ہو، کامل جمہوریت ——— محض سیاسی ہی نہیں بلکہ تمدنی و معاشی جمہوریت (Social Democracy) ——— بھی ہو اور تمام

باشندگانِ ملک سے بے پروا امتیازِ مذہب و نسل خود وہی ہندوستانی حیثیت سے حقوق کے یکساں
حامل بھی ہوں۔ جو ایک یا چند طبقوں کے مفاد کو نہیں بلکہ سب طبقوں کے مفاد کو یکساں ہمدردی
اور انصاف کی نظر سے دیکھے، کسی کا حامی اور کسی کا دشمن نہ ہو، طبقوں اور گروہوں کو ایک دوسرے
کے خلاف اکسانے اور لڑانے کے بجائے ایک مبنی بر انصاف نظامِ زندگی پر انہیں متحد کرے،
محروم طبقوں کو وہ کچھ دلوائے جو ان کا فطری حق ہے اور اونچے طبقوں سے صرف وہی کچھ لے
جو ان کے پاس ان کے فطری حق سے زائد ہے۔ ایسے ایک نظام کو اگر ملک کے لوگوں کے
سامنے پیش کیا جائے اور اس کو پیش کرنے والے وہ لوگ ہوں جن کی سیرت اور اخلاق پر اعتماد
کیا جاسکے، جو خود کسی قسم کی گروہی یا طبقاتی یا ذاتی خود غرضی میں مبتلا نہ ہوں، جن کی اپنی زندگیاں اس
بات پر گواہ ہوں کہ درحقیقت انہی سے عدل و انصاف کی اُمید وابستہ کی جا سکتی ہے، اور جن میں
دیانت اور انتظامِ دنیا کی صلاحیت دونوں جمع ہوں، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندوستان
کے باشندے اس نظام کے مقابلہ میں اشتراکی انقلاب کے راستے کو ترجیح دیں۔ اشتراکی انقلاب
تو ایک آپریشن ہے جو مرض کے ساتھ تندرستی کے بھی ایک بڑے حصے کا استیصال کر دیتا
ہے، اور انسان اسے صرف انتہائی مجبوری کی حالت ہی میں گوارا کیا کرتا ہے جب دوا سے
مرض کی اصلاح ہو سکنے کی کوئی اُمید باقی نہ رہے۔ دنیا میں جہاں بھی کسی ملک کے لوگوں نے
اس آپریشن کے طریقے کو اختیار کیا ہے اسی وجہ سے کیا ہے کہ ان کے سامنے نظامِ سرمایہ داری
اور اشتراکیت کے درمیان کوئی ایسا تیسرا راستہ تھا ہی نہیں جس میں وہ ان دونوں کی خرابیوں سے
بچ کر انصاف پالینے کی اُمید کر سکتے۔ مگر اس قسم کا تیسرا راستہ پیش کر دیا جائے ——
جیسا کہ پیش کرنے کا حق ہے —— تو نہ ہندوستان کے لوگ ایسے پاگل ہیں اور نہ دنیا
کے دوسرے ملکوں کی آبادی ہی کو اس قدر دیوانہ فرض کرنے کی کوئی وجہ ہے کہ وہ بیک لوگ دوا
کو آزمانے کے بجائے خواہ مخواہ آپریشن ہی پر اصرار کریں۔

سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان یہ تیسرا راستہ پیش کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر پیش کر سکتے
ہیں اور اس تیسرے راستے کا نام اسلام ہی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مستقبل کے
ہندوستان میں اشتراکیت کے بالمقابل اسلام کے لیے کامیابی کے کم از کم ۹۰ فی صدی امکانات

اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں اسلام سے علم و واقفیت بھی پیدا کریں اور ان کے اندر یہ
جذبہ بھی ابھاردیں کہ اجتماعی زندگی میں ان کا ہر جگہ غیر مسلموں سے جو سابقہ پیش آتا ہے
اس میں وہ حسب موقع ان کے سامنے اسلام کو پیش کرتے رہیں، تو وہ اشاعت کی رفتار اتنی تیز
ہو سکتی ہے کہ ہندوستان میں کوئی دوسری تحریک اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں
مسلمانوں کی تعداد چار پانچ کروڑ کے قریب ہے۔ اس تعداد کا بیسواں حصہ بھی اگر اسلام کو
جانتا ہو اور اس کی تبلیغ شروع کر دے، تو اسلام کے مبلغوں کی تعداد ۲۰، ۲۵ لاکھ کے
لگ بھگ ہوگی۔ کیا کوئی دوسری تحریک ایسی موجود ہے جس کے پاس اتنے مبلغ ہوں؟
پھر مسلمان ہندوستان کی آبادی میں کھچڑی کی طرح غیر مسلموں کے ساتھ ملے جلے ہیں اور
زندگی کے ہر شعبے میں ہر جگہ ہر وقت انہیں دوسروں تک اپنے خیالات پہنچانے اور
اپنے رنگ کا اثر ڈالنے کا موقع ملتا ہے۔ کیا کسی دوسری تحریک کو یہ مواقع حاصل ہیں؟
پھر دوسری کسی تحریک کے پاس اپنا کوئی مستقل معاشی اور اپنا کوئی تمدنی نظام نہیں ہے۔ ان کے
دامن میں پناہ لے کر ہندوستان کے بسنے والے اور دبے ہوئے طبقے کچھ اپنے پیٹ کے
مطالبے تو پورے کر سکتے ہیں مگر اپنی معاشرتی زندگی کی مشکلات اور خرابیاں دور نہیں کر
سکتے۔ بخلاف اس کے مسلمان اپنی ایک مستقل معاشرتی ہستی رکھتے ہیں جو اگر ٹھیک ٹھیک انہیں
کے مطابق پوری طرح اسلامی ہو جائے تو تمام ان لوگوں کے لیے پوری پناہ گاہ بن سکتی ہے
جنہیں معاشرتی زندگی میں پست حال کر دیا گیا ہے، یا جن کو ہندی نظام تمدن و معاشرت کی
دوسری خرابیوں نے پریشان کر دیا ہے۔

(۳) تیسرا ضروری کام یہ ہے کہ ہم اس ملک کے مسلمانوں کی ذہنی طاقت کا زیادہ سے
زیادہ حصہ اپنی اس دعوت کے لیے فراہم کریں اور اس سے باقاعدگی کے ساتھ کام لیں۔ ہندوستانی
مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ اپنے ان مقاصد میں ناکام ہو چکا ہے جن پر اس نے اب تک نظر جما
رکھی تھی۔ اس ناکامی کا شعور حاصل ہوتے ہی اس پر اس قدر مایوسی طاری ہونے لگی ہے۔ اس
موقع پر اگر اس کے سامنے ایک روشن نصب العین امیدوں اور بشارتوں کے ساتھ آئے
تو وہ ان کے ایک بڑے حصے کی توجہات اپنی طرف کھینچ لے گا۔ اس طرح جیسے جیسے ہماری

دعوت کو طاقت حاصل ہوتی جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ذہین تر افراد کو ان کاموں پر لگایا جائے جو
اسلامی مقاصد کو تربیت دے سکیں۔ ہم مسلمانوں کی اخبار نویسی کے موجودہ رجحانات کو
بالکل بدل دینا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ بہتر قسم کے اہل قلم اب انگریزی، اردو اور
دوسری زبانوں میں اخبارات جاری کریں اور ان میں حقوق کی چیخ پکار، جماعتوں کے لئے بھدی
مناسبت پر شور و غل اور گلیوں میں جھگڑے پیدا کرنے کے بجائے رائج الوقت نظام پر
اصولی تنقید کریں، اس کی خامیوں کا ایک ایک پہلو نمایاں کر کے پبلک کو دکھائیں اور اس سے بہتر ایک
نظام زندگی پیش کر کے رائے عام کو اس کے حق میں ہموار کریں۔ اسی طرح ہم چاہتے ہیں کہ
ہمارے نوجوان ادیب ادب نشاط کا پیشہ چھوڑ کر اپنی ادبی قابلیتوں کو ایک اسلامی ادب کی
تعمیری ادب پیدا کرنے میں صرف کریں جو خفتہ روح کے شعور کو بیدار کرے، اور دلوں میں
ایک صالح نظام کے لیے تڑپ پیدا کر دے۔ پھر جن لوگوں کو خدا نے زیادہ بلند درجہ کی
ذہنی صلاحیتیں دی ہیں، ان کو ہم دنیا کی ذہنی امامت کا راستہ دکھانا چاہتے ہیں اور وہ یہ
ہے کہ وہ حضرات قرآن کی مشعل ہاتھ میں لے کر علم کے ہر گوشے اور مسائل حیات کے ہر پہلو
کا جائزہ لیں اور تحقیق و کاوش کے ساتھ اسلامی نظام زندگی کی پوری تصویر دنیا کے سامنے پیش
کریں جس سے دیکھ کر لوگ بآسانی یہ معلوم کر سکیں کہ اگر دنیا کا انتظام اس نظام کے مطابق ہو
تو اس کی تفصیلی صورت کیا ہوگی۔ ان سب کے علاوہ اسی اہل دماغ طبقہ میں سے وہ لوگ
بھی نکل سکتے ہیں جو لیڈرشپ کی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ اسلامی دعوت کو ایک عمومی تحریک
بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کو اس کی رہنمائی کا منصب سنبھالنے کے لیے تیار
کیا جائے۔

(۴) چوتھا ضروری کام یہ ہے کہ جماعت کے سب ارکان اور وہ تمام لوگ جو ہماری تحریک
سے متاثر ہیں، ہندوستان کی مقامی زبانوں کو سیکھیں اور ان میں تحریر و تقریر کی قابلیت
بہم پہنچائیں جو عام تعلیم اور لٹریچر کی زبانیں بننے والی ہیں۔ نیز اس امر کی انتہائی کوشش
کریں کہ ان زبانوں میں جلدی سے جلدی اسلام کا ضروری لٹریچر منتقل کر دیا جائے۔ جنوبی ہند میں
تامل، تلگو، کنڑی، ملیالم اور مرہٹی، مغربی ہند میں گجراتی، مشرقی ہند میں بنگالی اور اڑیا، ہندوستان

والے اِن کی مدد کریں گے اور اسلامیت اور اسلامی غیرت بالکل ہی رنگ محسوس نہ ہو سکے گی۔ اور آپ دیکھیں گے کہ آپ کے گرد و پیش بیشتر مسلمان اپنی دنیوی نجات کی خاطر اس شور و پکار پر آمادہ ہو جائیں گے۔ آپ کے دوسری جانب جمہوریت، وطنیت کا جھنڈا بلند ہوگا اور اس کے سایہ میں ایک دوسری جنت شداد کا خیالی نقشہ پیش کیا جائے گا جس کے عاشقوں کو تعلیم دی جائے گی کہ خدا پرستی اور دیانت اور اخلاق سے اپنے دلوں کو خالی کر لیں۔ آپ کی آنکھیں یہ بھی دیکھیں گی کہ دنیا کے بڑے بڑے مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ایک جم غفیر اس کی طرف دوڑا چلا جا رہا ہوگا۔ ان دو جھوٹی جنتوں کے درمیان آپ اپنے آپ کو ایسے مقام پر کھڑا پائیں گے جہاں اسلام پر چلنے والوں اور اس کے لیے کام کرنے والوں کو ترقی و خوشحالی کے دروازے بند ملیں گے اور امن کی شکل ہی سے میسر آئے گا۔ ان کو ہر قدم پر سخت مشکل حالات سے سابقہ پیش آئے گا۔ ان کی غیرت اسلامی اور حمیت ایمانی کو ہر وقت چیلنج ملیں گے۔ شعائر اسلامی کو وہ روز مٹتے دیکھیں گے بلکہ ان کی تضحیک و اہانت ہوگی اور عجب نہیں کہ مسلمانوں کے اپنے ہاتھوں ہو۔ ان حالات میں صرف وہی لوگ اسلامی انقلاب کے لیے کام کر سکیں گے جو غیر معمولی صبر و ثبات، انتہائی سرگرمی، اور غایت درجہ کی حکمت و دانشمندی سے بہرہ ور ہوں۔ یہ تینوں خصوصیات اگر آپ اپنے اندر پیدا کر لیں گے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان شاء اللہ ہندوستان کا رخ پھیر دینے میں بہت زیادہ دیر نہ لگے گی۔

(ترجمان القرآن - جون ۱۹۴۷ء)

صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں جماعت اسلامی کا مسلک

سوال: جیسا کہ آپ کو معلوم ہے صوبہ سرحد میں اس سوال پر ریفرنڈم ہو رہا ہے کہ اس صوبے کو تقسیم ہند کے بعد آیا ہندوستان کے ساتھ شامل کرنا چاہیے یا پاکستان کے ساتھ؟ وہ لوگ جو جماعت اسلامی پر اعتماد رکھتے ہیں یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس استصواب میں رائے دینی چاہیے؟ اور کس طرف سے رائے دینی چاہیے؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس استصواب میں بھی ہم کو بھی اسی طرح غیر جانب دار رہنا چاہیے جیسی پالیسی [illegible] کے متعلق اختیار کی گئی ہے اور ہم پاکستان کے حق میں اگر ووٹ دیں گے تو [illegible] آپ سے کہ اس نظام حکومت کے حق میں بھی ووٹ دیں گے جس پر پاکستان قائم ہو رہا ہے؟

جواب: استصواب رائے کا معاملہ اسمبلی کی ممبری کے انتخابات کے معاملے سے مختلف ہے۔ استصواب رائے صرف اس امر سے متعلق ہے کہ تم کس ملک سے وابستہ رہنا چاہتے ہو، ہندوستان سے یا پاکستان سے؟ اس معاملے میں رائے دینا بالکل جائز ہے اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ لہٰذا جن علاقوں میں استصواب رائے کیا جا رہا ہے وہاں کے ارکان جماعت اسلامی کو اجازت ہے کہ اس میں رائے دیں۔

رہا یہ سوال کہ کس چیز کے حق میں رائے دیں تو اس معاملے میں جماعت کی طرف سے کوئی

تقسیمِ ہند کے حالات پر تبصرہ

پچھلے سال ہندی ملکوں نے جو ہر جانب انقلاب دیکھا ہے اس نے تمام کلی انقلابات کو ماند کر دیا ہے جو اس سے پہلے دورِ حاضر میں اس ملک میں بلکہ دنیا کے کسی ملک میں پیش آئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسانی آبادیوں کا اخراج اس سے پہلے کہیں اس سے بھی زیادہ وسیع رقبوں میں ہوا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے پہلے کبھی اس سے زیادہ بڑی آبادیاں اپنے گھر بار اور وطنوں سے محروم کر دی گئی ہوں۔ مگر شاید اس سے پہلے کبھی اور کہیں انسان نے انسان کے ساتھ اتنے بڑے پیمانہ پر ایسی وحشت، درندگی اور ایسی بے شرمانہ بہیمیت کا برتاؤ نہیں کیا ہے۔ قوموں میں دشمنیاں بھی ہوتی ہیں، ملکوں میں خونریز جنگیں بھی ہو چکی ہیں، لیکن غالباً کبھی دنیا کی دو قوموں کے درمیان عداوت نے یہ شدت، یہ تلخی اور یہ تُندی اختیار نہیں کی ہے۔ انسان انسان سے باہم لڑا ہے۔ مگر حال ہی میں جس کمینہ پن اور بدمعاشی کا مظاہرہ یہاں ہوا ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ یہاں انسان صورت جانوروں نے وہ وہ کام کیے ہیں کہ اگر کتوں اور بھیڑیوں پر ان کا الزام تھوپ دیا جائے تو وہ بھی اسے اپنی توہین محسوس کریں۔ اور یہ کرتوت چند گنے چنے بدمعاشوں کے نہیں تھے بلکہ پوری پوری قوموں نے اپنے آپ کو بدمعاش ثابت کیا۔

ہندی ملک سے مراد وہ ہندوستان ہے جو تقسیم کے وقت تک ایک ملک تھا۔ (مترجم)

باقاعدہ کوششیں بے کار بن گئیں، بڑے بڑے لیڈروں اور قوموں اور وزیروں نے معاشی
کی اسکیم سوچی اور حکومتوں کے پیسے نظم و نسق نے اپنے مجسٹریٹوں اور اپنی پولیس اور
اپنی فوج کے ذریعہ سے اس اسکیم کو عمل جامہ پہنایا۔ دو سال پہلے ملک میں اندازہ نہیں تھا کہ
جس ملک میں ہم رہتے ہیں اس کی آبادی کا اخلاقی تنزل اس انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ نفیس
لباسوں، اعلیٰ ڈگریوں، اور بڑے عہدوں کے پردے میں جو شخصیتیں چھپی ہوئی تھیں ان کو ہم
شرفاء میں شمار کرتے تھے۔ عام آبادی کے پُرامن رویے کو دیکھ کر ہم سمجھتے تھے کہ یہ بھلے
انسانوں کی بستیاں ہیں۔ مگر اس سال کے واقعات نے اس ساری ملمع کاری کا پردہ چاک کر دیا۔
معلوم ہوا کہ پہلے جو کچھ ہم دیکھ رہے تھے وہ محض انگریزی کی سنگین کا کرشمہ تھا۔ اس سنگین کے
ہٹتے ہی یہ حقیقت کھل گئی کہ یہ ملک وحشی، بدمعاش ڈاکوؤں، لٹیروں، اٹھائی گیروں، زانیوں اور
سنگدل سفّاک قاتلوں سے بھرا ہوا تھا۔

کیا یہ سب کچھ جو واقع ہوا محض ایک اتفاقی حادثہ تھا؟ جو لوگ پچھلے تیس سال سے اس
ملک کی رہنمائی کر رہے ہیں، وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے ہیں یا انقلاب رونما ہوا ہے، اور ایسا ہی
کچھ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اس تمام ظلم کے سبب کی بحث کو بالکل ہی
ٹالنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کی ایک شاعرانہ توجیہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ کشت و خون
اور ظلم و ستم کا یہ مظاہرہ کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے جس پر کچھ فکر مند ہونے کی ضرورت ہو، یہ تو
ایک آزاد قوم کی ولادت کے درد ہیں جو ایسے موقع پر ہوا ہی کرتے ہیں[1]۔ حالانکہ اگر یہ ولادت
کے درد ہی تھے تو یہ دنیا کو ایک منصوبے کی پیدائش کی خوشخبری دے رہے تھے، نہ کسی
انسان کے تولد کی۔ انہوں نے دنیا کو جو اطلاع دی وہ اس بات کی نہ تھی کہ کچھ انسان ہیں جن کا
بندِ میری ٹوٹا ہے، بلکہ اصل میں یہ اس بات کی اطلاع تھی کہ کچھ بھیڑیے تھے جن کا پنجرہ
کھل گیا ہے۔ اس کے بعد فطرۃً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستان کے باشندے اپنی فطرت

---

[1] یہ پنڈت جواہر لال نہرو تھے جنہوں نے اس کے لیے (Birth Pangs) کے الفاظ
استعمال کیے تھے۔ (جدید)

اور اپنے مزاج ہی کے لحاظ سے کیجئے۔ بدمعاش اور سفاک میں یہاں ان کو جیسا بتایا گیا ہے، ویسا
ہی ثابت کرنے کے لیے اس سے زیادہ قوی ثبوت کی ضرورت ہے جو پچھلے دو سال کے
واقعات نے فراہم کیا ہے۔ مگر ہندوستانیوں کی پچھلی سینکڑوں برس کی تاریخ موجود ہے۔
اپنے ماضی میں یہ ہوں سے کب ایسی ذلیل صفات کا مظاہرہ کیا تھا؟ پھر اگر یہ الزام ثابت نہیں
ہے تو یقیناً دوسرا الزام اپنے آپ ثابت ہے، یعنی یہ کہ ہمارے ملک کی آبادی کو
اس اخلاقی پستی کے گڑھے میں گرایا گیا ہے۔ یہی وہ نتیجہ ہے جس سے بچنے کے لیے پچھلے
دو سال کے واقعات کے اسباب کی بحث کو باتوں میں اڑانے کی کوشش کی جاتی ہے، کیونکہ
یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنھوں نے پچھلی ربع صدی میں اس ملک
کی سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔

ہندوستان میں سیاسی بیداری کی ابتدا مغربی تعلیم و تہذیب کے ذریعہ سے ہوئی۔ اس
تعلیم اور تہذیب نے دو تحفے ہمارے ملک کے اہل دماغوں اور رہنماؤں کے ہاتھوں کو دیے۔
ایک، قومیت کا احساس اور قوم پرستی کا جذبہ۔ دوسرے مادہ پرستانہ اخلاق۔

پہلی چیز کو لے کر یہاں کے سیاسی لیڈروں نے "ہندوستانی قومیت" کا ایک مصنوعی
تخیل پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر چونکہ اس کے لیے کوئی حقیقی بنیاد موجود نہ تھی اس لیے
قومیت کی اس ہیئت کو بیدار کرنے کی جتنی کوششیں کی گئیں ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے مختلف گروہوں
میں جداگانہ قومیتوں کا شعور بیدار ہو گیا جو فی الحقیقت اپنے اندر قومیت کے فطری عناصر
رکھتے تھے۔ اس طرح چالیس پچاس سال کی تبلیغ قومیت نے اس ملک میں ایک کے بجائے
بہت سی چھوٹی بڑی قومیتیں پیدا کر دیں، جن میں سے تین —— یعنی ہندو قومیت،
مسلم قومیت اور سکھ قومیت —— تو پوری طرح ابھر کر اپنا کھیل کھیل چکی ہیں، اور باقی
بہت سی علاقائی اور لسانی قومیتیں ابھی اندر ہی اندر تشکیل میں ہیں۔ پھر سیاسی اختیارات حاصل
کرنے کے لیے برطانوی اقتدار کے خلاف جو جدوجہد ہو رہی تھی، اس کا قدم جتنا جتنا آگے
بڑھتا گیا، ان مختلف قومیتوں کے درمیان آپس کی کشمکش اتنی ہی تیز تر اور تلخ تر ہوتی چلی گئی۔
اس کشمکش نے ان میں سے ہر ایک کے اندر قوم پرستی کا جذبہ بھڑکا دیا، اور ایک کی لڑائی

دوسرے کے قومی حصوں کی مزاحمت جتنی بڑھی اتنی ہی قومی عداوت ان کے درمیان بڑھتی چلی گئی۔

دوسری طرف منفعت پرستانہ اخلاق کا جو سبق مغربی تعلیم و تہذیب سے پایا گیا تھا وہ پھیلنے والے گھُن کے زہر کی طرح سارے ملک کی رگ رگ میں پھیل گیا۔ اس نے دلوں کو خدا ترسی اور حق شناسی سے خالی کر دیا، شرافت اور انسانیت کی جڑیں ہلا دیں، اور ان تمام اخلاقی قدروں کو ختم کر دیا جو اس ملک کے لوگوں نے اپنے قدیم مذہبوں سے پائی تھیں۔ یہ اسی نئے اخلاق ہی کا کرشمہ تھا کہ پچھلے پچیس سال میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی قومی کشمکش روز بروز زیادہ سے زیادہ رذالت کے راستوں پر بڑھتی چلی گئی۔ بڑے بڑے لیڈروں نے بے حیائی کے ساتھ ایمان نکال کر قومی خود غرضیوں کے تقاضے پورے کیے۔ بڑی بڑی ذمہ دار سیاسی جماعتوں نے حق اور انصاف سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ کیے۔ ملک بھر کے اخبارات نے انتہائی بے شرمی کے ساتھ جھوٹے پروپیگنڈے کیے، عوام کو پیہم اشتعال دیا، اور نفرت و عداوت کی شراب پلا پلا کر اپنی اپنی قوموں کو بدمست کر دیا۔ پھر دونوں جانب کے گروہوں کے لوگوں نے سرکاری محکموں میں، تجارتوں اور صنعتوں میں اور زندگی کے ہر کاروبار میں ایک دوسرے کے خلاف کھلم کھلا بے انصافیاں اور حق تلفیاں کیں اور ہر اس بے ایمانی کو چٹخارے لے لے کر نیکی اور کار ثواب بنایا جو حریف قوم کے کسی فرد کے ساتھ کی جائے۔ واقعات کی یہ رفتار صاف بتا رہی تھی کہ اس ملک کا اخلاقی زوال کس پستی کی طرف بہا چلا جا رہا ہے۔

یہی وہ اسباب ہیں جنہوں نے ان ہولناک نتائج کو پیدا کیا جو ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری سے وہ لوگ بری نہیں ہو سکتے جو اس دور میں یہاں کی مختلف قوموں کے رہنما اور سربراہ کار رہے ہیں۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک طرف اپنی اپنی قوم کے لوگوں میں قومی خواہشات برانگیختہ کیں اور دوسری طرف قومی اخلاق کو سنبھالنے کے لیے کچھ نہ کیا۔ بلکہ جس جس نے بگاڑا اور بگڑنے میں حصہ لیا اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اگر یہ اس کھیل کے نتائج سے بے خبر تھے تو سخت اناڑی تھے، ایسے اناڑی

اور انتقالِ اختیارات کا جو منصوبہ ماؤنٹ بیٹن نے اختیار کیا اس کو دیکھ کر ایک معمولی
عقل و بصیرت رکھنے والا آدمی بھی یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس سے ملک کے ایک وسیع علاقے
میں سخت خونریزی ہو کر رہے گی۔ صاف اگر یہ ماؤنٹ بیٹن کا اناڑی پن تھا اور کوئی دانستہ
چالاکی نہ تھی جس سے اس کی قوم کی رضامندی حاصل ہوتی، تو جو ہولناک نتائج اس سے برآمد ہوئے
انہیں دیکھ لینے کے بعد، بجائے اس کے کہ اس شخص پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے جاتے،
اس پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ ہونی چاہیے تھی اور دسیوں انسانوں کے قتل اور ایک کروڑ
سے زیادہ انسانوں کی خانہ بربادی کے جرم میں اس پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جانا چاہیے
تھا۔ لیکن اس کی سیاست دانی کی جو داد انگلستان میں دی گئی وہ اس بات کا صریح ثبوت ہے
کہ یہ سب کچھ دانستہ کیا گیا تھا اور اسے پوری انگریزی قوم کی رضامندی حاصل تھی۔ تو یہ ایسی چالاکی
کا ثمرہ ہے کہ ہندو اور مسلمان اور سکھ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں، اور وہ انگریز
جو کل تک تینوں پر یکساں ظلم کر رہا تھا، تینوں کا مشترک دوست ہے۔ مسلمان کے لیے ہندوستان
کی، اور ہندو اور سکھ کے لیے پاکستان کی زمین تنگ ہے، مگر انگریز کے لیے ہر جگہ فراخی ہی
فراخی ہے۔ انسانیت کے نقطۂ نظر سے آپ چاہے اس کو کتنا ہی بڑا جرم قرار دے لیں، انگریز
کی قومی خود غرضی کے لحاظ سے یہ بالیقین ایک کامیاب ترین سیاسی چال تھی۔ مگر یہ فیصلہ کرنا
مشکل ہے کہ اس پر داد یا ماتم کا حق کس کو ہے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، یا ہندوستان کے وہ
سیاسی لیڈر جو تقسیم کے اس نقشے کی ساخت اور تکمیل میں ہر مرحلے پر اس کے شریک کار رہے؟

اس ڈرامے کی دوسری ادا کار کانگریس تھی اور اس نے جو پارٹ ادا کیا وہ احمقوں کے
سوا کسی سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ تقسیم ہند سے دو تین برس پہلے ہی یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی
کہ اب تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس کے سب راستے کھلے ہوئے تھے۔ ایک راستہ یہ
تھا کہ کانگریس جھگڑے کے بڑھنے سے پہلے ہی اس چیز کو سیدھی طرح قبول کر لیتی تاکہ یہ ہم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۵ سے) افراتفری کے عالم میں برادر کشی و خونریزی سے محفوظ رہ کر بخیریت منتقل ہو
جائے۔ (مجیب)

وکچھ کیا ہے وہ مسٹر جناح کے الزام کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ انہوں نے خود ہی پٹھانوں پر
سے اس بارے کوئی [illegible] چھپایا ہے جسے مسٹر جناح منافقت کا مظاہرہ کہتے تھے۔

کانگریس کے مخالفین کہتے تھے کہ جس سوراج کو کانگریس قائم کرنا چاہتی ہے وہ دراصل ہندو راج ہوگا جس میں مسلمانوں کے لیے کوئی آزادی نہ ہوگی۔ اسی اندیشے پر تقسیم ملک کی تجویز مبنی تھی اور اسی خطرے کی بنا پر مسلمانوں کی عظیم اکثریت اس تحریک آزادی کو مشتبہ نظروں سے دیکھتی تھی جس کی علمبرداری کا شرف کانگریس کو حاصل تھا۔ کانگریسی لیڈر ہمیشہ مسلمانوں کے ان اندیشوں اور خطرات کو بے بنیاد قرار دیتے رہے۔ مگر ۱۵ اگست کے بعد جو کچھ ہندوستان میں ہوا اور اب تک ہو رہا ہے اس نے ان سب اندیشوں کو بالکل بجا ثابت کر دیا جن کی بنا پر مسلمان کانگریس کی تحریک آزادی کو اپنے لیے تحریک بربادی سمجھتے تھے۔ بلکہ درحقیقت سوراج قائم ہوتے ہی جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ شروع ہوا وہ ان کی بدترین بدگمانیوں سے بھی بدرجہا زیادہ بدتر نکلا جو کانگریس کے شدید ترین مخالف رکھ سکتے تھے۔

کانگریس کا دعویٰ تھا کہ وہ ہندوستان کی وحدت کا عقیدہ رکھتی ہے اور تقسیم کو محض مسلم لیگ اور انگریزی حکومت کی زبردستی سے بادل نخواستہ قبول کر رہی ہے۔ لیکن تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے وقت اور تقسیم کے بعد جو کچھ اس نے کیا وہ سب اس تقسیم کو دائمی اور ابدی بنا دینے والا ہے۔ اگر دیانت سے تقسیم کا مسئلہ طے کیا جاتا، شرافت سے اس پر عملدرآمد کیا جاتا اور اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں سے منصفانہ سلوک کیا جاتا تو بعید نہ تھا کہ کچھ مدت بعد پاکستان خود ہندوستان کے ساتھ اتحاد کا خواہشمند ہوتا۔ مگر اب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان وہ دیواریں کھڑی ہو چکی ہیں جو صدیوں تک انہیں ایک دوسرے سے جدا رکھیں گی۔

اب تیسرے [illegible] کو دیکھیے جس کا پہلو اس زمانے میں سب سے زیادہ ناکام رہا ہے۔

دس سال سے مسلمانوں کی قیادت جس شخص کے لائحہ عمل پر چل رہی تھی وہ [illegible]

تقسیم کے وقت مسلمانوں کی حالت کا جائزہ

گزشتہ صحبت میں ہندستان کے اُن سیاسی انقلابات کا جائزہ لیا گیا تھا جن کے
صرف ایک پہلو سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں ہم نے بحیثیت مجموعی پورے ملک کی بعید سرگزشت
خونیں پر ایک نظر ڈال کر یہ بتایا تھا کہ اس ملک کے سابق حکمرانوں اور سیاسی لیڈروں نے مل جل
کر اپنی خود غرضی، تنگ دلی اور استبداد پسندی سے اس کو کس خوفناک تباہی کے راستے پر ڈال
دیا ہے، اور اس سے بچنے کی واحد صورت اب کیا ہے۔ آج ہم اس کے دوسرے پہلو پر کچھ روشنی
ڈالنا چاہتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ ان انقلابات میں سب سے زیادہ تباہی جس قوم پر آئی ہے ——
یعنی مسلم قوم —— وہ آج کس حال میں ہے، کن اسباب نے اسے اس حالت کو پہنچایا ہے،
اور اب کیا چیز اسے بچا سکتی ہے۔

دس گیارہ برس پہلے کی بات ہے جب ہندستان کے سات صوبوں میں یکایک
کانگریس کو برسرِ اقتدار دیکھ کر پنڈت نہرو نے مسلم عوام کے ساتھ براہِ راست ربط قائم کرنے
(Muslim Mass Contact) کا پروگرام شروع کیا۔ مسلمانوں کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ اس
ملک میں جمہوری قوم پرستی کا غلبہ ان کے لیے ایک حقیقی خطرہ ہے اور یہ خطرہ سر پر آ چکا ہے۔

[illegible] جو تقسیم کے وقت [illegible] (مرتب)

سوچ کر جب چاہے اصلاح بھی کر سکتی ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ آج جو سارا نقشۂ جنگ بدل دی، تمہارے لیے صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ سیاسی اور معاشی اغراض کے لیے لڑنے والی ایک محض اقتصادی قوم کی یہ پوزیشن جو تم نے غلطی سے اختیار کر لی ہے، اور اس کے بجائے اپنا اصل منصب سنبھالو جو مستقل زندگی کا ایک بہترین حل اور تمام رجعت پسند نظاموں سے زیادہ جامع اور منصفانہ نظام پیش کرنے والی جماعت کا منصب ہے۔ یہ چیز لے کر اگر تم اٹھ کھڑے ہوئے اور تم نے عملی و فکری حیثیت سے اصولِ اسلام کا تفوق تمام دوسرے اصولوں پر ثابت کر دیا اور اس کے ساتھ اپنے کیرکٹر کی اخلاقی حیثیت سے بھی اپنے ہمسایوں پر فائق کر کے دکھا دیا تو بہت جلد تھوڑی ہی مدت کے اندر ہندوستان میں توازنِ قوت بدل جائے گا، ہندوستان کی سیادت تمہارے حصہ میں کسی اور کا حصہ نہ ہوگی، اور بجائے اس کے کہ تم اپنے بچاؤ کے لیے پریشان ہو، تمہارے حریفوں کو یہ فکر لاحق ہو جائے گی کہ وہ تمہارے بڑھتے ہوئے سیلاب سے اپنے آپ کو کس طرح بچائیں۔

یہ وہی بات تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں قریش کے لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ میں وہ کلمہ لے کر آیا ہوں کہ اگر تم اسے مان لو تو عرب اور عجم سب تمہارے زیرِ نگیں ہو جائیں گے۔ لیکن مسلمانوں نے اس مشورے میں وہی خطرہ محسوس کیا جو قریش نے محسوس کیا تھا کہ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا یعنی اگر ہم اس راہِ عمل کو اختیار کریں تو اس سرزمین میں ہمارا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا۔ پوری قوم میں بہت کم لوگ اس راہ کے امکانات کو سمجھ سکے، اور بہت ہی کم لوگ اس پر چلنے کے لیے آمادہ ہوئے۔ اس طرح یہ راستہ تو قابلِ عمل نہ رہ سکا۔

دوسری رائے یہ تھی کہ تمام ہندوستان کے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اور مل کر آواز اٹھائیں کہ ہم ایک الگ قوم ہیں، ہمارا مذہب الگ ہے، ہماری تہذیب الگ ہے، ہمیں اور ہندوؤں کو ملا کر سارے ملک میں ایک قومی جمہوری ریاست بنا دینا صحیح نہیں ہے، ملک کو تقسیم کیا جائے، جہاں ہماری اکثریت ہے وہاں ہماری آزاد قومی حکومت بنے اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں ان کی آزاد قومی حکومت بن جائے۔

یہ راستہ آسان تھا۔ اس میں نہ کسی ذہنی کاوش کی کوئی حاجت تھی اور نہ کسی اخلاقی ضبط و
انضباط کا کوئی سوال۔ بلکہ ہر بات بالکل صاف تھی، اور مسلمانوں کے ذہین طبقہ کو ایک مدت سے
جس قسم کی تعلیم و تربیت مل رہی تھی اس کے لحاظ سے یہی بات ان کی دماغی سطح سے قریب تر
بھی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تھوڑے سے لوگوں کو
چھوڑ کر ساری قوم نے اسی راستے کو اپنا لیا۔ اس پروگرام کی تکمیل پر متفق ہونے کے بعد سے پچھلے چند
سالوں میں مسلمانوں نے من حیث القوم جو کچھ کیا ہے اسی تحریک اور اسی قیادت کے زیر اثر
کیا ہے جو اس تخیل کو پیش کرنے کی ذمہ دار تھی۔ لہٰذا ہماری ماضی قریب کی سرگزشت کا اور
ہمارے موجودہ حال کا حسن و قبح لازماً اسی تحریک ہی کی طرف راجع ہوگا۔

یہ تحریک ایک قومی تحریک تھی۔ اس میں وہ سب لوگ شریک ہوئے جو نام و نسب
کے لحاظ سے مسلم قوم کے افراد تھے۔ یہ سوال اس میں سرے سے بے محل تھا کہ جو اس میں
شامل ہو رہا ہے وہ خدا، رسول، آخرت، وحی و کتاب اور دین و شریعت کو مانتا ہے یا نہیں،
حرام و حلال کی تمیز کا قائل ہے یا نہیں اور نجی زندگی میں وہ ہماری تہذیب و دین کی مختلف صفات
میں سے کس صفت کے ساتھ متصف ہے۔ اصل مسئلہ قوم کو بچانے کا تھا اور اس کے لیے
تمام قومی عناصر کا متحدہ محاذ بنانا ضروری تھا۔ پھر جو کام پیش نظر تھا وہ بھی دعوت اور امامت کا نہ تھا
کہ دین و اعتقاد کے تجسس کی ضرورت پیش آتی۔ مقصود صرف قومی مدافعت تھی اور اس کے
لیے تحریک کی شرکت اور کار اس کی قیادت و رہنمائی کے معاملہ میں بھی یہ دیکھنے کی حاجت
نہ تھی کہ جن لوگوں کو ہم آگے بڑھا رہے ہیں ان کا اسلام سے کتنا اور کیا تعلق ہے۔

یہ تحریک سیاسی تھی۔ اس میں اخلاق کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔ جس نے سیاسی
جوڑ توڑ میں جتنی زیادہ ہوشیاری دکھائی وہ اتنے ہی زیادہ ذمہ داری کے منصب کا اہل قرار
پایا۔ اس قابلیت کا ثبوت مل جانے کے بعد یہ دیکھنا بالکل غیر ضروری تھا کہ اس کی دیانت،
امانت، صداقت کا کیا حال ہے اور اس کی سیرت کہاں تک اعتماد کے لائق ہے۔

اس تحریک میں اگرچہ مذہب کا کوئی دخل نہ تھا۔ جیسے اس قسم کی تحریک ایسے ہی
کانگرسی اور نیشنلسٹ دہریوں کے ساتھ دنیا کی ہر قوم اٹھا سکتی تھی۔ لیکن اتفاق کی بات

تھی کہ جو قوم اپنی حفاظت کے لیے یہ تحریک لے کر اٹھی تھی اس کا مذہب اسلام تھا اس لیے اسلام کی حفاظت بھی اس کے لیے خاص کی گئی۔ اصل یہ قرار پایا کہ بہت مدد جتانی تو اسلام کے بس کا روگ نہیں ہے، اور نہ یہ جاننے کا اسے حق ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے؛ البتہ یہ اس کا فرض اور اس کا یہی منصب ہے کہ جو کچھ ہم کریں وہ اس کی تصدیق و توثیق کرے، اس پر اجر کی امید دلائے، اس پر چسپاں کرنے کے لیے اپنی کوئی نہ کوئی اصطلاح مستعار دے، اور اس میں ہمارا ساتھ نہ دینے والوں کو جہنم کا مستحق ٹھیرائے۔ اس لیے کہ ہم جو کچھ کریں گے اسی پر مسلم قوم کا بچاؤ موقوف ہے، اور مسلم قوم ہی نہ رہی تو یہ اسلام صاحب آخر رہیں گے کہاں؟ یوں اس تحریک میں اسلام سے وہ خدمت لی گئی جو بگڑے ہوئے نواب زادے اپنے خاندان کے کسی پرانے جاں نثار ملازم سے لیا کرتے ہیں۔ مشورہ اور نصیحت اُس کا کام نہیں ہوتا، میاں لوگ اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں۔ مگر آڑے وقت میں بوڑھے خادم کو پکارا جاتا ہے کہ آؤ حق نمک ادا کرو۔ پھر اگر وہ غریب اُن حرکات پر صبر نہیں کر سکتا جن کی وجہ سے بُرے وقت آتے ہیں، اور یہ کہہ بیٹھتا ہے کہ صاحبزادے اپنے اطوار ٹھیک کرو، تو اُسے ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ ایاز قدرِ خود بشناس۔ تو اپنے کام سے کام رکھ، تیری یہ حیثیت کب سے ہو گئی کہ ہمارے معاملات میں دخل دے۔

یہ تھیں وہ بنیادیں جن پر ہماری یہ قومی تحریک اول روز سے، شروع سے آخر تک چلتی چلی گئی۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں مومن اور منافق اور اگلے پچھلے سب شامل تھے۔ بلکہ دین میں جو جتنا ہلکا تھا وہ اتنا ہی اوپر آیا۔ اس میں اخلاق کی طرف سے کوئی پوچھ نہ تھی۔ عام کارکنوں سے لے کر بڑے سے بڑے ذمہ دار عہدوں تک میں انتہائی ناقابلِ اعتماد سیرت کے لوگ موجود تھے، بلکہ تحریک کا قدم جتنا آگے بڑھا اس قسم کے عنصر کا تناسب بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس میں اسلام کو اتباع کے لیے نہیں بلکہ صرف عوام میں مذہبی جوش پیدا کرنے کے لیے ذریعۂ جنگ بنایا گیا تھا۔ کسی ایک دن کے لیے بھی اس کو یہ حیثیت نہیں دی گئی کہ وہ حکم دے اور یہ اسے مانیں، اور کوئی قدم اٹھاتے وقت یہ اُس سے مشورہ کریں۔

پھر چونکہ مقابلہ ہندو سے تھا اس لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے ہر حربے کا جواب ویسے ہی حربے سے، ہر چوٹ کا جواب ویسی ہی چوٹ سے، اور ہر چال کا جواب ویسی ہی چال سے دیا جائے۔ یہی وہ پستیاں ہیں جن میں ہمارا مسلمان بھی اسی کی ضد میں گر گئے، اور جو کچھ وہ اپنی قومی خود غرضیوں کی خاطر کرتا تھا، مسلمانوں نے اس کے جواب میں اس کا ارتکاب کیا اور جیسا کر رہا ہے۔ اس مقابلہ و مسابقت نے مسلمانوں کی عام اخلاقی سطح اتنی گرا دی کہ شاید اس سے پہلے وہ کبھی اخلاقی حیثیت سے اتنے نہ گرے تھے۔

یہ تھا ہماری اس عظیم الشان قومی تحریک کا اخلاقی و دینی پس منظر۔ اب ذرا اس کے اصل کام کا جائزہ لیجیے جو اس قوم کو پہنچانے کے لیے زیر بحث تھی۔

مسلمانوں کا قومی مطالبہ جو اس نے مرتب کیا وہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی علاقائی اکثریت کے لحاظ سے ملک تقسیم کر دیا جائے۔ اس مطالبہ کے اندر آپ سے آپ تین باتیں شامل تھیں۔ ایک یہ کہ تقریباً آدھے مسلمان ہندوؤں کے قومی غلام بن کر رہ جائیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی قومی ریاست دو ایسے چھوٹے چھوٹے خطوں میں بٹ جائے جن کی حیثیت ہندوستان کی سرحدوں پر قریب قریب وہی ہو جو یورپ میں بیلجیم اور چیکوسلواکیہ جیسی ریاستوں کی حیثیت روس کی سرحدوں پر ہے۔ تیسرے یہ کہ ان دونوں خطوں کے درمیان بھی ایک ہزار میل کا چوڑا علاقہ حائل ہو اور ان کے درمیان مواصلات اس طرح ممکن نہ ہو سکیں کہ حالتِ جنگ میں وہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔[۱]

---

[۱] یہ بات محتاج بیان نہیں کہ آج مشرقی اور مغربی پاکستان کا ایک ملک بن کر رہنا اسی وقت تک ممکن ہے جب تک ہندو تقسیم کے بعد بھی ان دونوں حصوں کا احترام کریں۔ جس وقت بھی وہ اس کا حشر ہوتا دیکھ سکیں اور مسلمانوں کے کسی گروہ سے سازش کر کے مشرقی پاکستان میں بیک وقت بغاوت برپا کرائیں اور پھر اس کی مدد کو خود پہنچ جائیں، یہ وحدت باقی نہ رہ سکے گی، کیونکہ اس صورت میں مغربی پاکستان کسی طرح بھی مشرقی پاکستان کو نہیں بچا سکتا۔ یہ وہی حقیقت ہے جس کو ہندوستان و پاکستان کے نقشے پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص پہلی نظر ہی میں دیکھ سکتا تھا۔ (جدید)

کے رہبروں اور اسلام کی غیر معمولی طاقت سے اس خطرے کا مقابلہ کیا جائے۔ مگر اس حل نے مسلمانوں کو اپیل نہ کیا اور وہ اسے آزمانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اب یہ بحث بیکار ہے کہ اسے آزمایا جاتا تو کیا ہوتا۔ دوسرا حل جو پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ قومیت کی بنیاد پر سیاسی جنگ لڑی جائے۔ اسی حل کو مسلمانوں نے قبول کیا اور اپنی مذہبی قومی طاقت، اپنے تمام ذرائع اور اپنی جملہ صلاحیت اس قیادت کے حوالے کر دیئے جو ان کے قومی مسئلے کو اس طرح حل کرنا چاہتی تھی۔ دس برس کے بعد آج اس کا پورا کارنامہ ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے کس طرح کس صورت میں ہمارے مسئلے کو حل کیا۔ جو کچھ ہو چکا ہے وہ تو اٹل ہے، اب اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اس پر اس حیثیت سے تو بحث بیکار ہے کہ یہ نہ کیا جاتا تو کیا ہوتا۔ البتہ اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل اب ہمیں درپیش ہیں کیا ان کے حل کے لیے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلے کو اس طرح حل کر چکی ہے؟ کیا اس کا اب تک کا کارنامہ یہی سفارش کرتا ہے کہ اب جو بڑے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر آ پڑے ہیں، جن کا بیشتر حصہ خود اسی قیادت کی کارفرمائیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے، انہیں حل کرنے کے لیے ہم اسی پر اعتماد کریں؟

(ترجمان القرآن۔ جولائی ۱۹۴۸ء)

تقسیم کے بعد سامنے آنے والے مسائل

مسلمان اس وقت بحیثیت ایک قوم کے بڑے بڑے مسائل سے دوچار ہیں ان کا ابھی تک صحیح طور پر جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ہمارے سوچنے والے طبقے ان مسائل کا پورا علم اور ادراک نہیں رکھتے ہیں اور ان پر غور و فکر کرتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن عام طور پر جو کتابیں پڑھنے اور لکھنے میں آئی ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ نہ تو ان مسائل کا پورا ادراک کیا گیا ہے اور نہ ان کا تجزیہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک مسئلہ کیا نوعیت رکھتا ہے۔ کیا اس کے اسباب ہیں، کیا اس کا پس منظر ہے۔ اور کس طرح وہ حل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم بحیثیت مجموعی اب تک اپنے اصل مسائل سے غافل ہے۔ پھر ہمارے اندر ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جن کی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ قوم ان مسائل سے غافل کیا اور رکھا جائے۔ وہ اس کو قوم میں انتشار پیدا کرنے کی سعی قرار دیتے رہتے ہیں۔ وہ اب تک وہی نقشے چلائے جا رہے ہیں جو آزادی سے پہلے چلا رہے تھے۔ وہ ایسے چٹکیاں دے دے کر تسلی کرتے ہیں کہ یہ مسائل یا تو موجود ہی نہیں ہیں یا ہیں بھی تو ان کے لیے الجھنے یا ان پر غور کرنے کی فرصت نہیں۔ یہ باتیں خواہ نادانی کے ساتھ کی جا رہی ہوں یا ہوشیاری کے ساتھ اور خواہ کسی جماعت کی اغراض کے لیے یہ کتنی ہی مفید ہوں، بہرحال قوم کی خیر خواہی کا ان میں شائبہ تک نہیں ہے۔ قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس کے سامنے واضح طور پر وہ سارے

اور سکھوں نے جو عمارات، سامان، اموال، دکانیں، کارخانے، زمینیں اور دوسری چیزیں پاکستان میں چھوڑی تھیں، اگر ان پر خود پاکستان کے باشندے، حکومت کے کارندے اور ان کے کارکن قبضہ کر کے نہ بیٹھ جاتے تو یہ مہاجرین کو بسانے میں بڑی کام آ سکتی تھیں جن سے اب ہم محروم ہیں۔ مغربی پنجاب اور سرحد و سندھ کی طرف سے جو کچھ لوگوں نے کیا پھر چھوڑا تھا، اور اس کا کتنا حصہ آنے والوں کو ملا اور کتنا حصہ کس کس غیر مستحق کو پہنچا؟ اگر یہ اعداد و شمار روشنی میں آ جائیں تو دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ جائے کہ مہاجرین کے مسئلے کا جو زخم غیروں نے ہم کو لگایا تھا اسے مرہم کا جو اجا کھو دینے والے درحقیقت کون لوگ ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس قوم میں آپ کس کس کو برہنہ دیکھیں گے۔

پھر وہ لوگ جن کے لب "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے، جن سے بڑھ کر جن کے دل میں تڑپنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا، اور جو آج بھی زبان سے بہت بڑے "مجاہد وطن" بنے ہوئے ہیں، ان میں عظیم الشان اکثریت آپ کو ایسے افراد کی نظر آئے گی جو پاکستان بننے کے بعد ہر زاویے سے اس کی کشتی میں سوراخ کیے جا رہے ہیں۔ یہ رشوت خوریاں، یہ خیانتیں، یہ غبن، یہ قومی خرچ پر اقربا پروریاں اور دوست نوازیاں، یہ فرض سے غفلت، یہ ڈسپلن سے گریز، یہ غریب قوم کی دولت پر عیاشیاں، جن کا ایک طوفان سا ہمارے نظام حکومت کے ہر شعبے میں برپا ہے اور جن میں بکثرت چھوٹے بڑے کارکن حصہ لے رہے ہیں

دیتے ہیں (کہ ۳۱ء) ہے اب بھی مہاجرین کا مسئلہ پوری طرح حل نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی جرمنی پر جرمن پناہ گزینوں کا ایک سیلاب ٹوٹ پڑا، جن کی تعداد بڑھتے بڑھتے ایک کروڑ ۲۰ لاکھ تک پہنچ گئی، اور یہ اس حال میں ہوا کہ مغربی جرمنی سے جانے والا کوئی نہ تھا جو اپنی جائداد خالی چھوڑ گیا ہو۔ اس کے باوجود جرمنی نے پناہ گزینوں کو بڑی خوبی سے بسایا بھی اور کام پر بھی لگا لیا، بلکہ مہاجرین کا یہ سیلاب مغربی جرمنی کی معاشی خوشحالی و ترقی کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا۔

(بقیہ)

حق تلفی عام، انصاف ناپید ہو رہا ہے، کیا یہ سب پاکستان کو مضبوط کرنے والی چیزیں ہیں؟ یہ مکانوں
اور دکانوں کی ناجائز تقسیم جس کی بدولت ملک کی صنعت و تجارت کا بڑا حصہ نااہل اور ناتجربہ کار
ہاتھوں میں چلا گیا ہے، کیا یہ پاکستان کی طاقت کو مستحکم کرنے والی چیز ہے؟ یہ پبلک کا بالعموم
حکومت کے ٹیکس ادا کرنے سے گریز کرنا اور ان سے بچنے کے لیے، نیز دوسرے ناجائز
فوائد حاصل کرنے کے لیے سرکاری ملازموں کو رشوتیں دینا، اور جہاں بھی قانون کی گرفت
سے بچ نکلنے کی امید ہو پبلک فنڈ کا بڑے سے بڑا نقصان کرنے میں بھی تامل نہ کرنا، کیا یہی
وہ چیزیں ہیں جن سے پاکستان مضبوط ہو سکتا ہے؟ ملک کے باشندوں کی اخلاقی حالت
اس قدر گر چکی ہے کہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کی لاشیں جب امرتسر اور واہگہ کے
درمیان پڑی سڑ رہی تھیں اور کیمپوں میں بھی موت کا بازار گرم تھا اس وقت ۱۲-۱۰ لاکھ مسلمانوں
کے شہر میں سے چند ہزار نہیں، چند سو آدمی بھی ایسے نہ نکلے جو اپنے بھائیوں کو دفن کرنے
کی زحمت اٹھاتے۔ متعدد مثالیں ہمارے علم میں ایسی ہیں کہ کوئی مہاجر مر گیا ہے اور اس
کے عزیزوں کو نماز جنازہ پڑھنے کے لیے اجرت پر آدمی فراہم کرنے پڑے ہیں۔ یہاں
تک بھی نوبت پہنچی ہے کہ سرحد کے قریب کسی گاؤں میں مہاجرین کو زمینیں دی گئیں اور
مقامی مسلمانوں نے در پردہ سکھوں کو بلا کر ان پر حملہ کرا دیا تاکہ یہ بھاگ جائیں اور
زمین ہمارے قبضے میں رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ان کی جو بیٹیاں ہندوستان کے ظالموں سے بچا
لائی تھیں ان کی عصمتیں یہاں اپنے بھائیوں کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکیں ـــــ اس
قسم کے واقعات شاذ نہیں ہیں بلکہ بکثرت ہمارے علم میں آئے ہیں، اور ان شرمناک جرائم کے
مرتکب صرف عام شہری ہی نہیں تھے ـــــ کیا اتنے شدید اخلاقی تنزل کے ہوتے ہوئے
ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ کسی بڑی اندرونی یا بیرونی مصیبت کے مقابلے میں ہم مضبوطی کے ساتھ
کھڑے ہو سکیں گے؟ اور کیا یہ اخلاقی تنزل اپنے ملک کی تعمیر کے لیے ہماری کسی اسکیم کو کامیابی
کے ساتھ چلنے دے گا؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم اس سوال کو جانے دیتے ہیں کہ ہماری قیادت نے سیاسی تحریک
کے ساتھ قوم کی اخلاقی طاقت کو بنانے کی فکر کیوں نہ کی؟ ہم پوچھتے ہیں کہ اب وہ اس کے لیے

جا رہی ہے؟ خون بہانے اور مستردوں سے کا کیا مرد مسلمان ہی کے پاس ہے؟ کیا تدبیر اس کے
پیش نظر ہیں؟ کیا دائرۂ عمل ہی سے نکالا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا واضح جواب ہمیں ملنا
چاہیئے۔ اگر اس کے جواب میں کسی صحافی کی طرف اشارہ کیا جائے جو کبھی کبھی ریڈیو، دوسرا اور
پریس اور تقریروں کے ذریعہ پبلک کو اور حکومت کے چھوٹے اہل کاروں کو کی جاتی رہتی ہیں،
تو ہم پہلے ہی کہہ دیتے ہیں کہ کس طرح کی شکل تصیحوں سے ہمیں معاملہ طے ہو جانے۔ اس لیے
کہ بد اخلاقی کے اصل سرچشمے تو خود تعمیر قیادت کے سرچشموں میں شامل ہیں۔ کارفرمائی اور فرمانروائی کی
باگیں تو اس وقت بیشتر لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جن کی زندگی اکثر بے ... کے ہاتھ سے بداخلاق
کا بازار گرم ہے۔ پھر جو خیانت کی زبان سے امانت کا سبق، خود غرضی کی زبان سے ایثار کا
وعظ اور گناہ کی زبان سے نیکی کا درس منافقانہ طریقے سے کب تک کیا ہے کہ جہاں اس کے اثر
پڑنے کی توقع کی جائے!

دوسرا مسئلہ جو پاکستان کی زندگی اور اس کے بقا اور اس کے استحکام کے لیے بڑی اہمیت
رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان جن عناصر پر مشتمل ہے انہیں کس طرح جوڑ کر ایک بنیان مرصوص بنایا
جائے۔ یہ مسئلہ اس وقت شدت کے ساتھ قابل توجہ نظر آ رہا ہے۔ یہی مقدر ہے کہ کسی چیز کے
عناصر ترکیبی ہی اگر صحیح اور باہم پیوستہ نہ ہوں تو اس کے وجود کا برقرار رہنا محال ہو جاتا ہے۔
اس کے اجزائے وجود میں پراگندگی کا رجحان یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی اپنی ترکیب ہی میں خرابی
کی صورت مضمر ہے۔ لہٰذا اگر یہ واقعہ ہے، اور روشن ہے، جس کا انکار کر سکتا ہو کہ پاکستان کے
ترکیبی عناصر میں جو اسباب کے باعث پھر انتشار و پراگندگی کے رجحانات پائے جاتے ہیں اور
پھر ترقی ان کو بڑھانے میں لگ رہی ہیں، تو ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے بنیادِ استحکام بلکہ ہمیں ہمارے
صرف وجود ہی میں ایک خطرناک رخنہ موجود ہے جسے دور کیے بغیر ہم اپنے آپ کو مستحکم نہیں
بنا سکتے۔

پاکستان جن عناصر پر مشتمل ہے ان میں تین تفریقیں اس وقت بالکل نمایاں ہیں۔

پہلی تفریق مہاجرین اور غیر مہاجرین کے درمیان ہے۔ ہماری آبادی میں مہاجرین کی تعداد
اس وقت ۷۰ لاکھ سے متجاوز ہو چکی ہے اور یہ تعداد روز افزوں ہے، کیونکہ ہندوستان کے ہر

حضرت مسلمان گھر بار چھوڑ کر مغربی پاکستان کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ مشرقی بنگال کے ہندو اسی طرح مشرقی
پاکستان کی طرف سے اور بھارتی ہندوستان کے لوگ مغربی پاکستان کی طرف آ رہے ہیں[1]۔ یہ نیا عنصر
مہاجرین کا ایک مستقل عنصر ہے جو تعداد کے لحاظ سے ابھی کوئی اہم نہیں ہے۔ بلکہ تعداد میں بہت
ایسے ہیں جو نئے اور پرانے عنصر کو ایک قوم بننے سے روک رہے ہیں۔ پھر زبان، تہذیب،
معاشرت اور معاشی وسائل کے مختلف اختلافات ہیں جو ہر جگہ ایک مشترکہ یا ملک میں
مانع ہوا کرتے ہیں۔ مگر اس پر مستزاد جس چیز نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ مہاجرین اور غیر
مہاجرین دونوں میں جاہلیت کے تعصبات اور نفسانی خودغرضیاں کار فرما ہیں۔ یہ چیز ہر جگہ ان دونوں
عنصر کو جدا رکھ رہی ہے۔ ان کو ایک جسم کی شکل میں منظم کر رہی ہے۔ ان کے درمیان منافرت
کی خلیج پیدا کر رہی ہے اور دونوں طرف کے تنگ نظر اور خودغرض عنصر ان کو باہم لڑا رہے
ہیں[2]۔

دوسری تفریق جغرافی، نسلی اور لسانی ہے۔ پاکستان اول تو دو ایسے خطوں پر مشتمل ہے
جن کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ پھر یہ خطے بھی اپنی اپنی جگہ اندرونی
وحدت نہیں رکھتے بلکہ مختلف اجزا سے مرکب ہیں اور ہر جزو دوسرے جز کے خلاف تعصب
رکھتا ہے۔ اس وقت درحقیقت ہم ایک قوم نہیں ہیں، پانچ مختلف قومیں ہیں جو کسی نہ کسی طرح
ایک سیاسی وحدت میں منسلک ہو گئی ہیں، یعنی سندھی، بلوچی، پٹھان، پنجابی اور بنگالی۔
ان میں سے ہر ایک قوم کے اندر علیحدگی کا رجحان شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے اور بعض نادان

---

[1] ۱۹۵۰ء میں کلکتہ کے اخراج سے ہونے والے مسلمانوں کی تعداد ۲,۰۴,۰۹۹ تھی جس کے بعد رفتہ رفتہ
یہ تعداد دس لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے دس لاکھ مسلمان زیادہ تر ہندوستان سے مشرقی پاکستان
میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے۔ (جدید)

[2] مشرقی پاکستان میں صرف مہاجرین، بلکہ تمام غیر بنگالی مسلمانوں کے ساتھ خود مسلمانوں نے جو ظالمانہ
سلوک کیا وہ درندگی و سفاکی میں اس ظلم سے بھی بازی لے گیا جو ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں نے
مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا۔ (جدید)

وہاں ریاست کی سیاسی وحدت اور اس کے امن کو برقرار رکھنا ایک مشکل مسئلہ ہے۔ مگر یہ چیز زبان
کو چھوڑ کر وہ ذہنی وحدت ہرگز پیدا نہیں کر سکتی جو ریاست کی اندرونی ترقی اور بیرونی خطرات
کے مقابلہ میں اس کی متحدہ مدافعت کے لیے ضروری ہے۔ پھٹے ہوئے دل اور بکھرے ہوئے
ہاتھ نہ تعمیر میں تعاون کر سکتے ہیں اور نہ مدافعت ہی میں یک جان و یک دل بن کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔
قومیت کا پرچار بھی اس معاملہ میں بے بس ہے۔ ہندوستان میں ہم اس کا تجربہ دیکھ چکے ہیں۔ مغربی
تصورات کے مطابق قومیت کی تبلیغ و تلقین وہاں جتنی بڑھتی گئی، اس سے ملک کی آبادی میں
وحدت پیدا کرنے کے بجائے ان تمام گروہوں میں اپنے امتیازی وجود کا احساس جاگا جو
اپنے اندر قومیت کے عناصر رکھتے تھے۔ پھر سالمیت مخصوص کا تصادم تو وہ چیز ہے جس کے زہر
کا تریاق فراہم کرنے میں قومیت جگہ جگہ ناکام ہوئی اور ہو رہی ہے۔ اب ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں
کہ ہماری موجودہ قیادت کے پاس اس مسئلہ کا کیا حل ہے اور وہ کہاں تک اس سے عہدہ برآ ہونے
کی اہلیت رکھتی ہے؟

کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ ہم اُن دوسرے مسائل کی اہمیت سے غافل ہیں جو اس وقت
پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو درپیش ہیں۔ بلاشبہ دفاعی، صنعتی، انتقالی، معاشی اور انتظامی مسائل
بھی بڑی جگہ کافی اہم ہیں جو اس مملکت کی پیدائش کے بعد رونما ہوئے۔ کوئی نہیں کہتا کہ
ان کی طرف توجہ نہ کی جاتی۔ نہ ہم اُن خدمات کا انکار کرتے ہیں جو اس سلسلہ میں
موجودہ قیادت نے انجام دیں۔ لیکن جہاں تک ہم سمجھتے ہیں مسلمانوں کی حیات قومی کے لیے اس
وقت سب سے بڑے مسئلے یہی تین ہیں جن کا ذکر ہم نے کیا ہے، اور قیادت کا اصل امتحان یہ
ہے کہ وہ انہیں صحیح طور پر حل کرنے کی اہلیت، فکری اور اخلاقی حیثیت سے کہاں تک اپنے اندر
رکھتی ہے۔

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۵۰ء)

اس ریاست میں وفادار بن کر رہیں یا ہجرت کریں۔

۳۔ میری رائے میں ہر ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کے رسم و رواج، مخصوص معاشرتی خصائل اور اعتقادات و رجحانات کا پرتو ہوتا ہے۔ سیاسی نظام بطور خود کسی تصفیہ طلب کا حل نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے ایسا بنانے کی کوشش کی جائے تو وہ ایک مصنوعی اور عارضی کوشش ہوگی۔ قدیم یونان کی شہری ریاست افلاطون کے تخیل کی پیداوار نہیں تھی بلکہ اس طرز فکر اور طرز زندگی کی پیداوار تھی جو یونان کے باشندوں میں مشترک تھا۔ اسی طرح اگر ہم اسلامی ریاست کی تعمیر چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ پاکستان کے باشندوں میں بھی اسلامی اسپرٹ پیدا کریں۔ وہ انہیں دین کی اصل اقدار و مقصد سے روشناس کرائیں جب یہ اقدار مستحکم ہو جائیں گی اور ہمارے قومی کیریکٹر میں اسلامی تصورات پوری طرح سرایت کر جائیں گے، اس وقت ہمارا سیاسی نظام خود بخود اسلامی رنگ اختیار کرے گا۔ ہم اس وقت تک اسلامی ریاست کی داغ بیل نہیں ڈال سکتے جب تک ہماری روزانہ شخصی اور سماجی زندگی میں اسلامی روایات پوری تابندگی سے جلوہ گر نہ ہوں۔ میری نظر میں وہ وقت ابھی بہت دور ہے جب ہم عملی طور پر اسلامی تصورات کو قبول کر لیں گے۔ اس لیے اسلامی ریاست کو قائم کرنے کی تمام کوششیں پیش از وقت ہیں۔ ہماری بنیادیں ابھی اتنی استوار نہیں ہیں کہ ہم ان پر ایک عمارت کھڑی کر سکیں۔

۴۔ آپ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ایک ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کی خلقی اور ذہنی حالت کا پرتو ہوتا ہے۔ اب اگر پاکستان کے باشندے اسلام کی طرف ایک پُرزور میلان رکھتے ہیں اور ان کے اندر اسلام کے راستے پر آگے بڑھنے کی خواہش موجود ہے تو کیوں نہ ان کی قومی ریاست ان کے اس میلان اور اس خواہش کا پرتو ہو؟ آپ کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ اگر ہم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں پاکستان کے باشندوں میں اسلامی شعور، اسلامی ذہنیت اور اسلامی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مگر میں نہیں سمجھا کہ اس کوشش میں حصہ لینے سے آپ خود ریاست کو کیوں مستثنیٰ رکھنا چاہتے ہیں؟ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کی صورت حال تو یہ تھی کہ ہمارے اوپر ایک غیر مسلم اقتدار مسلط تھا۔ اس وجہ سے ہم اسلامی

علماء بھی ملت کی تعمیر میں ریاست اور اس کی طاقتوں اور اس کے ذرائع سے کوئی مدد
نہیں پا رہے تھے۔ بلکہ درحقیقت اس وقت ریاست کا زور اور اس کے ذرائع ہمیں
ایک دوسری طرف کھینچ رہے تھے اور ہم انتہائی ناسازگار حالات میں اسلامی زندگی کی تعمیر
کے لیے جد و جہد کر رہے تھے۔ اب جو سیاسی انقلاب ماہ اگست میں رونما ہوا
ہے اس کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا اب ہماری قومی ریاست
اسلامی زندگی کی تعمیر میں وہ حصہ لے گی جو ایک ریاست کا حصہ ہوتا ہے؟ یا وہ طرز عمل اختیار کرے گی
جو ایک سیکولر غیر مذہبی ریاست کا ہوا کرتا ہے؟ یا جب بھی وہی پہلی صورت حال برقرار رہے گی کہ
ہمیں جو وسائل ہیں ان کے بغیر ہی نہیں بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اسلامی زندگی کی تعمیر
کا کام کرنا ہوگا؟ اس وقت چونکہ پاکستان کا آئندہ نظام زیر تشکیل ہے اس لیے ہم چاہتے
ہیں کہ ہمیں ریاست ہی ایسی ملے جو اسلامی زندگی کی علمبردار بن سکے۔ ہماری یہ خواہش اگر پوری
ہو گئی تو ریاست کے وسیع ذرائع اور طاقتوں کو استعمال کر کے پاکستان کے باشندوں میں دینی
اور اخلاقی انقلاب برپا کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ پھر جس نسبت سے ہمارا معاشرہ
بدلتا جائے گا اسی نسبت سے ہماری ریاست بھی ایک مکمل اسلامی ریاست بنتی چلی
جائے گی۔

(ترجمان القرآن جون ۱۹۴۸ء۔ بشکریہ ریڈیو پاکستان)

کی جا سکتی تھی۔ اور ہم ایک قوم کی حیثیت سے اپنے خدا اور خلقِ خدا کے سامنے قانونِ
اسلامی کے نفاذ کے لیے پابند ہو چکے ہیں۔ جس کے بعد اب اپنے قول سے پھرنا ممکن نہیں رہا ہے۔
لہٰذا اب یہ دوسری مسلمان قومیں ہی کر سکتی ہیں۔ ہمیں بہرحال اُن مسائل کو جیسے بھی ہوں حل کرنا ہی پڑے گا
جو اس کام کی راہ میں حائل ہیں۔

جہاں تک اسلامی قانون کے نفاذ کی مشکلات کا تعلق ہے، ان سب کو دور کرنے کی تدبیریں
کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی مشکل نہیں ہے۔ اصل مشکل صرف یہ ہے کہ ہمارے ملک کی
فکر و حکومت اس کام کے لیے تیار نہیں ہے۔ بجائے خود مشکل نہیں ہیں۔ اور ان کے بیشتر حصے کی وجہ
اُن کی عدم واقفیت ہے۔ اس لیے سب سے پہلے جو کام کرنے کا ہے وہ یہی ہے کہ انہیں واضح طریقہ
پر یہ بتایا جائے کہ اسلامی قانون کس چیز کا نام ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ اس کا مقصد اس
کے اصول، اس کی شرح اور اس کا مزاج کیا ہے۔ اس میں کیا چیز قطعی اور مستقل ہے اور اس کے
ایسا ہونے کا فائدہ کیا ہے۔ اور اس میں کون سی چیز ابد تک تغیر پذیر ہے اور وہ کس طرح ہر
زمانہ میں ہماری بڑھتی ہوئی تمدنی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے۔ اس کے احکام کی صورتیں کیا
ہیں اور ان شرائط کی کیا حقیقت ہے جو ان احکام کے متعلق عام طور پر لوگوں میں پھیلی ہوئی
ہیں۔ اگر یہ تفہیم صحیح طریقہ پر ہو جائے تو ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بہترین دماغ خود اس کی تنفیذ
کے متعلق ہو جائیں گے اور ان کا ذہن ان ساری تدبیروں کی طرف دوڑنے لگے گا جو اسلامی
قانون کے نفاذ کی مشکلات کو حل کر سکتی ہیں۔

میری آج کی تقریر اسی ضرورت کے لیے ہے۔

قانون اور نظامِ زندگی کا باہمی تعلق

قانون کے لفظ سے ہم جس چیز کو تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل اس سوال کا جواب ہے کہ
انسانی طرزِ عمل، انفرادی اور اجتماعی طور پر کیسا ہونا چاہیے۔ اس سوال کا دائرہ اس حد
سے بہت وسیع ہے جس میں قانون اس کا جواب دیتا ہے۔ ہم کو سب سے پہلے جاننا چاہیے کہ اس
کا جواب دینے کے سوال سے سابقہ پیش آتا ہے اور اس کے بے شمار جوابات ہیں جو مختلف
نظریات کے تحت مرتب ہوتے ہیں۔ ان کا ایک بڑا حصہ ہماری اخلاقی تعلیم و تربیت میں شامل

اسلام کا نظریۂ زندگی

اس "الکتاب" اور "رسول" نے زندگی کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات جو تمہیں ہر طرح ایک مربوط نظام میں جکڑی ہوئی اور ایک مقررہ قانون پر چلتی ہوئی نظر آرہی ہے، دراصل ایک خدائی حکومت ہے۔ خدا ہی اس کا خالق ہے، وہی اس کا مالک ہے، اور وہی اس کا فرمانروا ہے۔ یہ زمین جس پر تم رہتے ہو، اُس کی بے پایاں سلطنت کے لاتعداد صوبوں میں سے ایک چھوٹا سا صوبہ ہے اور یہ صوبہ بھی مرکزی اقتدار کی اُسی گرفت میں پوری طرح جکڑا ہوا ہے جس میں اس جہانِ ہست و بود کا ہر حصہ جکڑا ہوا ہے۔ تم اس صوبے میں خدا کی پیدائشی رعیت (Born Subjects) ہو۔ تم اپنے خالق آپ نہیں ہو بلکہ اس کی مخلوق ہو۔ اپنے پروردگار آپ نہیں ہو بلکہ اس کے پروردہ ہو۔ اپنے بل پر آپ نہیں جی رہے ہو بلکہ اس کے جلائے جی رہے ہو۔ اس لیے تمہارے ذہن میں اپنی خود مختاری کا اگر کوئی تخیل ہے تو وہ ایک خود فریبی اور خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ اپنی زندگی کے ایک بہت بڑے حصے میں تو تم صریح طور پر رعیت ہو، اور اپنی رعیتی کو خود جانتے ہو۔ اپنی ماں کے پیٹ میں استقرارِ حمل سے لے کر اپنی موت کی آخری ساعت تک خدا کے قانونِ طبیعی (Law of Nature) سے اس طرح بندھے ہوئے ہو کہ ایک سانس تک اس کے خلاف نہیں لے سکتے۔ اور قدرت اور فطرت کی قوتیں اور قوانین اس طرح مقرر ہیں کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو اُن کے تحت رہ کر ہی کر سکتے ہو۔ ایک لمحے کے لیے بھی تمہارا اُن سے آزاد ہونا ممکن نہیں ہے۔ اب رہا تمہاری زندگی کا اختیاری حصہ جس میں تم اپنے اندر ارادے کی آزادی محسوس کرتے ہو اور اپنی پسند کے مطابق انفرادی و اجتماعی عمل کی راہیں انتخاب کرنے کی طاقت رکھتے ہو، تو وہ تمہیں اس حد تک آزادی حاصل ہے، مگر یہ آزادی تمہیں فطرتاً سلطنتِ الٰہی کی رعیت ہونے سے خارج نہیں کرتی بلکہ صرف یہ اختیار دیتی ہے کہ چاہو تو اطاعت کا رویہ اختیار کرو جو پیدائشی رعیت ہونے کی حیثیت سے تمہیں اختیار کرنا چاہیے اور چاہو تو خود مختاری و بغاوت کا رویہ اختیار کرو جو اپنی فطری حیثیت کے اعتبار سے تمہیں نہ اختیار کرنا چاہیے۔

حق کا بنیادی تصور

یہیں سے حق کا سوال پیدا ہوتا ہے اور یہ وہ بنیادی حق کا سوال ہے جو تمام جھگڑے

سے چھوٹے جزوی معاملات تک حق اسی طرح کے فیصلے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقت اور نظریہ "الکتاب" اور "الرسول" نے پیش کیا ہے اس کو جو بطور ایک امر واقعہ کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ بات صریحاً صدق پر حق قرار پاتی ہے کہ انسان اپنی زندگی کے اختیاری حصہ میں بھی اسی خدا کی حاکمیت (Sovereignty) تسلیم کرے جو اس کی زندگی کے پورے غیر اختیاری حصے کا اور اس تمام کائنات کا جس میں یہ زندگی بسر ہو رہی ہے، آپ سے آپ حاکم (Sovereign) ہے۔ یہ چیز کئی وجوہ سے حق ہے۔ یہ اس لیے بھی حق ہے کہ انسان جن آلات اور جن جسمانی قوتوں سے اپنے اختیارات کو استعمال کرتا ہے وہ خدا کے عطیے ہیں۔ اس لیے بھی حق ہے کہ خود یہ اختیارات انسان کے اپنے حاصل کردہ نہیں ہیں بلکہ تفویض کردہ (Delegated) ہیں۔ اس لیے بھی حق ہے کہ جن چیزوں پر یہ اختیارات استعمال کیے جاتے ہیں وہ سب خدا کی ملک ہیں۔ اس لیے بھی حق ہے کہ جس ملک میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ خدا کا ملک ہے۔ اور اس لیے بھی حق ہے کہ عالم کائنات اور حیات انسانی کی ہمواری و ہم آہنگی (Harmony) کا اقتضا یہی ہے کہ ہماری زندگی کا اختیاری اور غیر اختیاری، دونوں حصوں کا حاکم اور سرچشمۂ احکام ایک ہی ہو۔ ان دو حصوں کے دو الگ الگ یا ایک دوسرے سے مختلف حاکم ہونے سے ایسا تضاد پیدا ہو جاتا ہے جو موجب فساد ہو کر رہتا ہے۔ ایک شخص کی زندگی میں تو اس چیز کا فساد محدود پیمانے پر ہی ظاہر ہوتا ہے، مگر بڑی بڑی قوموں کی زندگی میں اس کے بُرے نتائج اتنے بڑے پیمانے پر نکلتے ہیں کہ خشکی اور تری اور ہوا فساد سے بھر جاتی ہے۔

"اسلام" اور "مسلم" کے معنی

"الکتاب" اور "الرسول" انسان کے سامنے اسی حق کو پیش کرتے ہیں اور اس کی دعوت دیتے ہیں کہ کسی جبر کے بغیر وہ اپنی خوشی سے اس کو قبول کرے۔ چونکہ یہ انسانی زندگی کے اس حصے کا معاملہ ہے جس میں خدا نے انسان کو خود ہی اختیار دیا ہے اس لیے یہ بات کہ انسان اس حصے میں خدا کو اپنا حاکم مانے، کسی دباؤ سے نہیں منوائی جاتی بلکہ رضا و رغبت سے تسلیم کرائی جاتی ہے۔ جس کا مطلب یہی ہے کہ اس بیان واقعہ (Statement of Fact) کو جسے "الکتاب" اور "الرسول" نے کائنات کی حقیقت کے متعلق دیا ہے، اور جس کا ضمیر بھی اس امر کی گواہی دے سکتا ہے

کی محض ایک فہرست ہی دے کر ہمارے حوالہ کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ زندگی کی پوری اسکیم ایسے نقشے پر بناتی ہے کہ اس کی بنیادیں معروف بھلائیوں پر قائم ہوں اور معروفات اس میں پروان چڑھ سکیں، اور منکرات کو اس کی تعمیر میں شامل ہونے سے روکا جائے اور کم از کم یا ان کے نشوونما اور پھیلنے کے مواقع باقی نہ رہنے دیے جائیں۔

اس غرض کے لیے وہ معروفات کے ساتھ ان اسباب و ذرائع کو بھی اپنی اسکیم میں شامل کرتی ہے جن سے وہ قائم ہو سکتے اور پروان چڑھ سکتے ہیں، اور ان موانع کو ہٹانے کا انتظام بھی تجویز کرتی ہے جو معروفات کے قیام و نشوونما میں کسی طرح سدِ راہ ہو سکتے ہیں۔ اس طرح اصل معروفات کے ساتھ ان کے وسائل قیام و ترقی بھی معروف شمار ہوتے ہیں اور ان کے موانع منکرات کی فہرست میں شامل کر دیے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ منکرات کے ساتھ بھی ہے۔ اصل منکرات کے ساتھ وہ چیزیں بھی منکر قرار پاتی ہیں جو کسی منکر کے وقوع یا ظہور یا نشوونما کا ذریعہ بنیں۔ ہر معروف کے پیچھے نظامِ شریعت اس طرح پڑ جاتا ہے کہ ایک ایک معروف اپنی پوری صورت میں قائم ہو، زندگی کے تمام متعلق شعبوں میں اس کا ظہور ہو، ہر طرف سے اس کو قائم ہونے اور پروان چڑھنے میں مدد ملے اور ہر وہ رکاوٹ دور کی جائے جو کسی طرح سے اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہو۔ اسی طرح ایک ایک منکر کو چن چن کر زندگی سے نکالا جاتا ہے، اس کی پیدائش اور نشوونما کے اسباب روکے جاتے ہیں، ہر وہ راہ جس سے وہ زندگی میں گھس سکتا ہے اس کا راستہ بند کیا جاتا ہے اور اگر وہ سر اٹھا ہی لے تو پھر سختی کے ساتھ اسے دبا دیا جائے۔

معروفات کو شریعت تین قسموں پر تقسیم کرتی ہے۔ ایک واجب یا فرض۔ دوسرے مندوب یعنی مطلوب۔ تیسرے مباح یعنی جائز۔

(۱) فرض و واجب وہ معروفات ہیں جو مسلم معاشرے پر لازم کیے گئے ہیں۔ ان کے متعلق شریعت صاف صاف اور قطعی احکام دیتی ہے۔

(۲) مطلوب وہ معروفات ہیں جن کو شریعت چاہتی ہے یا پسند کرتی ہے کہ وہ سوسائٹی میں قائم اور جاری ہوں۔ ان میں سے بعض کو صاف صاف بیان کیا گیا ہے اور بعض کا منشا شارع کے اشارات سے نکلتا ہے۔ بعض کے قیام و نشوونما کا بندوبست کیا گیا ہے اور بعض

کی طرف سفارش کی گئی ہے تاکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی یا اس کے صالح ارکان ان کی طرف توجہ کریں۔

(۳) رہے مباح معروفات، تو شریعت کی زبان میں ہر وہ چیز اور فعل مباح ہے جس کی صراحت منع نہ کی گئی ہو۔ اسی تعریف کی بنا پر مباحات محدود نہیں ہیں کہ جن کی اجازت کی تصریح کر دی ہو ان کے معنوں میں ہمیں صاف طور پر اختیار دیا گیا ہو، بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے، حتی کہ چند گنی ہوئی ممنوعات کو چھوڑ کر دنیا میں سب کچھ مباح ٹھیرتا ہے۔ یہی اباحت کا وسیع دائرہ ہے جس میں شریعت نے ہم کو آزادی عمل دی ہے، اور اسی دائرے میں ہم کو اپنی ضرورتوں کے مطابق قوانین و ضوابط اور طریق کار خود تجویز کرنے کے اختیارات حاصل ہیں۔

منکرات کو شریعت میں دو قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حرام یعنی قطعی ممنوع۔ دوسرے مکروہ یعنی ناپسندیدہ۔

حرام وہ ہے جس سے قطعی پرہیز، انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس سے پاک رکھنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے، اور شریعت میں اس کے متعلق صاف صاف احکام دیئے گئے ہیں۔

رہا مکروہ تو اس کے متعلق شارع کسی نہ کسی طور پر اشارتاً یا کنایتاً ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے جس سے با آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس درجہ میں ناپسندیدہ ہے۔ بعض مکروہات حرام کے قریب ہیں، اور بعض مباح کی سرحد سے ملے ہوئے ہیں، اور بہت سے ان کے درمیانی مراتب پر ہیں۔ بعض کو روکنے اور بند کرنے کا شریعت کے نظام میں بندوبست کیا گیا ہے اور بعض کو ناپسندیدہ قرار چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ سوسائٹی خود یا اس کے صالح عناصر ان کا سد باب کریں۔

شریعت کی ہمہ گیری

معروف اور منکر کے متعلق یہ احکام ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مذہبی عبادات، شخصی کردار، اخلاق اور عادات، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، نشست و برخاست، بات چیت، خانگی زندگی، معاشرتی تعلقات، معاشی معاملات، ملکی انتظام، شہریت کے حقوق اور واجبات، قیام عدل کا انتظام، حکومت کے طریقے، صلح و جنگ، اور دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات، غرض زندگی کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں رہ گیا ہے جس کے متعلق شریعت

کسی جز کو جب چاہیں اس سے الگ قائم کر لیں بغیر اس کے کہ دوسرے اجزاء اس کے ساتھ ہوں۔ اس طرح
خود دوسرے عناصر کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ہی کام کر سکتا ہے اور آپ
اس کی خوبی کے ثمرات صحیح طور سے صرف اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب کہ پورے نظامِ اسلامی کے
تناسب اور توازن میں اس کو کام کرتے ہوئے دیکھیں۔

نئی نسل کے بعض اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پیدا ہوتی ہیں ان میں سے
اکثر کی وجہ یہی ہے کہ پورے اسلام پر بحیثیت مجموعی نگاہ ڈالے بغیر اس کے کسی ایک جز کو نکال لیا جاتا
ہے، اور پھر یا تو اسے موجودہ غیر اسلامی نظامِ زندگی کے اندر رکھ کر دیکھنے کی کوشش
کی جاتی ہے یا پھر بجائے خود اسی جز کو ایک مستقل چیز سمجھ کر اس کے حسن و قبح کا فیصلہ کیا جاتا
ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی قانونِ فوجداری کی بعض دفعات پر آج کے لوگ بہت ناک بھوں
چڑھاتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ جس نقشۂ زندگی میں یہ قانونی دفعات رکھی گئی ہیں اس
کے اندر ان کے ساتھ ایک نظامِ معیشت، ایک نظامِ معاشرت، ایک نظامِ حکومت اور ایک نظامِ
تعلیم و تربیت بھی ہے جو اگر ساتھ نہ ہو، یعنی اجتماعی زندگی میں کام نہ کر رہا ہو تو پھر ان دفعات کو
قانون کی کتاب سے نکال کر عدالت کے کمرے میں جاری کر دینا خود اسی نقشۂ زندگی کے بھی خلاف
ہے۔

بلاشبہ اسلامی قانون چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دیتا ہے۔ مگر یہ حکم ہر سوسائٹی میں جاری کرنے
کے لیے نہیں دیا گیا ہے، بلکہ اسے اسلام ہی کی اس سوسائٹی میں جاری کرنا مقصود تھا جس کے
مالداروں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہو، جس کا بیت المال ہر حاجت مند کی امداد کے لیے کھلا ہو، جس
کی ہر بستی پر مسافروں کی تین دن ضیافت لازم کی گئی ہو، جس کے نظامِ شریعت میں سب
لوگوں کے لیے بالکل یکساں حقوق اور برابر کے مواقع ہوں، جس کے معاشی نظام میں طبقوں کی
اجارہ داری کے لیے کوئی جگہ نہ ہو اور جائز کسبِ معاش کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوں،
جس کے نظامِ تعلیم و تربیت نے ملک کے عام افراد میں خدا کا خوف اور اس کی رضا کا شوق پیدا
کر دیا ہو، جس کے اخلاقی ماحول میں نیکی، مصیبت زدوں کی دستگیری، حاجت مندوں کی
اعانت اور گرتوں کو سہارا دینے کا عام چرچا ہو، اور جس کے بچے بچے کو یہ سبق دیا گیا ہو کہ تو

روا نہیں ہے اگر تیسرا ہمسایہ بھوکا ہو اور وہ خود پیٹ بھر کر کھانا کھا بیٹھے۔ برعکس اس کی موجودہ سوسائٹی کے لیے نہیں دیا گیا تھا جس میں کوئی شخص کسی کو قرض بھی سود کے بغیر نہیں دیتا، جس میں بیت المال کی جگہ بنک اور انشورنس کمپنی ہے، جس میں حاجت مند کے لیے مدد کو بڑھنے والے ہاتھ کی جگہ احتکار اور سٹہ بازی ہے، جس کا اخلاقی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک شخص کی کمائی میں دوسرے کا کوئی حصہ نہیں بلکہ ہر شخص اپنی کمائی کا خود تنہا مالک ہے، جس کا معاشرتی نظام بعض خاص طبقوں کو خصوصی امتیازی حقوق دیتا ہے، جس کا معاشی نظام چند خوش نصیب اور چالاک لوگوں کو ہر طرف سے دولت سمیٹ لینے کا پورا موقع دیتا ہے، اور جس کا سیاسی نظام اپنے قوانین کے ذریعہ سے انہی کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے۔ ایسی سوسائٹی میں تو چور کا ہاتھ کاٹنا کیا معنی، شاید اکثر حالات میں تو اس کو سرے سے کوئی سزا دینا ہی درست نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کی ایک سوسائٹی میں چوری کو جرم قرار دینا دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ خود غرض اور حرام خور لوگوں کے مال کی حفاظت قانون کے پیش نظر ہے۔ برعکس اس کے اسلام وہ سوسائٹی پیدا کرتا ہے جس میں کسی شخص کے لیے چوری پر مجبور ہونے کا کوئی موقع نہ ہو، جو ضرورت مند انسانوں کی جائز ضروریات پوری کرنے کے لیے لوگ خود ہی رضاکارانہ طور پر کمربستہ ہوں، اور حکومت کی طرف سے بھی اس کی دستگیری کا پورا انتظام ہو۔ پھر جو شخص اس کے باوجود چوری کرے اُس کے لیے اسلامی قانون ہاتھ کاٹنے کی عبرتناک سزا تجویز کرتا ہے، کیونکہ ایسا شخص ایک شریف، عادل اور فیاض سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔

اسی طرح اسلامی قانونِ تعزیرات زنا پر سو کوڑے مارتا ہے اور شادی شدہ زانی کو رجم کرتا ہے۔ مگر کس سوسائٹی میں؟ اُس میں جس کے پورے نظامِ تمدن کو شہوت انگیز اسباب سے خالی کیا گیا ہو، جس میں عورتوں اور مردوں کی مخلوط معاشرت نہ ہو، جس میں بن سنور کر عورتوں کا سرِ عام پھرنا بند ہو، جس میں نکاح کو نہایت آسان کر دیا گیا ہو، جس میں نیکی اور تقویٰ اور پاکیزگیٔ اخلاق کا عام چرچا ہو، اور جس کے ماحول میں خدا کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہتی ہو۔ برعکس اس گندی سوسائٹی کے لیے نہیں ہے جس میں ہر طرف جنسی جذبات کو بھڑکانے کے اسباب پھیلے ہوئے ہیں، فلمیں اور گھر گھر فحش گیت گونج رہے ہیں، جا بجا فحش اشاعتوں کی تصویریں لگی ہوئی

ہیں۔ شہر شہر اور قصبے قصبے میں نادیِ عشق کھل رہے ہیں۔ نہایت کھلی اور بے باکی آزادی کے ساتھ فحش
ہو رہا ہے۔ جنسی قسم کی تصویریں گھر گھر پھیل رہی ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں جنسی اختلاط کا رواج
بڑھ رہا ہے اور نظامِ معاشرت نے اپنے بیہودہ معیاروں سے نکاح کو بہت مشکل بنا دیا ہے۔
ظاہر ہے کہ ایسی سوسائٹی میں تو زنا کرنے والے کو سزا دینے کے بجائے زنا سے پرہیز کرنے
والے کو انعام یا کم از کم غیر معمولی بہادری کا خطاب ملنا چاہیے۔

شریعت کا قانونی حصہ

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس اصطلاح کے مطابق شریعت کے جن حصوں
کو ہم قانون کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں وہ زندگی کی ایک مکمل اور جامع اسکیم کا جز ہے۔ یہ جز بجائے
خود کوئی مستقل چیز نہیں ہے کہ اسے الگ کر کے اسے جاری کیا جا سکے۔ اگر ایسا کیا
بھی جائے تو نہ اسلامی قانون کا اجرا ہوگا، نہ اس سے وہ نتائج حاصل ہو سکیں گے جو اسلام
کے پیشِ نظر ہیں، اور نہ یہ حرکت خود شارع کے منشا کے مطابق ہوگی۔ شارع کا اصل منشا پوری
پوری اسکیم کو اجتماعی زندگی میں جاری کرنا ہے، اور اسی اسکیم کے پورے عمل درآمد ہی میں اسلامی
قانون کا اجرا بھی ٹھیک طور پر ہو سکتا ہے۔

شریعت کی یہ اسکیم بہت سے حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعض حصے ایسے ہیں جن کو نافذ
کرنا ہر مومن کا اپنا کام ہے۔ کوئی خارجی طاقت ان کو نافذ نہیں کر سکتی۔ بعض حصے ایسے ہیں جن کو
اسلام اپنے تزکیۂ نفس اور تربیتِ اخلاق اور تعلیم و تبلیغ کے پروگرام سے نافذ کرتا ہے۔ بعض حصوں
کو جاری کرنے کے لیے وہ رائے عام کی طاقت استعمال کرتا ہے۔ بعض حصوں کو وہ مسلم
سوسائٹی کے رسوم و رواج اور معاشرت کی شکل میں نافذ کرتا ہے۔ اور ان سب کے ساتھ ایک بہت بڑا
حصہ ایسا ہے جسے نافذ کرنے کے لیے وہ تقاضا کرتا ہے کہ مسلم سوسائٹی اپنے اندر سیاسی اقتدار
پیدا کرے، کیونکہ وہ اقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتا۔ یہ سیاسی اقتدار اس غرض کے لیے مطلوب ہے
کہ شریعت کے تجویز کردہ نظامِ زندگی کی حفاظت کرے، اس کو بگڑنے سے روکے، اس کے منشا
کے مطابق بھلائیوں کے نشوونما اور برائیوں کے استیصال کا انتظام کرے۔ اور اس کے ان احکام
کو نافذ کرے جن کی تنفیذ کے لیے ایک نظامِ عدالت کا ہونا ضروری ہے۔

معاملہ عقائد کی تحصیل کرنے کے بعد اس کی مدد کی الجھنیں خود ہی سلجھتی چلی جاتی ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ ہم کسی قانون پر بحث کر رہے ہیں جو قانون ملکی ہے نہ کہ قانون شخصی۔ جہاں تک شخصی معاملات کا تعلق ہے، اس کے بارے میں تو یہ مسلّم ہے کہ ہر گروہ پر اس کا اپنا قانون ہی جاری ہوگا۔ یہ حق دنیا میں سب سے پہلے اور سب سے اعلیٰ پیمانے کے ساتھ اسلام نے اہل الذمہ کو دیا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی وہ ہے جس سے دوسروں نے ملکی قانون اور شخصی قانون کا فرق سیکھا ہے۔ یہ اصول مسلم ہے کہ جب کسی ریاست کی آبادی مختلف المذاہب لوگوں پر مشتمل ہو اس میں سب گروہوں کے شخصی معاملات ان کے شخصی قوانین کے تحت ہونے چاہئیں۔ لہٰذا کسی غیر مسلم جماعت کو ہم سے یہ اندیشہ تو ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ ہم ان کے شخصی معاملات پر اپنے شخصی قوانین کو مسلط کر کے اس خاص معاملے میں ان سے عدم رواداری کریں گے جو دراصل جداگانہ ہی قائم کیا ہوا قاعدہ ہے اور جس کے متعلق اسلام نے ہم کو قطعی اور واضح احکام دے رکھے ہیں۔

اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اس ملک میں قانون ملکی کس قسم کا ہو؟ انصاف کی رو سے اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قانون ملکی وہی ہونا چاہیے جو اکثریت کے نزدیک صحیح ہو۔ اقلیت بہت بے چارہ زیادہ سے زیادہ حق طلب کر سکتی ہے وہ ہم اس سے پہلے ہی تسلیم کر رہے ہیں۔ لیکن وہ بہرحال یہ مطالبہ کس طرح کر سکتی ہے کہ اس کو راضی کرنے کے لیے ہم لوگ اپنے عقیدے سے دست کش ہو جائیں اور کسی ایسے قانون کو اپنے ملک میں جاری کرنے لگیں جس کو ہم حق نہیں سمجھتے؟ جب تک ہم اپنے ملک میں خود مختار نہ تھے ہمیں بہ جبر ایک باطل قانون کو اداروں کا چلانا تھا۔ اس کی ذمہ داری سے ہم بری ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب جب کہ عنان اقتدار ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے، اگر ہم جان بوجھ کر اسلامی قانون کی جگہ کوئی دوسرا قانون جاری کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم قومی حیثیت سے بالارادہ مرتد ہو رہے ہیں۔ کیا کوئی معقول اقلیت ہم پر یہ حق رکھتی ہے کہ اس کی خاطر ہم اپنا دین چھوڑ دیں؟ اور کیا کوئی اقلیت کسی عقیدہ اکثریت سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ اپنی رائے میں جس چیز کو حق سمجھتی ہو اسے چھوڑ دے اور وہ چیز اختیار کرے جسے اقلیت صحیح سمجھتی ہو؟ یا پھر کیا کوئی معقول انسان یہ

پاکستان میں اسلامی قانون کس طرح نافذ ہو سکتا ہے؟

(یہ تقریر ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو لا کالج لاہور میں کی گئی تھی۔)

اس سے پہلے میں آپ کے سامنے ایک تقریر میں وضاحت کر چکا ہوں کہ اسلامی قانون کی حقیقت کیا ہے، اس کی روح اور اس کا مقصد کیا ہے، اس کے بنیادی اصول کیا ہیں، مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا اس کے ساتھ تعلق کیا ہے، ہم کیوں اپنے ملک میں اسے نافذ کرنے کے پابند ہیں، اور وہ شبہات کیا اصل رکھتے ہیں جو اس کے بارے میں عام طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ میری وہ تقریر محض ایک تمہیدی تقریر تھی۔ اب میں قدرے تفصیل کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ہم اس ملک میں اسلامی قانون کا از سرِ نو اجرا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے لیے کیا تدبیریں کرنی ہوں گی۔

فوری انقلاب نہ ممکن ہے نہ مطلوب

اس مسئلے پر بحث سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس غلط فہمی کو رفع کر دوں جو اسلامی قانون کے اجرا کے متعلق کثرت سے لوگوں کے ذہن میں پائی جاتی ہے۔ لوگ جب سنتے ہیں کہ ہم یہاں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس حکومت میں ملک کا قانون اسلامی قانون ہوگا تو انہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید نظامِ حکومت کے تغیر کا اعلان ہوتے ہی تمام پچھلے قوانین یک لخت

ختم ہو جائیں گے اور اسلامی قانون بیک وقت نافذ کر دیا جائے گا۔ یہ غلط فہمی صرف عام لوگوں
ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ اچھے خاصے دین سمجھنے والے بھی اس میں مبتلا ہیں۔ ان کے نزدیک بس ہونا
چاہیے کہ ادھر اسلامی حکومت قائم ہو اور ادھر فوراً ہی غیر اسلامی قوانین کا نفاذ بند اور اسلامی قوانین کا
نفاذ شروع ہو جائے۔ درحقیقت یہ لوگ اس بات کو بالکل نہیں سمجھتے کہ ایک ملک کا قانون
اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ انہیں معلوم نہیں
ہے کہ جب تک کسی ملک کا نظام زندگی اپنے سارے شعبوں کے ساتھ نہ بدلے اس کے
قانونی نظام کا بدل جانا ممکن نہیں ہے۔ انہیں اس کا بھی احساس نہیں ہے کہ پچھلے ڈیڑھ سو برس
سے ہم پر جو انگریزی اقتدار مسلط رہا ہے اس نے کس طرح ہماری زندگی کے پورے نظام کو
اسلامی اصولوں سے ہٹا کر غیر اسلامی اصولوں پر چلایا ہے اور اب اسے پھر بدل کر دوسری بنیادوں
پر قائم کرنا کتنی محنت، کتنی کوشش اور کتنا وقت چاہتا ہے۔ یہ لوگ ان مسائل پر بصیرت نہیں
رکھتے۔ اس لیے اجتماعی نظام کی تبدیلی کو ایک کھیل سمجھتے ہیں اور ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا خواب
دیکھتے ہیں۔ مگر عملاً یہی لوگ ان لوگوں کو جو اسلامی نظام سے فرار کی راہیں ڈھونڈ رہے
ہیں، یہ موقع دے دیتے ہیں کہ وہ اس تجویز کا مذاق اڑائیں اور اس کے داعیوں کا استخفاف
کریں۔

تدریج کا اصول

اگر ہم فی الواقع اپنے ہاں اس تجویز کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں فطرت کے اس اٹل
قاعدے سے غافل نہ ہونا چاہیے کہ اجتماعی زندگی میں جتنے تغیرات بھی ہوتے ہیں بتدریج ہی
ہوا کرتے ہیں۔ انقلاب جتنا اچانک اور جس قدر یکلخت ہوگا اتنا ہی وہ ناپائدار ہوگا۔
ایک مستحکم اور پائندہ انقلاب کے لیے یہ بالکل ضروری ہے کہ زندگی کی ہر جہت اور ہر
پہلو میں پورے توازن کے ساتھ عمل ہو تاکہ اس کا ہر گوشہ دوسرے گوشے کو سہارا دے سکے۔

عہد نبوی کی مثال

اس کی بہترین مثال خود وہ انقلاب ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں برپا کیا تھا۔ جو
شخص عرب کے حالات سے ذرا سی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ آپ نے

گزشتہ میں بعد مسلسل عمل جاری تھا۔ مگر اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی اس کو یک لخت ختم نہیں
کر دیا گیا۔ بلکہ ملک کے پہلے سماجی نظام کو بدل کر جب فضا اس کے حق میں ڈھل گئی تب کہیں سنہ
۸ ہجری میں سود کی قطعی حرمت کا قانون جاری کیا گیا۔ یہ کام بالکل ایک معمار کا کام تھا جس نے اپنے
پیش نظر نقشہ کی عمارت بنانے کے لیے پلاٹ اور زمین حاصل کی۔ پھر اس زمین کو صاف کیا۔ پھر زمین
ہموار کی۔ بنیادیں کھودیں۔ پھر ایک ایک اینٹ رکھ کر ہر جہت سے عمارت کی تعمیر اوپر تک
لے گیا۔ اور چند سال کی مسلسل محنت کے بعد آخر کار وہ عمارت مکمل کر دی جس کا خاکہ اس کے ذہن
میں تھا۔

انگریزی نمونہ کی مثال

قریب سو سال پہلے ہمارے ملک پر جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو کیا
انھوں نے یک لخت یہاں اسلامی نظام بدل ڈالا تھا؟ نہیں۔ ان کی حکومت سے پہلے ہزار سات
سو برس سے یہاں کا پورا نظام زندگی اسلامی طرز پر چل رہا تھا۔ اس صدیوں کی بنی ہوئی عمارت
کو ڈھا دینا اور مغربی اصول و نظریات کے مطابق ایک دوسرے نظام کی عمارت کھڑی کر دینا
ایک دن کا کام نہ تھا۔ تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی اقتدار قائم ہونے کے بعد
بھی ایک مدت تک ہندوستان میں اسلامی فوجداری قانون رائج رہا۔ عدالتوں میں قاضی اور مفتی کے
عہدے تھے۔ اسلام کا قانون وراثت نہ صرف مسلمانوں کی حد تک محدود تھا بلکہ وہی ملک کا قانون
(Law of the Land) بھی تھا۔ انگریزوں کو یہاں کا قانونی نظام بدلنے میں تقریباً ایک صدی
لگ گئی۔ انھوں نے تدریجاً یہاں کا نظام بدل کر اپنے مطلب کا کر ڈالا۔ اپنے خیالات
کی اشاعت سے ذہنیتیں بدلیں۔ اپنے اقتدار کے اثر سے لوگوں کے اخلاق بدلے۔ اپنی
پالیسی کے ذریعے معاشی نظام بدلا۔ اور جیسے جیسے یہ مختلف قسم کے ہمہ گیر اثرات یہاں کی
اجتماعی زندگی کو بدلتے گئے اسی کے مطابق پرانے قوانین منسوخ اور نئے قوانین جاری
ہوتے چلے گئے۔

تدریج ناگزیر ہے

اب اگر ہم یہاں پھر اسلامی قانون جاری کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے بھی انگریزی حکومت

سلسلہ ہی توڑ کر رکھ دیا اور نئے قوانین ثبت کر دیے جن میں ایک غیر قوم کے عملی ہیں ہے۔ ہمارا پرانا نظامِ تعلیم زندگی اور اس کے مسائل سے ایک مدت دراز تک بے تعلق رہنے کے باعث اس قدر بے جان ہو چکا ہے کہ اس کے مدارس سے ایسے آدمی نہیں نکل سکتے جو ایک جدید ترقی یافتہ ریاست کے جج، مجسٹریٹ بنائے جا سکیں۔ دوسری طرف جدید نظامِ تعلیم نے جو آدمی تیار کیے ہیں وہ اسلام اور اس کے قوانین سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ان میں ایسے افراد بھی خال خال ہی پائے جاتے ہیں جن کی ذہنیت ہی کم از کم اس تعلیم کے زہریلے اثرات سے محفوظ رہ گئی ہو۔ پھر دو ڈیڑھ صدی تک عملاً معطل رہنے کی وجہ سے ہمارا قانونی ذخیرہ بھی زمانے کی رفتار سے پیچھے رہ گیا ہے اور اسے موجودہ دور کی ضروریات کے لیے کارآمد بنانا کافی محنت چاہتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک طویل مدت تک اسلامی شریعت سے آزاد اور انگریزی حکومت کے زیر سایہ رہتے رہتے ہمارا اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت اور سیاست کا نقشہ اسلامی نقشے سے بہت مختلف ہو چکا ہے۔ اس حالت میں ملک کے قانونی نظام کو یک لخت بدل دینا ــــ اگر عملاً ممکن بھی ہو ــــ مفید نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس صورت میں زندگی کا نظام اور قانونی نظام دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ بلکہ باہم متصادم ہوں گے، اور یہ قانونی تغیر ویسا ہی مضر ہوگا جو ایک پودے کو ایسی آب و ہوا اور ایسی زمین میں لگا دینے سے ہوا کرتا ہے جو اس کی طبع سے کوئی مناسبت نہ رکھتی ہو۔ لہٰذا یہ امر ناگزیر ہے کہ جس اصلاح و تغیر کے ہم طالب ہیں وہ تدریج کے ساتھ ہو، اور قانونی تبدیلیاں اخلاق، تعلیم، معاشرت، تمدن، معیشت اور سیاست کی تبدیلیوں کے ساتھ متوازن طریقہ سے کی جائیں۔

ایک غلط بہانہ

لیکن تدریج کے اس معقول اور بجائے خود بالکل صحیح اصول کو بہانہ بنا کر جو لوگ اس بات کے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سر دست تو ہمیں ایک غیر دینی ــــ بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ایک بے دین ــــ ریاست ہی قائم ہونی چاہیے، پھر جب اسلامی ماحول تیار ہو جائے گا اور اسلامی ریاست بھی قائم ہو جائے گی جو اسلامی قوانین جاری کر سکے، وہ سراسر ایک

بالعموم اس زبان سے ناواقف ہے۔ اس ناواقفیت کی وجہ سے اور کچھ غلط بیانیوں کی بنا پر ہمارے پڑھے لکھے لوگ عموماً اس فقہی ذخیرے کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں رکھتے ہیں حتیٰ کہ ان میں سے بہت سے لوگ تو یہاں تک کہہ بیٹھتے ہیں کہ نماز، روزہ وغیرہ کی انفرادی بحثوں کے اس دفتر بے معنی کو دریا برد کر دیا جائے اور نئے سرے سے اجتہاد کا کام چلایا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے جاہلانہ خیالات ظاہر کرتے ہیں وہ محض اپنے علم ہی کی کمی نہیں بلکہ ذوق کے فقدان کا بھی مظاہرہ کرتے ہیں۔ اگر یہ اپنے بزرگوں کے فقہی کارناموں کا واقعی مطالعہ کریں تو مجھے یقین ہے کہ انہیں پچھلی باتوں پر خود ہی شرم آنے لگے گی۔ انہیں معلوم ہو گا کہ پچھلی بارہ تیرہ صدیوں میں ہمارے اسلاف محض فضول بحثوں میں وقت ضائع نہیں کرتے رہے ہیں بلکہ انہوں نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے نہایت قیمتی میراث چھوڑی ہے۔ وہ بہت سی ابتدائی منزلیں ہمارے لیے تعمیر کر گئے ہیں اور ہم سے قدر کی ناشناسی ہو گی اگر ہم محض جہالت کی بنا پر اس بنی بنائی عمارت کو ڈھا کر نئے سرے سے ہی تعمیر کی ابتدا کرنے پر اصرار کریں۔ ہمارے لیے عقلمندی یہی ہے کہ جو کچھ وہ بنا گئے ہیں اسے اپنی نسل کی ضرورتوں کے لیے لے جائیں اور آگے جن چیزوں کی ضرورت پیش آتی جائے ان کے لیے مزید تعمیر کرتے رہیں۔ ورنہ ہر نسل اگر یوں ہی اپنے سے پہلی نسلوں کے کام پر پانی پھیرتی رہے اور نئے سرے سے سب کچھ بنانے کی کوشش کرے تو یقیناً ترقی کا رتھ ایک قدم آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔

میں اس سلسلے کی پہلی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ پچھلی صدیوں میں دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر مسلمانوں کی جو متمدن سلطنتیں قائم ہوئی تھیں ان سب کا قانون فقہ اسلامی ہی تھی۔ مسلمانوں نے ان ملکوں پر محض حکومت ہی نہیں کی تھی بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کا تمدن ان کے اندر موجود تھا اس کے وسیع تعلقات کی ہر ہر ضرورت کا لحاظ کر کے فقہائے اسلام نے قوانین کی تشکیل کی تھی۔ یہی فقہ عملاً عدالتوں کے علما مجسٹریٹ اور چیف جسٹس ہوتے تھے اور ان کے فیصلوں سے نظائر کا ایک وسیع ذخیرہ فراہم ہو گیا تھا۔ انہوں نے قانون کے ہر شعبے کو، ہر شعبۂ زندگی سے متعلق کیا ہے۔ محض دیوانی و فوجداری قوانین ہی نہیں، دستوری اور بین الاقوامی قوانین کے متعلق بھی ان کے کام میں ایسی ایسی لطیف بحثیں ملتی ہیں کہ ان کا مطالعہ کر کے ایک متمدن دور کا آدمی ان کی شدت نظری کی داد دیئے بغیر نہیں

ہو سکتا۔ ضرورت ہے کہ اہلِ علم کا ایک گروہ اُن بزرگوں کے چھوٹے بڑے ذخیرہ کا جائزہ لینے پر مامور کریں۔ اس عہد کی زندگی کی قانونی کتابوں کے طرز پر اس تمام مواد کو مرتب کرائے جو اس ذخیرے میں مل سکتا ہو۔

خصوصیت کے ساتھ چند کتابیں تو ایسی ہیں جن کا اُردو زبان میں منتقل کر لینا نہایت ضروری ہے۔

۱۔ احکام القرآن پر تین کتابیں جصاص، ابن العربی اور قرطبی۔

ان کتابوں کا مطالعہ ہمارے قانونی طلبہ کو قرآن فہمی، طرزِ استنباط کی بہترین تربیت دے گا۔ ان میں قرآن کی تمام احکامی آیات کی تفسیر کی گئی ہے، احادیث اور آثارِ صحابہ میں ان کی جو تشریح ملتی ہے وہ سب نقل کیا گیا ہے، اور مختلف ائمہ مجتہدین نے ان سے جو احکام نکالے ہیں انہیں مع ان کے دلائل بہت مفصل بیان کر دیا گیا ہے۔

۲۔ دوسرا قیمتی ذخیرہ کتبِ حدیث کی شرحوں کا ہے جن میں احکام کے متعلق نظائر کے تشریحی بیان کا بھی بہترین مواد ملتا ہے۔ ان میں خاص طور پر یہ کتابیں اُردو میں منتقل ہونی چاہئیں۔

بخاری پر — فتح الباری اور عینی

مسلم پر — نووی اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی فتح الملہم۔

ابوداؤد پر — عون المعبود اور بذل المجہود۔

موطا پر — شاہ ولی اللہ صاحب کی المسوّی اور المصفّٰی اور موجودہ دور کے ایک ہندوستانی عالم کی اوجز المسالک

منتقی الاخبار پر — شوکانی کی نیل الاوطار

مشکوٰۃ پر — مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی التعلیق الصبیح۔

علم الآثار میں — امام طحاوی کی شرح معانی الآثار۔

۳۔ اس کے بعد ہمیں فقہ کی ان بڑی بڑی کتابوں کا لینا چاہیے جو اس علم میں امہاتِ کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ یہ کتابیں منتقل ہونی چاہئیں۔

فقہ حنفی پر	امام سرخسی کی مبسوط اور شرح سیر الکبیر۔ کاسانی کی بدائع الصنائع۔ ابن ہمام کی فتح القدیر مع ہدایہ۔ اور فتاویٰ عالمگیری۔
فقہ شافعی پر	کتاب الام۔ شرح المہذب اور مغنی المحتاج
فقہ مالکی پر	المدونہ اور کوئی ہر کتاب جس کا اہلِ علم انتخاب کریں۔
فقہ حنبلی پر	ابن قدامہ کی المغنی
فقہ ظاہری پر	ابن حزم کی المحلی
مذاہب اربعہ پر	ابن رشد کی بدایۃ المجتہد۔ اور علماء مصر کی مرتب کردہ الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔ نیز ابن تیمیہ کی فتاویٰ میں سے وہ حصے جو قانونی مسائل سے متعلق ہیں۔
مخصوص مسائل پر	امام ابو یوسف کی کتاب الخراج۔ یحییٰ بن آدم کی الخراج۔ ابو عبید القاسم کی کتاب الاموال۔ ہلال بن یحییٰ کی احکام الوقف۔ ماوردی کی الاحکام السلطانیہ۔

٢۔ پھر ہمیں اصولِ قانون اور حکمتِ تشریع کی بھی چند اہم کتابوں کو اردو کا جامہ پہنانا چاہیے تاکہ ان کی بدولت ہمارے اہلِ قانون میں اسلامی فقہ کا صحیح فہم اور اس کی روح سے گہری واقفیت پیدا ہو۔ میرے خیال میں اس موضوع پر یہ کتابیں قابلِ انتخاب ہیں۔

ابن حزم کی اصول الاحکام۔ علامہ آمدی کی الاحکام فی اصول الاحکام۔ خضری کی اصول الفقہ۔ شاطبی کی الموافقات۔ ابن القیم کی اعلام الموقعین۔ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ۔

ان کتابوں کے متعلق ہمیں صرف اتنا ہی نہیں کرنا ہے کہ محض ان کے ترجمے اردو زبان میں کر ڈالے جائیں، بلکہ ان کے مضامین کو موجودہ زمانہ کی قانونی کتابوں کے طرز پر از سرِ نو مرتب بھی کرنا ہوگا۔ نئے عنوانات قائم کرنے ہوں گے، منتشر مسائل کو ایک ایک عنوان کے تحت جمع کرنا ہوگا۔ فہرستیں بنانی پڑیں گی اور انڈکس تیار کرنے ہوں گے۔ اس محنت کے بغیر یہ

کتابیں آج کل کی ضروریات کے لیے پوری طرح کارآمد ہو سکیں گی۔ قدیم زمانے کا طریق تدوین کچھ
اور تھا اور اس زمانے میں قانونی مسائل کے لیے اتنے مختلف عنوانات بھی پیدا نہیں ہوئے
تھے جتنے آج پیدا ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لوگ دستوری قانون اور بین الاقوامی قانون
کے لیے کوئی الگ نام نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے مسائل کو وہ صلح، خراج، جہاد، امامت اور
میراث کے ابواب میں بیان کرتے تھے۔ فوجداری قانون ان کے ہاں کوئی الگ عنوان نہ تھا،
بلکہ اس کے مسائل حدود، جنایات اور دیات کے مختلف عنوانوں میں تقسیم کر دیے جاتے تھے۔
دیوانی قانون کو بھی انہوں نے الگ مرتب نہیں کیا تھا بلکہ یہ بھی متفرق قوانین ہی کی جہت سے
عنوانات کے تحت اس کو جمع کر دیا تھا۔ ضابطہ اور معاشیات وغیرہ نام ان کے ہاں نہ تھے۔
ان علوم کے مسائل کو وہ کتاب البیوع، کتاب الصرف، کتاب المضاربہ، اور کتاب المزارعہ
وغیرہ عنوانات کے تحت بیان کرتے تھے۔ اسی طرح قانون شہادت، ضابطۂ دیوانی، ضابطۂ
فوجداری، اور ضابطۂ عدالت وغیرہ جدید اصطلاحیں ان کے ہاں نہیں ہوتی تھیں۔ ان قوانین کے
مسائل ان کی کتابوں میں کتاب القاضی، کتاب الدعویٰ، کتاب الاکراہ، کتاب الشہادات و
کتاب الاقرار وغیرہ عنوانات کے تحت ملتے ہیں۔ اب اگر ان کتابوں کا صرف اردو میں منتقل کر
دیا جائے تو ان سے کما حقہ فائدہ اٹھانا مشکل ہے۔ ضرورت ہے کہ کچھ قانونی ماہر لکھنے والے
ان پر کام کریں اور ان کی ترتیب بدل کر ان کے مواد کو جدید طرز پر مرتب کر ڈالیں۔ یہ غرض
اگرچہ بہت زیادہ محنت طلب کام ہے لیکن اتنا کام تو ضرور ہی ہونا چاہیے کہ ان کی فہرستیں
پوری علمی چھان بین کے ساتھ بنائی جائیں اور مختلف علوم کے انڈکس بنا دیے جائیں جن کے ذریعے سے
ان میں مسائل کا تلاش کرنا آسان ہو جائے۔

تدوینِ احکام

اس سلسلہ کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ذی اقتدار علماء اور ماہرین قانون کی ایک ایسی
مجلس مقرر کی جائے جو اسلام کے قانونی احکام کو جدید دور کی کتب قانون کے طرز پر دفعہ وار
مدوّن (Codify) کرے۔

میں اپنی پہلی تقریر میں وضاحت کے ساتھ یہ بات آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی

نقطۂ نظر سے قانون کا اطلاق ہر اس قول پر نہیں ہوتا جو کسی فقیہ یا امام مجتہد کی زبان سے نکلا ہو یا کسی فقہی کتاب میں لکھا ہوا ہو۔ قانون صرف چار چیزوں کا نام ہے۔

۱۔ کوئی حکم جو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دیا ہو۔

۲۔ کسی قرآنی حکم کی تشریح یا تخصیص یا کوئی مستقل حکم جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

۳۔ کوئی استنباط، قیاس، اجتہاد یا استحسان جس پر اُمت کا اجماع ہو، یا جمہور علماء کا ایسا فتویٰ ہو جسے ہمارے ملک کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت تسلیم کرتی رہی ہے۔

۴۔ کوئی ایسا امر جس پر ہمارے ملک کے اہل حل و عقد کا اجماع یا جمہوری فیصلہ ہو جائے۔

میری تجویز یہ ہے کہ پہلی تین قسموں کے احکام ماہرین کی ایک جماعت ایک مجموعۂ احکام (Code) کی شکل میں مرتب کر دے۔ پھر جو قوانین آئندہ اجماع یا جمہوری فیصلوں سے بنتے جائیں ان کا اضافہ جدید کتب آئین میں کیا جاتا رہے۔ اس قسم کا ایک مجموعۂ احکام ہی دراصل قانون کی کتاب ہوگی، اور باقی تمام فقہی کتابیں اس کے لیے شروح (Commentary) کا کام دیں گی۔ نیز اس طرح عدالتوں میں قانون اسلامی کی تنفیذ اور کالجوں میں اس قانون کی تعلیم بھی آسان ہو جائے گی۔

قانونی تعلیم کی اصلاح

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے ہاں قانون کی تعلیم کا سابق طریقہ بدل دیں اور اپنے لاء کالجوں کے نصاب اور طریق تربیت میں ایسی اصلاحات کریں جن سے طلبہ اسلامی قانون کی تنفیذ کے لیے علمی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے تیار ہو سکیں۔

اس وقت تک جو تعلیم ہمارے قانونی مدرسوں کالجوں میں دی جا رہی ہے وہ ہمارے نقطۂ نظر سے بالکل ناکارہ ہے۔ اس سے فارغ ہو کر نکلنے والے طالب علم صرف یہی نہیں کہ اسلامی قانون کے علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں بلکہ ان کی ذہنیت بھی غیر اسلامی قوانین کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور ان کے اندر اخلاقی صفات بھی ویسی ہی پیدا ہو جاتی ہیں جو مغربی قوانین

کے اجراء کے لیے موزوں تر ہیں، مگر قانون اسلامی نافذ کرنے کے لیے قطعاً غیر مفید ہیں۔ اس صورت حال کو جب تک ہم بدل نہ دیں گے ہماری درسگاہوں میں اپنے مقصد کے فقیہ پیدا کرنے کا انتظام نہ کر سکیں گے، ہمارے ہاں وہ آدمی فراہم ہی نہ ہو سکیں گے جو ہماری عدالتوں میں قاضی اور مفتی کے فرائض انجام دینے کے لائق ہوں۔

اس مقصد کے لیے جو تجویز میرے ذہن میں ہے وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ دوسرے اہل علم بھی اس پر غور کریں اور اس میں اصلاح و اضافہ کریں تاکہ ایک اچھی قابل عمل اسکیم بن سکے۔

اس سلسلے میں سب سے مقدم اصلاح یہ ہونی چاہیے کہ آئندہ سے لاء کالجوں میں داخلے کے لیے عربی زبان کی واقفیت ——— اتنی واقفیت جو قرآن، حدیث اور فقہ کا مطالعہ کرنے کے لیے کافی ہو ——— لازم قرار دی جائے۔ اگرچہ ہم اسلامی قانون کی پوری تعلیم اردو میں دینا چاہتے ہیں، اور اس فن کی تمام ضروری کتابوں کو بھی اردو میں منتقل کر لینا چاہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود عربی زبان کے علم کی ضرورت پھر بھی باقی رہے گی۔ اس لیے کہ اسلامی فقہ میں بصیرت بہرحال اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک آدمی اس زبان سے واقف نہ ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا ہے۔ ابتداءً ہمیں لاء کالجوں کے لیے عربی دان امیدوار فراہم کرنے میں دشواری پیش آئے گی۔ ممکن ہے اس غرض کے لیے ہم کو چند سال تک ہر کالج میں ایک مستقل کلاس عربی تعلیم کے لیے کھولنی پڑے اور شاید تعلیم قانون کی مدت میں ایک سال کا اضافہ بھی کر دینا پڑے۔ لیکن آگے چل کر جب ہمارے پورے نظام تعلیم میں عربی بطور ایک لازمی زبان کے شامل ہو جائے گی تو لاء کالجوں میں داخلے کے لیے جو گریجویٹ بھی آئیں گے وہ پہلے ہی عربی زبان سے بخوبی واقف ہوں گے۔

عربی زبان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے طلبہ کو قرآن اور سیرت محمدی کے براہ راست مطالعہ سے دین کا مزاج اور اس کا پورا نظام اچھی طرح سمجھا دیا جائے۔ ہماری عربی درسگاہوں میں بھی ایک مدت دراز سے یہ غلط طریقہ چلا آ رہا ہے

تعلیم کی ابتدا فقہ سے کی جاتی ہے، پھر مذہب (اسکول) کے لوگ اپنے مخصوص فقہی نقطۂ نظر سے حدیث پڑھاتے ہیں اور قرآن کی صرف ایک یا دو بڑی سورتیں محض تبرکاً اعلیٰ درجہ میں کر دی جاتی ہیں۔ بلکہ ان میں بھی کلام الٰہی کی ادبی خوبیوں کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جو فضلاء ان مدرسوں سے نکلتے ہیں وہ قانون کے جزئیات تو بہت خوب واقف ہوتے ہیں مگر جس دین کو قائم کرنے کے لیے یہ قانون بنایا گیا ہے اس کے مجموعی نظام، اس کے مقاصد، اس کے مزاج اور اساس کی روح سے بڑی حد تک نابلد رہتے ہیں۔ ان کو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ دین سے شریعت کا اور شریعت سے فقہی مذاہب کا تعلق کیا ہے۔ وہ قانونی جزئیات اور اپنے مذہب خاص کے فروعی مسائل ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اسی چیز نے ہمارے ہاں فرقہ بندی کے جھگڑے اور تعصبات پیدا کیے ہیں۔ اسی چیز کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی پر فقہی احکام کا انطباق کرنے میں بسا اوقات شریعت کے اہم ترین مقاصد تک نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اب اس غلطی کی اصلاح ہو اور کسی طالب علم کو اس وقت تک قانون نہ پڑھایا جائے جب تک وہ پہلے قرآن اور حدیث سے دین کو اچھی طرح نہ سمجھ لے۔

اس معاملہ میں بھی ہمیں ابتداءً چند سال تک کچھ مشکلات کا سامنا ہوگا کیونکہ قرآن و حدیث سے واقف گریجویٹ نہ مل سکیں گے، اور اس کے لیے شاید ہمیں لا کالجوں ہی میں اس تعلیم کا بھی انتظام کرنا پڑے گا۔ لیکن آگے چل کر جب ہماری عام تعلیمی اصلاحات بار آور ہو جائیں گی تو آسانی کے ساتھ یہ ضابطہ بنایا جا سکے گا کہ لا کالجوں میں صرف وہی طلبہ داخلہ لے سکتے ہیں جو تفسیر اور حدیث کو خصوصی مضامین کی حیثیت سے لے کر بی۔ اے کر چکے ہوں، اور دوسرے مضامین کے طلبہ کو ایک سال زائد ان مضامین پر صرف کرنا ہوگا۔

۳۔ تعلیم قانون کے نصاب میں تین مضامین ضرور شامل ہونے چاہئیں۔ ایک جدید زمانے کے اصول قانون (Jurisprudence) کے ساتھ ساتھ اصول فقہ کا مطالعہ، دوسرے اسلامی فقہ کی تاریخ کا مطالعہ، تیسرے فقہ کے تمام بڑے بڑے مذاہب (اسکولوں) کا غیر متعصبانہ مطالعہ۔ ان تینوں چیزوں کے بغیر طلبہ میں نہ تو فقہ کا گہرا فہم پیدا ہو سکتا ہے نہ ان کے اندر

اجتہادی صلاحیتیں ابھر سکتی ہیں جو اعلیٰ درجہ کے قاضی اور مفتی بننے کے لیے ناگزیر ہیں۔ اور ان کے اندر سے ایسے ماہرین نکل سکتے ہیں جو ہماری تمدنی ترقی پذیر معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تعبیر و قیاس اور اجتہاد و استنباط کے صحیح طریقے استعمال کر کے قوانین بنا سکیں۔ اپنے قانون کے اصولوں کو پوری طرح سمجھے بغیر وہ خود سامنے آنے والے مسائل پر ان کا انطباق کیسے کر سکیں گے۔ یہی فقہی تاریخ کو جانے بغیر نہیں سمجھ سکیں گے کہ اسلامی قانون کا ارتقاء کس طریقے پر ہوا ہے، اور آئندہ کس طریقے پر ہو سکتا ہے۔ فقہائے اسلام کے جمع کیے ہوئے ذخیرے پر وسیع نظر ڈالے بغیر وہ کیونکر اس قابل ہو سکیں گے کہ جب کسی مسئلے میں ایک فقہی مذہب رہنمائی نہ کرتا ہو تو نیا اجتہاد کرنے سے پہلے دوسرے مذاہب فقہ سے استفادہ کریں۔ انہی وجوہ سے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری تعلیم قانون کے نصاب میں یہ تینوں مضامین داخل ہوں۔

۴۔ تعلیم کی اس اصلاح کے ساتھ ہمیں اپنے لاء کالجوں میں طلبہ کی اخلاقی تربیت کا بھی خاص انتظام کرنا ہوگا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے لاء کالج چالاک وکیل، نفس پرست مجسٹریٹ اور بدکردار جج تیار کرنے کی فیکٹری نہیں ہے بلکہ اس کا کام تو ایسے قاضی اور مفتی پیدا کرنا ہے جو پوری قوم میں اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے بلند ترین لوگ ہوں، جن کی راست بازی اور عدل و انصاف پر کامل اعتماد کیا جا سکے، جن کی اخلاقی ساکھ ہر شبہ سے بالاتر ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں سب سے بڑھ کر خدا ترسی، پرہیزگاری اور احساس ذمہ داری کا عنصر موجود ہونا چاہیے۔ یہاں سے نکلنے والے طلبہ اُس مسند کے لیے تیار ہوتے ہیں جس پر کبھی قاضی شریح، امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام احمد بن حنبل اور قاضی ابو یوسف جیسے لوگ بیٹھ چکے ہیں۔ یہاں ایسے مضبوط کیرکٹر کے آدمی تیار ہونے چاہییں جو کسی مسئلہ شرعی میں فتویٰ دیتے وقت یا کسی مقدمہ کا فیصلہ کرتے وقت خدا کے سوا کسی کی طرف نظر نہ کریں۔ کوئی دباؤ، کوئی خوف، کوئی لالچ، کوئی دلچسپی، کوئی محبت اور کوئی غرض ان کو اُس بات سے نہ ہٹا سکے جسے وہ اپنے علم اور اپنے ضمیر کے لحاظ سے حق اور انصاف کی بات سمجھتے ہوں[1]۔

(ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۶۰ء)

---

[1] تقریر کے آخری حصے کی تصریحات یہاں حذف کر دی گئی ہیں۔ پوری تقریر کتابی شکل میں شائع شدہ موجود ہے۔ (مرتب)

مطالبۂ نظامِ اسلامی[1]

یہ ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان نے اپریل و مئی ۱۹۵۲ء میں لاہور، ملتان، کراچی، راولپنڈی، سیالکوٹ اور پشاور کے مقامات پر جماعت اسلامی کے عام اجتماعات میں فرمائی تھیں۔ ان تقریروں کو جن جذبات سے عوام نے سنا ان کے بعد عام طور پر یہ احساس ہوا کہ حصول پاکستان پر ہمارا کام ختم نہیں ہو گیا ہے، بلکہ اصل نصب العین کی طرف قدم بڑھانے کا آغاز ہی ہوا ہے اسے مکمل کرنے کے لیے ابھی مزید محنت و ایثار کی ضرورت ہے۔

اس تقریر کو مرتب کرنے کا وقت ملنے سے پہلے ہی مولانا محترم ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کو پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیئے گئے۔ لیکن چونکہ اس تقریر کی اشاعت کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے اور ملک میں بھی اس کا چرچا ہے اس لیے ہم اخبارات کی مدد سے اسے ہم جلد خود

---

[1] یہ تقریر ۱۹۵۳ء کے آغاز ہی میں پمفلٹ کی صورت میں شائع ہو گئی تھی۔ ترجمان القرآن میں اس کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔ (مرتب)

مرتب کرکے پیش کر رہے ہیں۔

ناظم مکتبہ جماعت اسلامی

بعد از حمد و ثنا،

ہم دوراہے پر کھڑے ہیں

حضرات و خواتین! یہ وقت جس سے ہم آج گزر رہے ہیں، ہماری قومی تاریخ کے نازک ترین اوقات میں سے ہے۔ اس وقت ہم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں اور ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہمارے سامنے جو دو راستے کھلے ہوئے ہیں، ان میں سے کس کی طرف بڑھیں۔ اس موقع پر جو فیصلہ بحیثیت قوم ہم کریں گے وہ نہ صرف ہمارے مستقبل پر بلکہ نہ معلوم کتنی مدت تک ہماری آئندہ نسلوں پر اثر انداز ہوتا رہے گا۔ ہمارے سامنے ایک راستہ تو یہ ہے کہ ہم ان اصولوں پر اپنے نظام زندگی کی بنیادیں کھڑی کریں جو اسلام نے ہم کو دیئے ہیں۔ ہماری انفرادی زندگی ——— ہماری معاشرت، ہماری معیشت، ہمارا تمدن، ہماری سیاست غرض سب کچھ ——— ان اصولوں پر استوار ہو جو اسلام نے مقرر کر دیئے ہیں۔ دوسرا راستہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہم کسی مغربی قوم کے نظام زندگی کو قبول کر لیں۔ خواہ وہ اشتراکیت ہو، لادینی جمہوریت ہو یا کوئی اور نظام زندگی۔

اگر دوسرا راستہ جو مفسدہ ہے، اختیار کیا تو ہم اپنے اسلام کی بحیثیت قوم نفی کریں گے اور اپنے ان تمام وعدوں سے منحرف ہو جائیں گے جو ایک مدت سے ہم خدا اور خلق دونوں کے سامنے کرتے رہے ہیں۔ اس اجتماعی بدعملی کی وجہ سے خدا اور خلق دونوں کے سامنے ہمیں رسوا ہونا پڑے گا۔ پھر اس راستے پر چلنے کا سب سے زیادہ افسوسناک نتیجہ یہ ہوگا کہ برصغیر ہندوستان میں اسلام کی تاریخ کا قطعی خاتمہ ہو جائے گا۔ برعکس اس کے اگر ہم پہلا راستہ اختیار کریں اور خالص اسلامی اصولوں پر اپنی قومی زندگی کی تعمیر کریں تو ہم دنیا میں بھی سرفراز ہوں گے اور آخرت میں بھی ہمارے لیے کامیابی ہوگی۔ ہم خدا کے حضور بھی سرخرو ہوں گے اور خلق کے سامنے بھی ہمارا وقار قائم ہو سکے گا۔ ہم اسلامی نظام زندگی کے علمبردار بن کر پھر اسی مقام پر کھڑے ہو جائیں گے جس پر ہزاروں برس پہلے جب ایک قوم کھڑی ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اسے

مخاطب کر کے ارشاد فرمایا تھا: اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۔ یعنی میں نے تمہیں دنیا
کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی۔ پھر اس کے بعد جب اس مقام خلافت پر ایک دوسری قوم کھڑی کی گئی
تو اسے بتایا گیا: کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ ۔۔۔ اور وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا یعنی
تم بہترین امت ہو اور تمہیں مرکزی امت بنایا گیا ہے۔

ہمارے مسلمان ہونے کا تقاضا

بہرحال یہ دونوں راستے ہمارے سامنے ہیں ان میں سے جس کو بھی ہم منتخب کریں گے
اس کا اثر لامحالہ ہمارے مستقبل اور ہماری قسمتوں اور ہماری آئندہ نسلوں کی قسمتوں پر پڑے گا۔ اس
صورت میں کہ ہم اسلام کے اصولوں کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں اور اپنے نظام حکومت کی تشکیل
اسلام کے نقشے پر کرتے ہیں تو یہ کئی وجوہ سے درست ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے مسلمان
ہونے کا یہی تقاضا ہے۔ مسلمان ہونے کے معنی خدا کا مطیع ہونا ہے۔ اس کا مطلب
یہ ہے کہ اپنی خود مختاری اور آزادی کو اللہ کے حق میں تسلیم (Surrender) کر دیا جائے اور اقرار
کر لیا جائے کہ اب میں جو زندگی بسر کروں گا، خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود اور ضابطوں کے
اندر بسر کروں گا۔ اس کی طرف سے جدھر بڑھنے کا اشارہ ہوگا اُدھر بڑھوں گا، اور جدھر سے
رک جانے کا حکم ہوگا اُدھر سے رک جاؤں گا۔ جس طرح ایک فرد اپنے خدا سے یہ معاہدہ
کر کے اپنی زندگی کو اس کی رضا کے تابع کر دیتا ہے تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے، بالکل اسی طرح
اجتماعی حیثیت سے ایک قوم کے مسلمان ہونے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ وہ اپنی آزادی اور خود مختاری
سے اللہ تعالیٰ کے حق میں دستبردار ہو جائے اور اپنے آپ کو اس کے حدود و قوانین کا پابند بنا
لے۔ یہ ایک عجیب اور غلط بات ہوگی کہ کسی قوم کا ایک ایک فرد تو اپنی اپنی جگہ مسلم ہو، لیکن
جب وہ مل کر ایک اسٹیٹ بنیں تو وہ اسٹیٹ غیر مسلم ہو۔ اگر مجموعہ غیر مسلم ہو تو افراد کس طرح
مسلم ہو سکتے ہیں؟ اور اگر افراد مسلم ہوں تو ان کا مجموعہ غیر مسلم کیوں ہو؟ افراد اگر مسلمان ہوں
اور مسلمان رہنا چاہتے ہوں تو ان کے لیے لازم ہے کہ وہ جب مل کر ایک قوم اور ایک
اسٹیٹ کی شکل اختیار کریں تو وہ قوم اور اسٹیٹ ہونے کی حیثیت سے بھی مسلمان ہوں۔

پاکستان برائے اسلام

پھر جب سلطنتِ پاکستان کا یہی تقاضا ہے کہ ہم یہاں کا نظام اسلامی اصولوں پر
قائم کریں۔ پچھلے دس سال میں بحیثیت قوم ہمارا یہ مطالبہ تھا کہ ہمیں ایک خطۂ زمین مل جانا چاہیے
جس میں ہم اپنی تہذیب و تمدن کا از سرِ نو قائم کرسکیں۔ اور اپنے دین کے اصولوں پر زندگی
بسر کرسکیں کیونکہ ایک غیر مسلم اکثریت کے تحت ہمارے لیے اس طرح کی زندگی
ممکن نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اب سے ڈیڑھ سال پہلے تک اس امر کا کوئی اشارہ نہ تھا کہ
ہندوستان تقسیم ہو جائے گا اور یہاں مسلمانوں کی ایک آزاد سلطنت قائم ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ جو لوگ
آگے چل رہے تھے اور اس مطالبہ کی جدوجہد میں قیادت کا فرض ادا کر رہے تھے، خود ان کو بھی
اس بات کا قطعی یقین نہ تھا کہ پاکستان قائم ہو جائے گا۔ اس کے بعد حالات جس طرح بدلے وہ
پاکستان کے حق میں ہوئے اور جس طرح فضا سازگار ہوتی اور ملک آزاد ہو کر تقسیم ہو گیا، اس کی آپ جو
چاہیں عقلی توجیہیں کریں، لیکن میں اس انقلاب میں ارادۂ الٰہی کو خاص طور پر شامل پاتا ہوں۔
واقعہ و حقیقت یہ ہے کہ صدیوں کے بعد تاریخ میں یہ بات پیش آئی ہے کہ ایک قوم نے کھڑے
ہو کر بحیثیت قوم یہ کہا کہ ہم اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ اور چونکہ غیر مسلم
اکثریت کی حکومت میں ہمارے لیے اس کا امکان نہیں ہے لہٰذا ہمیں ایک آزاد خطۂ زمین
ملنا چاہیے۔ اگر ہمیں یہ آزاد خطہ مل جائے تو اس میں ہم پورے کے پورے اسلام کو غالب
کریں گے۔ خدا کے ہاں یہ بات مقبول ہوئی کہ جب یہ قوم کہتی ہے کہ ہم اسلامی نظامِ حیات
کو اختیار کرنا چاہتے ہیں تو ایک بار اسے اس کا موقع دینا چاہیے۔ ایک مدت سے آپ کو
پامال کیا جا رہا تھا لیکن آپ نے جب یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ اٹھنا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ
نے آپ کے لیے اس کا موقع فراہم کر دیا۔

ایک نازک امتحان

آپ کو یہ موقع ملنا جس طرح ایک نعمت ہے اسی طرح یہ آزمائش و امتحان بھی ہے۔
پاکستان مل جانے کے بعد آپ سب امتحان گاہ میں کھڑے ہیں۔ اب آپ کا اس امر کا امتحان
ہے کہ آپ پچھلے دس سال میں جو کچھ زبان سے کہتے رہے ہیں، کیا فی الواقع آپ کے دلوں میں

بھی وہی ہے، جن باتوں کا آپ اعلان کرتے رہے ہیں، کیا آپ کی نیتیں بھی انہی کے مطابق ہیں، عہد وحلف کے سارے جو اقرار آپ سے لیے ہیں کیا وہ سچے اقرار تھے یا جھوٹے، اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کا جو چرچا آپ نے کیا تھا، کیا وہ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے تھا یا صدق دل سے آپ اپنی زبان سے نکلی ہوئی بات پر عمل کر کے دکھا سکتے ہیں؟ آپ کہتے تھے کہ پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ۔ آپ کہتے تھے کہ ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ اسلام پر پوری طرح عمل کر سکیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے پاکستان دے کر آپ کو آزمائش میں ڈال دیا ہے اور وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آپ سچے تھے یا جھوٹے؟

اسلام کے حفظ و بقا کی واحد صورت

تیسری بات جس کی وجہ سے یہ فیصلہ اور بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے، وہ بہت زیادہ دردناک ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس انقلاب نے جو پچھلے سال ہوا ہے ہمیں ایک نازک مقام پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ ہندوستان کا ایک اچھا خاصا بڑا حصہ اسلام سے اور اسلام کا نام لینے والوں سے بالکل خالی ہو چکا ہے، جس خطے نے کبھی شاہ ولی اللہ اور مجدد الف ثانی جیسے عظیم لوگوں کو جنم دیا تھا، آج وہاں اذان کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ وہاں نہ کوئی اذان دینے والا ہے نہ ذکر الٰہی کا سننے والا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے باقی حصوں میں بھی اسلام بے دردی کے ساتھ مٹایا جا رہا ہے۔ اب وہاں یہ صورت حالات ہے کہ ریل میں سفر کرتے ہوئے یہ پہچاننا مشکل ہے کہ مسافروں میں مسلمان کون ہے۔ بہت سے لوگ جو کل تک اسلام اسلام پکارتے تھے، آج وہ اسلام سے توبہ کر رہے ہیں۔ اب وہاں اگر کوئی مسلمان رہ سکتا ہے تو صرف اسی طرح رہ سکتا ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ اس میں اسلام کی بو بھی باقی نہیں ہے۔ اگر یہی رفتار رہی تو آئندہ چند برسوں میں مسلمان کا وجود ہندوستان میں مفقود ہو جائے گا۔ پہلے مسلمان نے ہندوستان میں جو اسلام صدیوں کی لگاتار کوششوں سے پھیلایا تھا وہ اب تقسیم ملک کے بعد پاکستان کے دو خطوں میں سکڑ گیا ہے۔ اب اگر ہم نے ایک قدم بھی غلط سمت میں اٹھا دیا تو ہندوستان میں اسلام کی ایک ہزار سال کی تاریخ پر پوری طرح پانی پھر جائے گا۔ اس برعظیم ہند کے تین چوتھائی حصے سے تو اسلام دوسروں کے مٹانے سے مٹ رہا ہے۔

پہلیں یہ ہمارے اپنے بنائے ہوں گے۔ اس معاملہ میں ہر قدم خوب سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیئے
اب بہت جلد ملک ہمارے اور اسلام کے ہاتھ میں جاتی ہے۔ اگر ہم نے اس موقع پر ٹھوکر کھائی
تو ہمارے معاشرے کی دینی عمارت کی ساری بنیادیں حرف غلط کی طرح مٹ جائیں گی۔ یہ سب
دہ اس بات کا ہے کہ ہم فیصلہ کر لیں کہ ہمیں اس ملک کے نظام کو بہرحال اسلامی بنیادوں
پر اٹھانا ہے اور یہاں ہمارے ہاتھوں سے جو معاشرتی تعمیر ہوگی وہ اسلام کے منشا
کے مطابق ہی ہوگی۔

موجودہ نظام کو مسلمان بنانے کا طریقہ

اس تقریر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس نظام کو جو پہلے سے ملک میں چل رہا ہے، مسلمان بنانے کا طریقہ کیا ہے؟ کسی نظام کے مسلمان ہونے کا فطری طریقہ بالکل وہی ہے جو ایک فرد کے مسلمان ہونے کے لیے مقرر ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک غیر مسلم فرد کو مسلمان بنانے کے لیے ہم یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ اس کی ظاہری شکل و صورت اور لباس میں کچھ تبدیلیاں کرا دی جائیں اور اسے کہا جائے کہ اپنے کھانے پینے کی فہرست میں سے بعض چیزوں کو نکال دو اور اپنی عادات میں چند تبدیلیاں کرو۔ اور پھر اسے چھوڑ دیا جائے کہ جاؤ اب تم آہستہ آہستہ مسلمان بن جاؤ گے۔ پھر کچھ مدت کے بعد جب وہ غیر مسلم فرد اپنے اندر بہت سی تبدیلیاں کر چکے تو آخر میں اسے کلمہ پڑھایا جائے؟ ——— نہیں ہم ایسا نہیں کرتے۔ بلکہ جب کوئی فرد مسلمان ہونا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اسے کلمہ پڑھایا جاتا ہے اور جب وہ کلمہ پڑھ کے یہ اقرار کر لیتا ہے کہ اب اسے اپنی زندگی مرضی اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں بسر کرنی ہے تو پھر ہم اسے ایک ایک کر کے دین کے احکام بتاتے ہیں اور اس کے اعمال و افعال اور اس کی عادات و اطوار میں تبدیلیاں کرتے ہیں۔ ٹھیک یہی طریقہ ایک نظام حکومت اور نظام ملکی کو مسلمان بنانے کا ہے کہ پہلے اس سے چند بنیادی اصول منوائے جاتے ہیں، اور پھر جب وہ ان اصولوں کو تسلیم کر لیتا ہے تو اس کے سامنے اسلام کے عملی مطالبات تدریجاً رکھے جاتے ہیں اور ان میں وہ ساری تبدیلیاں پیدا کی جاتی ہیں جو دین کو مطلوب ہیں۔

ہمارے ملک کا نظام اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پر قائم ہے جسے

انگریز نے اپنے اصول و مقاصد کے مطابق بنایا تھا۔ انگریز کی حکومت اسلام کی حکومت نہیں تھی، کفر کی حکومت تھی۔ پاکستان میں بھی وہی نظام حکومت اب تک قائم ہے۔ اگرچہ ہم سب مسلمان چھا رہے ہیں لیکن وہ نظام اپنی فطرت کے لحاظ سے کافرانہ ہی ہے۔ اب اس نظام کو مسلمان بنانے کے لیے اگر کوئی بنیادی تبدیلی سب سے پہلے کرنے کی ہے تو وہ یہی ہے کہ جس طرح لوگ مسلمان بننے کے لیے کلمہ پڑھایا جاتا ہے اسی طرح اسے بھی کلمہ پڑھا دیا جائے۔ ایک حکومت کو کلمہ پڑھانے کے لیے جو دستوری طریقہ ہو سکتا ہے اسے ہم نے ایک مطالبہ کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ میں اسے پڑھ کر سناتا ہوں اور پھر اس کی تشریح کروں گا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس اسٹیٹ کو مسلمان بنانے کے لیے پہلا قدم کیا ہونا چاہیے، اور اس کے مطابق کیا جدوجہد کی جانی چاہیے!

دستوری "مطالبہ"

فلک مطالبہ جو اس موقع پر پڑھ کر سنایا گیا، حسب ذیل ہے:

"چونکہ پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتی ہے۔ اور چونکہ پاکستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی ساری جدوجہد اور قربانیاں صرف اس غرض کے لیے تھیں کہ وہ اُن اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔"

لہٰذا

قیام پاکستان کے بعد ہر پاکستانی مسلمان دستور ساز اسمبلی سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کرے کہ:

۱۔ پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور حکومت پاکستان کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی اس کے ملک میں پوری کرے۔

۲۔ پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہے۔

۳۔ وہ تمام قوانین جو اسلامی شریعت کے خلاف اب تک بنے ہوئے ہیں، منسوخ کیے

جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے گا جو شریعت کے خلاف ہو۔

۴۔ حکومت پاکستان اپنے اختیارات ان حدود کے اندر استعمال کرے گی جو شریعت نے مقرر کر دی ہیں۔ *

اس مطالبہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا چاہیے کہ جب کسی ملک کا دستور مرتب کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے بطور اصول موضوعہ یہ طے کیا جاتا ہے کہ کن امور پر اس کا نظام بنتا ہے۔ ابھی آپ کے سامنے ہندوستان کا دستور بن چکا ہے اور وہاں آپ دیکھ چکے ہیں کہ سب سے پہلے ملک کی دستور ساز اسمبلی نے ایک قرارداد مقاصد پاس کر کے ان مقاصد (Objectives) کا تعین کیا ہے جن کے لیے وہاں کی حکومت کام کرے گی۔ ٹھیک اسی طرح پاکستان میں بھی دستور سازی کا پہلا قدم یہی ہو سکتا ہے کہ مقاصد کو طے کر لیا جائے۔ انہی مقاصد کو ہم نے دستوری زبان میں چار نکات کی صورت میں مرتب کیا ہے۔ اب میں ان کی ایک ایک شق کی تشریح کرتا ہوں۔

پہلی شق کی تشریح:

خدا کی حاکمیت

سیاست اور دستور (Constitution) میں بنیادی سوال یہ ہوا کرتا ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) کس کی ہے؟ اگر حاکمیت کسی شخص یا کسی خاندان کے لیے مخصوص کی جاتی ہے تو پھر حکومت کی پوری مشینری اسی شخص یا خاندان کی مرضی کے گرد گھومتی ہے۔ اگر حاکمیت (Sovereignty) ملک کے عام باشندوں کی ہو اور ملک اصلاً خود ملک کے عوام کا ہو تو پورا نظام لامحالہ ان ملک کی مرضی کے گرد گھومتا ہے اور حکومت کے تمام ذرائع اور طاقتیں اس لیے استعمال ہوتی ہیں کہ اہل ملک، یعنی عام لوگوں کے منشا کو پورا کیا جائے۔ یہ ایک بنیادی سوال ہے اس لیے ہم نے سب سے پہلے اسی کو لیا ہے۔ پاکستان کے باشندے چونکہ مسلمان ہیں اس لیے وہ مالک الملک نہیں ہو سکتے۔ ان کے مسلمان ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اپنی حاکمیت اور آزادی سے خدا کے حق میں دست بردار ہو چکے ہیں۔ اب ان کا مقصد زندگی ہی یہ ہے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی میں خدا کی حاکمیت کو تسلیم کر کے اسی کے منشا کو پورا کریں۔

پس مسلمانوں کی قائم کی ہوئی حکومت بھی اسی صورت میں مسلمان ہو سکتی ہے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کو
مالک الملک مان کر اس کی مرضی کو پورا کرنے کا فیصلہ کرے۔

بعض لوگوں نے اس مطالبہ کو یہ شکل دی ہے کہ حکومت یہ اعلان کرے کہ اس کا مذہب
اسلام ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کافی نہیں۔ اس لیے کہ بہت سے ملک ایسے ہیں جنہوں نے اپنے
دستور (Constitution) میں اپنی حکومت کا مذہب اسلام ہی قرار دے رکھا ہے لیکن وہاں
حاکمیت کسی فرد یا خاندان یا عام باشندگان ملک کی ہے۔ ــــ میں کسی ملک کا نام
لینا نہیں چاہتا کیونکہ ہم ایک آزاد قوم ہیں اور ہم کسی بھی ملک سے اپنے تعلقات بگاڑنا
نہیں چاہتے ــــ بہرحال جب تک کوئی حکومت حاکمیت (Sovereignty) کو اللہ
تعالیٰ کے لیے مخصوص نہ قرار دے لے، دستوری حیثیت سے وہ اسلامی حکومت نہیں بن
سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی دستور ساز اسمبلی سے پہلا مطالبہ اسی بات کا کرتے ہیں کہ وہ اللہ
تعالیٰ کی حاکمیت پر ایمان رکھنے کا صاف صاف اعلان کرے۔

دوسری شق کی تشریح:

پاکستان کا بنیادی قانون

دوسری شق پہلی شق کا منطقی نتیجہ ہے۔ چونکہ مالک الملک خدا ہے اس لیے اسی کی
مرضی کو بنیادی قانون کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ اس شق کو مان لینے کے بعد یہاں
کی پارلیمنٹ کا حق قانون سازی محدود (Limited) ہو جاتا ہے اور ہماری اسمبلیوں کے
اختیارات دوسری اسمبلیوں کی طرح غیر محدود نہیں رہتے۔ دوسرے لفظوں میں ہماری
اسمبلیاں خدا کی ہدایت سے آزاد ہو کر کوئی قانون سازی نہیں کر سکتیں، بلکہ ان کے لیے
دستوری طور پر لازم ہو جاتا ہے کہ جو حدود اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر بتا دیے ہیں ان کو
وہ جوں کا توں بے چون و چرا قبول کریں اور ان کو پاکستان کے بنیادی قانون کی حیثیت
سے نافذ العمل کریں۔ رہے وہ احکام جن کی ایک سے زیادہ تعبیریں ممکن ہیں، ان کی مختلف
تعبیروں میں سے کسی ایک تعبیر کو اختیار کرنے کا حق ان لوگوں کو ہوگا جو کتاب و سنت کا علم
اور فہم رکھتے ہوں۔ پھر جن امور کے متعلق خدا اور رسول ؐ نے کوئی واضح احکام نہیں دیئے،

بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے ہم نے اس شق کو بھی اپنے مطالبہ میں شامل کر دیا ہے تاکہ اگر اسلامی حدود سے باہر جا کر کوئی پالیسی اختیار کی جائے تو اس کے خلاف بھی عدالت میں دعویٰ دائر کر کے اسے بدلوایا جا سکے۔

تبدیلی کا نقطۂ آغاز

میرے خیال میں اس تشریح کے بعد "مطالبہ" کا ٹھیک ٹھیک مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ لیکن اسے شریعت کا اسلامی جاننے کے لیے سب سے پہلا قدم یہی ہو سکتا ہے جس کا تقاضا اس مطالبہ میں کیا گیا ہے۔ پس اگر ہم اپنے ملک میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں حکومت سے اس مطالبہ کو منوانا چاہیے۔ اور اگر اس مطالبہ کو مان لیا جائے تو دوسرا قدم یہ ہوگا کہ ایسے اہلِ علم کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ دستور (Constitution) اور قانون (Law) دونوں کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ وہ باہم غور کر کے ایسی دفعات مرتب کر لیں کہ قرآن و حدیث کی رُو سے وہ ارکان سے اصول ہیں جنہیں پاکستان کا بنیادی قانون قرار پانا چاہیے۔ اور خلفائے راشدین کے دور اور ان کے بعد کی مثالیں جو بھی حاصل ہوتی ہیں ان کو نظائر (Precedents) کی حیثیت سے پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ لیکن یہ معاملہ تو بعد کا ہے، اور جب اس کا وقت آئے گا تو یہ بھی ہو جائے گا۔ اس وقت سب سے اہم معاملہ یہی ہے کہ حکومتِ پاکستان اپنے دستور کی زبان سے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرے۔ اس لیے اگر پاکستان کے لوگ فی الواقع یہ چاہتے ہیں کہ یہاں کا نظامِ حکومت اسلامی ہو تو وہ اس مطالبہ کو اپنا مطالبہ بنائیں۔ میرا یا کسی پارٹی کا مطالبہ نہیں ہے۔ اس میں کسی شخص کو نیچا دکھانے، کسی گروہ کو برسرِ اقتدار لانے، کسی کو اقتدار سے ہٹانے یا کسی خاص سیاسی پارٹی کے حقوق منوانے کا کوئی سوال شامل نہیں ہے، بلکہ یہ مطالبہ پوری قوم کا ایک عام اجتماعی مطالبہ ہے۔

مطالبہ کیوں؟

اس مطالبہ کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہاں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا ہے۔ اگر یہ انقلاب اسلامی اصولوں کے مطابق فطری طور پر رونما ہوتا تو اس مطالبہ کی ضرورت

پیش نہ آتی، بلکہ انقلاب کے ساتھ ہی آپ سے آپ اس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو چکی۔
لیکن بد قسمتی سے یہاں ایک عبوری انقلاب کے بعد جتنا اس امر کا امکان ہے کہ یہاں اسلامی
نظام قائم ہو جائے، اتنا ہی اس امر کا بھی امکان ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام اس جگہ پر
مسلط ہو جائے۔ اس لیے اسلامی نظام اب ایک منظم اور پُر زور مطالبے ہی کے ذریعے
قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس مطالبے کے لیے جدوجہد کرنے کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے
کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہم نے اپنی باگیں دے دی ہیں وہ ایک مدت سے متضاد باتیں کہہ
رہے ہیں۔ یہ حضرات کبھی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاکستان حاصل کرنے کا کوئی معنی ہی نہیں
اگر یہاں اسلامی نظام حکومت قائم نہ کیا جائے۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہاں ایک سیکولر جمہوری
سٹیٹ (Secular Democratic State) قائم کیا جائے گا۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہاں
قرآن کی حکومت ہوگی۔ اور کبھی یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہاں سیاسی حیثیت سے نہ ہندو ہندو
ہوگا نہ مسلمان مسلمان، بلکہ سب محض پاکستانی ہو کے رہیں گے۔ پھر اسلامی حکومت کی بھی مختلف
تعبیریں کی جاتی ہیں۔ کبھی اس کی تعبیر یہ کی جاتی ہے کہ یہ انصاف اور مساوات اور اخوت کا
ہم معنی ہے اور کبھی "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ معلوم نہیں اسلامی
سوشلزم کیا چیز ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ خود بھی اس کا مطلب نہیں جانتے۔ کبھی
یہ اسلامی جمہوریت کا بھی چرچا کرتے ہیں۔ ہم ان سے صاف صاف کہے دیتے ہیں کہ اگر
موجودہ نظام جمہوری نظام ہے اور اس میں آپ عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے کام کر
رہے ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ لوگ جس معنی میں اسلامی نظام کے خواہشمند ہیں آپ اسی
معنی میں اسے قائم کریں۔ آپ کو اور کچھ کرنے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔

مطالبہ کرنے کی دوسری وجہ

پھر یہ مطالبہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیارات
دیئے ہیں ان میں سے بعض ان اختیارات کو کسی خلاف اسلام طریق پر استعمال کر رہے
ہیں جو قوم کو اسلام سے ہٹا کر غیر اسلام کی طرف لے جانے والا ہے۔ ان میں سے ایک بڑا
طاقتور گروہ ایسا ہے جو اسلام کے اصولوں پر کوئی واقعی عقیدہ نہیں رکھتا۔ جنہوں نے مغربی

ہوں کو اپنے لیے اور اپنی نسلوں کے لیے پسند کر لیا ہے اور اپنے گھروں کی فضا کو ان کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ جتنے یہ خود بگڑے ہیں، اتنا ہی پوری قوم کو بگاڑ دیں اور اس کام کے لیے وہ ان اختیارات کو استعمال کر رہے ہیں جو قوم نے ان کے ہاتھ میں دیئے ہیں اس بارے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی بے شمار مثالیں دن رات ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ میں اس کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ یہ ہمارے ایک فوجی بھائی کا خط ہے جو اخبار "کوثر" لاہور کے ۹ فروری ۱۹۵۰ء کے پرچے میں، اور "جہان نو" کراچی کی ۱۰ اپریل کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

> دستور پڑھ کر سنایا گیا جس میں فوجی افسروں کے لیے ایک نئی پالیسی کا اصولی نقشہ مذکور تھا۔ جہاں جنگ سے پہلے اور تازہ دم رکھنے کے لیے صحت کے طور پر شراب پی گئی، ماتحت افسروں کو بیویوں کے بے پردہ کرنے کی تلقین کی گئی اور اس کو ترقی منصب کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ "نماز" کو دینی فرائض کے مقابلہ میں موثر رکھنے کے لیے ریمارک دیئے گئے۔)

یہ ایک مثال ہے اور اس قسم کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے روز آرہی ہیں۔ ایک جگہ ایک چپراسی نماز کے لیے گیا تو اُسے ڈانٹا گیا۔ لاہور کے میڈیکل کالج کا واقعہ ہے کہ وہاں کا ایک طالب علم جس نے جوشِ ایمان کے تقاضے سے اپنی صورت مسلمانوں کی سی بنا رکھی تھی، جب کالج میں داخلے کے لیے گیا تو پرنسپل صاحب نے ارشاد فرمایا کہ آپ کے چہرے پر داڑھی ہے، تم کسی مسجد میں جا کر ملا بن جاؤ، کالج سے تمہیں کیا واسطہ؟ "جہان نو" کی ۱۰ اپریل کی اشاعت میں ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گلگت میں نمازیوں پر پابندی لگائی جا رہی ہے۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری فوج کے ان اعلیٰ عہدے داروں کو کبھی کسی جگہ پر بھی اس قسم کے اعتراض کرنے یا اس طرح کی پابندیاں لگانے کی جرأت ہوئی تھی؟ میں نے یہ اخبار جس میں ہمارے فوجی بھائی کا خط چھپا ہے، یہاں کراچی بھیجا، اور دستور ساز اسمبلی کے ارکان کے پاس بھجوایا کہ وہ حکومت سے پوچھیں کہ کیا یہ گورنمنٹ کی پالیسی ہے یا بعض افسرانِ حکومت کی ذاتی روش ہے؟ لیکن

کوئی شخص اس سوال کو اُٹھانے کے لیے تیار نہ ہو سکا۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وہ اس
کی کوئی اہمیت محسوس نہیں کرتے یا کم از کم، سرکاری منصب سے اتفاق کرنا چاہتے
ہیں۔

دلیل صداقت کی ضرورت

پھر اس مطالبے کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ ہم سب مدرسۂ قرآن کے شاگرد
ہیں۔ اگر دلیل سے صداقت معلوم ہوتے تو ایک آدمی کا کہہ دینا کافی ہوتا۔ لیکن یہاں اس
طرح سے منصف واسطے نہیں ہیں۔ یہ کسی بات کو اس وقت تک نہیں مانتے جب تک
اس کے پیچھے قوت نہ ہو۔ ہم نے خود اس مطالبہ کو بھی دستور ساز اسمبلی کے ارکان کے پاس جا کر
حلقات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے، اور ہمیں متعدد سے کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اس کو
قابلِ اعتنا نہیں سمجھا اور کوئی رکن اسے دستور ساز اسمبلی میں خود بحث کے لیے پیش کرنے پر
آمادہ نہیں ہو سکا۔ اس لیے اب ہم اس مطالبہ کو سارے عوام کے سامنے لاتے ہیں۔ اب یہ فیصلہ
آپ کو کرنا ہے کہ آپ کو اسلامی حکومت درکار ہے یا نظامِ کفر؟

متفقہ اور متحدہ مطالبہ

میں مسلمانوں کے تمام گروہوں سے کہتا ہوں کہ یہاں شخصیتوں اور گروہوں کا سوال نہیں
ہے۔ بلکہ ہم سب خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔ اگر ہمارے ہاتھوں سے یا ہماری نگاہوں
کے سامنے یہاں غیر اسلامی نظام قائم ہو گیا تو ہم سب اس کی عدالت میں پکڑے جائیں گے۔
اس لیے آپ اپنے سارے اختلافات کو بھول جائیے۔ آپ اگر آرام سے بیٹھے رہے تو
یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ اس مطالبہ کو منوانے کے لیے تمام ضروری تدابیر اختیار کیجیے اور آپ
کو خوب معلوم ہے کہ کسی مطالبہ کو منوانے کے لیے کیا کیا تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ ابھی ابھی
آپ نے پاکستان کا مطالبہ منوا کر چھوڑا ہے۔ اس سے سبق اُٹھائیے اور جن جن مؤثر
تدابیر کو آپ نے اُس مطالبہ کو منوانے میں استعمال کیا ہے، اُن سب کو نظامِ اسلامی کے مطالبے
کے لیے بھی اختیار کیجیے۔ یہ مطالبہ بھی نہایت ہمت و کوشش چاہتا ہے، یہ بھی منظم اور متحد طاقت
چاہتا ہے اور یہ بھی مال اور وقت اور آرام کی قربانیاں چاہتا ہے۔ مگر ان فوائد کو بھلا کر

کے آپ مطالبہ کر دیں کہ یہ قوم کا اجتماعی مطالبہ ہے تو کس طرح ممکن ہے کہ آپ کے لیڈر اس کے خلاف جائیں۔ آپ اس مطالبے کو لیجیے۔ اس کے لیے ریزولیوشن پاس کیجیے۔ اس کے پوسٹر شائع کیجیے۔ اس اپیل کے نوٹس اور پوسٹروں میں لکھوائیے، بالعموم خود کتابوں کے ٹائٹلوں اور لفافوں پر چھپوا لیجیے تاکہ اس مطالبے کے چار نکات بچے بچے کی زبان پر چڑھ جائیں۔

مسلم لیگی بھائیوں کی ذمہ داری

میں اپنے مسلم لیگی بھائیوں سے کہتا ہوں کہ آپ نے پاکستان اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے بنایا تھا۔ آپ نے سب کچھ اسلام کے نام پر کیا۔ اب آپ آزمائش میں ڈال دیے گئے ہیں۔ اس آزمائش پر آپ پورے اترنا چاہتے ہیں تو اس مطالبہ کو اپنا مطالبہ بنائیے، اسے ابتدائی مسلم لیگوں سے پاس کرائیے، پھر صوبائی مسلم لیگوں کے سامنے یہ مسئلہ لائیے اور جو لوگ اس مطالبے سے متفق نہ ہوں، انہیں لیگ سے باہر نکال دیجیے۔ اب اشتراکیوں اور قوم پرستوں کے مسلم لیگ پر قابض رہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں ہو جائیں تو پھر مسلم لیگ اور جماعت اسلامی میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا بلکہ دونوں قریب قریب ایک ہو جاتی ہیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ کا فرض

میں اپنے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے سے بھی اپیل کرتا ہوں کہ وہ وقت کی نزاکت کو محسوس کریں۔ ان پر اس معاملہ میں بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ کسی ملک کی قوت دولت اور لشکر نہیں ہے بلکہ اس کے سوچنے اور سمجھنے والے لوگ ہی اس کی اصل قوت ہوتے ہیں۔ آپ حضرات قوم کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ آپ کا وزن کس پلڑے میں پڑتا ہے۔ اگر آپ کو اپنے ایمان کے لیے یہ مطالبہ قبول ہے تو ہم آپ کے تمام شکوک و شبہات رفع کرنے کے لیے تیار ہیں اور آپ کو مطمئن کر سکتے ہیں کہ آپ کی، آپ کی قوم کی، بلکہ پوری دنیا کی فلاح اسی میں ہے کہ یہاں اسلامی نظام حکومت قائم ہو۔ اگر آپ اس پر مطمئن ہو چکے ہیں تو آپ کی ساری قوتیں

اس کی تائید میں مزید ہوتی رہی ہیں۔ جیسے پاکستان بننے کا مقصد بھی قوم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوا جب تک آپ نے اپنا سارا وزن اس پلڑے میں نہیں ڈالا۔ اب نظام اسلامی قائم کرنے کا مقصد بھی اسی وقت پورا ہوگا جب کہ آپ اپنا پورا وزن اس پلڑے میں ڈال دیں گے۔

علماء و مشائخ سے گزارش

میں علماء اور مشائخ سے بھی کہتا ہوں کہ براہ کرم جزوی اختلافات کو چھوڑ دیجئے اور اپنی ساری کوششیں اس کام پر مرکوز کر دیجئے۔ اگر یہ اصلاح ہو گئی تو سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی ملک میں غیر اسلامی نظام نافذ ہوتا ہے تو ایک ایک کر کے اس میں سے اسلام کے سارے نشانات مٹتے جاتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں ایک ملک ایسا بھی ہے جس نے مسلمان ہوتے ہوئے حج کو برسوں ممنوع رکھا۔ قرآن کے قوانین کو منسوخ کر کے ان کے بجائے دوسرے قوانین بنائے۔ قرآن مجید نے عورت کا حصہ وراثت میں مرد سے آدھا رکھا ہے اس نے ازروئے قانون عورت کا حصہ مرد کے برابر کر دیا۔ ہمارے ملک میں اب تک اسلام سے جو رعایات روا رکھی گئی ہیں اور جو نرمی کا سلوک اس سے کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں ایک غیر قوم کی حکومت تھی اور اس کی مصلحت اسی میں تھی کہ وہ مذہب کے معاملہ میں دخل نہ دے۔ لیکن اگر آپ کے اپنے ہاتھوں سے یہاں لادینی حکومت قائم ہو گئی تو پھر اسلام کا نشان اس ملک میں باقی نہ چھوڑا جائے گا۔ کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ اسی دنیا میں ایک مسلمان ملک کی حکومت ایسی بھی ہے جس نے لادینی نظام قائم کرنے کے بعد دینی تعلیم کو قانون کی طاقت سے حرام کر رکھا ہے۔ اس لیے آپ اپنے جزئیات اور فروعات کو بھول جائیے اور ساری قوت اس کام پر یعنی اس بنیادی اصول کو منوانے پر صرف کر دیجئے کہ یہاں کا نظام اپنی بنیادی فطرت کے لحاظ سے صحیح معنوں میں اسلامی ہوگا۔

یہ جو کبھی کہا جاتا ہے کہ شراب بند کی جائے، کبھی یہ کہ زنا کے اڈے اٹھا دیئے جائیں ـــــ تو یہ کام تو انگریزی حکومت بھی کرتی رہی ہے۔ کیا ان کاموں کے کرنے

سے کوئی حکومت اسلامی حکومت ہو جائے گی؟ پھر کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک بیت المال قائم کیا جائے جس میں زکوٰۃ کی وصول اور صرف کا انتظام کیا جائے۔ لیکن یہ تو وہ حقوق ہیں جو کبھی ہم نے اپنی اسلامی حکومتوں میں بسنے والے ذمیوں کو دیے تھے، اور جو اب بھی رومانیہ اور یوگوسلاویہ، بلکہ روسی ترکستان تک کی حکومتوں نے اپنی مسلمان رعایا کو دے رکھے ہیں۔ کیا ان باتوں سے کوئی نظام حکومت اسلامی نظام میں بدل جاتا ہے؟

جزئی مطالبات چھوڑ دیجیے

ہم تو وہ حکومت چاہتے ہیں جس کی ساری اسمبلیاں اور وزارتیں، نظام تعلیم اور نظام عدالت اور پورے کا پورا مالیاتی نظام اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ بیت المال تو ملاؤں کی تحویل میں رہے اور سلطنت کا نظام غیر اسلامی ہاتھوں میں رہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ملک کا پورا خزانہ اسلامی بیت المال میں بدل جائے۔ لہٰذا براہ کرم آپ حضرات چھوٹی چھوٹی چیزیں نہ مانگیے، ورنہ ایسی دو ایک چیزیں دے کر آپ کو مطمئن کر دیا جائے گا۔ پھر اگر آپ اس کے بعد کوئی اور جزئی مطالبات سامنے لائیں گے تو کہا جائے گا کہ یہ ملا لوگ نہایت ناشکرے ہیں، ان کے مطالبات کبھی ختم نہ ہوں گے اور یہ ملک کی ترقی اور استحکام کے راستے میں خواہ مخواہ روڑے اٹکاتے رہیں گے۔ پس آپ اپنی ساری قوت اس بنیادی مطالبے کے منوانے پر صرف کیجیے جس کے اندر آپ کے سارے مطالبات مضمر ہیں۔

سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو تنبیہ

اب میں کچھ باتیں اپنے ملک کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے کہنا چاہتا ہوں۔ آپ حضرات نے ناجائز طریقوں سے جو کچھ سمیٹ رکھا ہے، اسے تو اب بہرحال چھوڑنا ہے۔ سرمایہ دارانہ طور طریقوں کا اب زمانہ نہیں رہا۔ اب وہ پچھلا زمانہ ختم ہو رہا ہے جب صدیوں کی محنتوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور اسراف اور عیاشی کی زندگی کے لیے دوسروں کا گلا گھونٹنے میں سے سر اٹھانے کے زور پر اپنے حق سے زائد وصول کرنے کا سلسلہ بہرحال ختم ہونا ہے۔ اس چیز کو ختم کرنے کے لیے آپ دو طریقوں میں سے ایک طریقہ پسند کر لیجیے۔ ایک طریقہ ہے جو

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ہمارے ملک کی حکومت کے لیے ایک ایسا دستور بنایا جائے جو سو فیصدی اسلامی ہو لیکن اس کی پشت پر اسلامی ذہن نہ ہو تو وہ اسلامی دستور کا کوئی حقیقی نتیجہ نہیں نکل سکتا اور نہ اس کے بل پر اسلامی نظام چل سکتا ہے۔ کوئی دستور محض کاغذ کے اوراق پر نہیں چل سکتا۔ بلکہ اس کا نفاذ اور اس کا کامیاب ہونا اس بات پر موقوف ہوتا ہے کہ ملک کے عوام کی کتنی منظم طاقت اس کو چلانے کا عزم رکھتی ہے۔ اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ جو لوگ اسلام کو اپنے دین اور مسلک زندگی کے طور پر پسند کرتے ہیں وہ ہمارا ساتھ دیں اور دین کی خدمت کے لیے منظم ہوں۔

اب میں ان عذرات کو رفع کرنے کی کوشش کروں گا جو وہ طبقہ ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے جو اسلامی نظام کو پسند نہیں کرتا اور اس کے قیام کا مخالف ہے۔

استحکام پاکستان کا عذر

ہم سے کہا جاتا ہے کہ نوزائیدہ حکومت ابھی بنی ہے، قوی بھی نہیں ہے۔ سرحد پر چاروں طرف سے خطرہ ہے۔ بس اس وقت ساری طاقت پاکستان کو مضبوط کرنے میں صرف ہونی چاہیے اور اسلامی حکومت کی بحث کو ملتوی رکھنا چاہیے۔

میں کہتا ہوں کہ پاکستان کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنا ہر اس شخص کا فرض ہے جو اس میں رہتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان کے لیے اصل خطرہ کہاں ہے؟ ـــــــ اس کے اندر یا باہر؟ میں کہتا ہوں کہ اصل خطرہ باہر سے نہیں، بلکہ اندر سے ہے۔ اس لیے کہ اس کشتی کے ملاح دن رات اس میں چھید کرتے رہتے ہیں۔ ان کی رشوت خوری اور خورد بردیاں پاکستان کو مسلسل کمزور کر رہی ہیں۔ میں نہایت افسوس کے ساتھ یہ بات عرض کرتا ہوں کہ جو حرکات یہ لوگ خود کر رہے ہیں انہیں دیکھ دیکھ کر اکثر مسلمان یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ اگر پاکستان میں یہی کچھ ہونا تھا تو ہم ہندوستان ہی میں کیا برے تھے۔ بلکہ بعض مظلوم جا بجا یہ سوال کرتے پائے گئے ہیں کہ کیا پاکستان ان ہی مقاصد کے لیے بنایا گیا ہے؟ یہ چیزیں ہمارے عوام کا دل توڑنے والی اور ان کے جذبات کو سرد کرنے والی ہیں۔

پاکستان کو مضبوط بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ایک ایک ادنیٰ اور ایک ایک فوجی سپاہی کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ جب وہ لڑے گا تو اصل دین کے

لیے نہیں، بلکہ خدا کے لیے ڈٹے گا اور اپنی جان دے گا۔ وہ قوم کے کچھ لیڈروں اور عہدیداروں کے لیے نہیں، بلکہ خدا کے دین کے لیے دے گا۔ اگر آپ اپنے ہر سپاہی کو اس بات پر مطمئن کر دیں کہ تیری خدمات صرف اسلام کے لیے حاصل کی گئی ہیں تو پھر دیکھیے کہ وہ کس جرأت اور دلیری سے لڑتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں اور اپنے سپاہیوں کے دلوں کو اطمینان دلانے کی اس کے سوا کوئی اور تدبیر نہیں رکھتے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کا صاف صاف دستوری اعلان کر دیں۔ پھر کون معقول آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ جو چیز ہم پیش کر رہے ہیں وہ پاکستان کو مستحکم کرنے والی ہے اور اس کے استحکام ہی کے لیے اس کو اپنائے جانے کی ضرورت ہے۔

انتشار انگیز عصبیتیں

پاکستان کو مستحکم کرنے کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مختلف عناصر اور مختلف صوبے متحد ہو کر ایک بنیانِ مرصوص بن جائیں۔ لیکن جن اصولوں پر ہمارے ہاں ملک کا کام کر رہے ہیں ان کا فطری نتیجہ یہ نمودار ہو رہا ہے کہ ہر گروہ جو اپنا کوئی مختلف مفاد رکھتا ہے وہ ایک جداگانہ عصبیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ بے اصول قومی وحدت پیدا کرنے والی مغربی سیاست کے زہر کا اثر ہے کہ اب ایک پاکستان میں ایک مسلمان قوم نہیں بلکہ پانچ علاقائی قومیں بن گئی ہیں: سندھی، بلوچی، پنجابی، افغانی اور بنگالی! ان سب کو یکجا کر کے بنیانِ مرصوص صرف اسلام ہی کے ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔

پھر یہاں "انصار" اور "مہاجرین"[1] کی باہمی کشمکش کے سبب سے ان کے دو الگ الگ نظام بن رہے ہیں اور دو الگ الگ ریاستیں رونما ہو رہی ہیں۔ اور اگر حالات اسی رفتار پر رہے اور ان کا کوئی سدِّباب نہ کیا گیا تو یہ مسئلہ بھی پاکستان کے لیے ایک مستقل خطرہ بن

---

[1] یہ الفاظ طنزیہ استعمال کیے گئے ہیں۔ ورنہ سندھی اصحاب کے لحاظ سے مقامیوں نے کبھی "انصار" کا سا طرزِ عمل اختیار کیا اور نہ چند مستثنیات کے سوا آنے والوں نے مہاجرین کا سا رویہ، و ... باستثناء اللہ ... وغیرہ۔

کے مترادف سمجھا۔ آپ اس وقت کے خطرہ کا اندازہ کیجئے کہ مشرقی پنجاب سے لٹی ہوئی ایک جماعت کو جب مغربی پنجاب کی سرحد پر آباد کیا گیا تو وہاں کے مقامی باشندوں نے سکھوں کے دھوکے سے ان پر حملہ کیا۔ یہ متضاد عناصر پاکستان کے لیے اس وقت تک خطرہ ہیں جب تک ان کے درمیان عصبیتیں کام کرتی رہیں۔ ان کو اگر باہم جوڑا جا سکتا ہے تو اسلامی نظام کی فضا میں اسلامی اصولوں کے ذریعہ ہی جوڑا جا سکتا ہے۔ ورنہ ان کے ہر وقت متصادم ہو جانے کا امکان ہے۔

مسئلہ مہاجرین کا واحد حل

اگر پاکستان حاصل ہونے سے پہلے جلسے پیشتر سے قوم کے اخلاق کی یہ تعمیر اسلامی اصول پر کر لی ہوتی تو مہاجرین واقعی "مہاجرین" ہوتے اور انصار واقعی "انصار"۔ پھر ان کا مسئلہ حل کرنے میں ہمیں وہ مشکلات پیش نہ آتیں جو آج کل درپیش ہیں۔ قوم میں اسلامی روح بیدار ہوتی تو یہاں کے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر مشرقی پنجاب کے مظلوموں کا استقبال کرتے، اپنی زمین پر بٹھاتے اور اپنے بستر اور چارپائیاں ان کے حوالے کر دیتے۔ یہ مسئلہ کوئی آج ہی ہمارے سامنے نہیں آیا۔ اس سے پہلے بھی آ چکا ہے۔ مدینہ کی چھوٹی سی بستی نے مکہ اور عرب کے مختلف قبائل کے مہاجرین کی ایک کثیر تعداد کو اس طرح سمو لیا تھا جذب کیا کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی کہ اہل مدینہ کو کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہے۔ حالانکہ اس زمانے میں تمدنی ذرائع و وسائل بہت ہی ابتدائی حالت میں تھے۔ وہاں بھی اس مسئلہ کو اسلامی سیرت اور اسلامی اخلاق نے حل کیا تھا اور یہاں بھی اس گتھی کا واحد حل یہی ہے۔

اب یہ بات ہر شخص کے غور کرنے کی ہے کہ پاکستان کو کمزور کرنے والی شے وہ ہے جسے ہم پیش کرتے ہیں یا وہ ہے جو اس کے خلاف کی جا رہی ہے؟

ہندوستان میں ہندو حکومت کے قیام کا خدشہ

مجھ پر اعتراض پیش کیا جاتا ہے کہ اگر یہاں اسلامی حکومت قائم کر دی گئی تو ہندوستان میں ہندو حکومت قائم ہو جائے گی۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہندوستان میں ہندو حکومت قائم نہیں ہو گی؟ یہ اندیشہ کیا جاتا ہے کہ انڈین یونین کی حکومت لامذہبی نہیں ہے اور اس میں سب کو

نہ صرف یہ کہ ریکارڈ ہے بلکہ خود غیر مسلم حضرات کے متعدد اعترافی خطوط ہم تک پہنچے ہیں اور ہندوستان جانے والے غیر مسلموں میں سے ہزاروں اس کی گواہی دیں گے۔

اسلامی حکومت کی گارنٹی

اسلامی حکومت کی صورت میں یہاں جو گارنٹی دی جائے گی وہ ہماری طرف سے نہیں، بلکہ خدا اور رسول ﷺ کی طرف سے ہوگی۔ حضور ﷺ کے الفاظ ہیں کہ جو ذمی پر ظلم کرے قیامت کے روز میں خود اس کے خلاف مدعی ہوں گا اور وہ جنت کی بو بھی نہ سونگھے گا۔ پھر حضور ﷺ کی آخری وصیت میں جہاں نماز اور غلاموں کے حقوق کی تاکید تھی، وہاں ذمیوں کے حقوق کی ادائیگی کا بھی حکم تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ جب مسلمان فوج ایک جگہ سے پسپا ہونے پر مجبور ہوئی تو انہوں نے غیر مسلموں کو ان کے ٹیکس واپس کر دیئے کہ ہم نے یہ ٹیکس آپ کی حفاظت کی ذمہ داری کے معاوضہ کے طور پر لیے تھے اور چونکہ اب ہم حفاظت کی ذمہ داری پوری کرنے سے قاصر ہیں، اس لیے اس رقم پر بھی اب ہمارا کوئی حق نہیں رہا جو تمہاری حفاظت کے لیے لی گئی تھی۔ میں غیر مسلم بھائیوں سے کہوں گا کہ یہ نظام آپ کے لیے رحمت ہوگا، آپ اس کے قائم کرنے میں ہمارا ساتھ دیجیے اور ہمیں مدد پہنچائیے۔ اسلامی نظام میں آپ کے لیے مغربی طرز کی سیاسی جمہوریت کے مقابلے میں کہیں زیادہ برکات ہیں کہ اگر آپ کو ان کا اندازہ ہو تو آپ مغربی جمہوریت کی مخالفت اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر کوشش کریں۔

دنیا کی رائے عامہ کے بگڑ جانے کا ہول

یہ خدشہ بھی کیا جاتا ہے کہ اگر ہم نے مذہبی حکومت قائم کی تو دنیا کی رائے عامہ ہمارے متعلق خراب ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی وجہ سے ہمیں اپنے اسلام پر شرمانا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ ہمیں اسلام پر اتنا بھی ایمان نہیں جتنا روس میں مٹھی بھر کمیونسٹوں کو کمیونزم پر تھا۔ وہ لوگ جب جنگ سے نکلے تھے تو ملک کی معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی، سارا نظام درہم برہم تھا، ملک چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا تھا، فوج شکست خوردہ اور صنعت و حرفت خستہ حال تھی، اور یہ واضح تھا کہ اشتراکی نظام کے قیام کے ساتھ ہی دنیا کی ساری سرمایہ دار طاقتیں اس کی دشمن ہو جائیں گی۔ لیکن ان ساری باتوں کے علی الرغم انہوں نے یہ نظام قائم کیا اور اب ہر سرمایہ دار

طاقت اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ ہمیں دوسروں کی طرف نہیں، اپنی طرف دیکھنا چاہیے کہ ہمارے مسلمان ہونے کا تقاضا کیا ہے۔ ہمیں اس تقاضے کو پورا کرنا چاہیے۔ دنیا کی رائے عام اسلام اور مسلمانوں کے متعلق خراب ہوئی ہی اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اسلام کو میدانِ عمل سے باہر رکھ کر اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے روشناس کرایا ہے، چنانچہ اسلام بھی منفعل بن گیا اور مسلمان بھی۔ لیکن اب اگر ہم اسلام کو میدانِ عمل میں لا کر اسے پوری طاقت سے پیش کریں تو دنیا کی رائے عام متعلق طور پر اسلام کے بارے میں بھی درست ہو جائے گی اور ہم مسلمانوں کے بارے میں بھی۔ ہو سکتا ہے کہ لوگ ایک دو سال تک غلط فہمیوں میں مبتلا رہیں، لیکن دو چار سال کے بعد ہمارے متعلق اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوں گے اور تسلیم کریں گے کہ لوگ تو ہم سے رہنمائی لینے کے قابل ہیں کیونکہ ان کے پاس وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر ایک جہانی ریاست (World State) بن سکتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے تجربے کو دیکھ کر ان کے دل اس کی طرف کھنچنے نہ شروع ہو جائیں۔

"ملّاؤں" کی حکومت کا شبہ

ایک شبہ تو یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت تو "ملّاؤں" کی حکومت ہوگی اور "ملّا" دنیا کے معاملات کو کیا جانیں۔ میں اس شبہ کے پیش کرنے والوں کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم جیسے لوگ جو اس میدان میں بھی نکل چکے ہیں، پاکستان میں اب جو لوگ اسلامی نظام کے مطالبے کو لے کر اُٹھے ہیں وہ "ملّا" نہیں ہیں بلکہ آپ کی طرح دنیا کے معاملات کو بھی خوب سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ قرآن و حدیث کو بھی! —— اسلامی حکومت کے مطالبے کو اٹھانے والے لوگ جدید فلسفۂ سیاست کو بھی آپ سے بہتر طور پر سمجھنے والے ہیں اور قرآن کے فلسفۂ سیاست سے بھی کچھ نابلد نہیں ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اسلامی حکومت اگر قائم ہوگی تو اسے چلانے کیلیے ایسے ہی آدمی مطلوب ہوں گے جو موجودہ دور میں اسلامی اصول پر کام کر سکیں۔ ہمیں ملک کے باشندوں اور رائے دہندوں کو بتانا پڑے گا اور اس بارے میں ان کی ذہنی تربیت کرنی ہوگی کہ وہ اسلامی حکومت کے لیے کیسے آدمی فراہم کریں۔ اگر کہیں مسجد کے انتظام کیلیے آدمی مطلوب ہوں تو لوگ ویسے ہی آدمی تلاش کر کے دیں گے، اور اگر سینما کے انتظام کیلیے ملازمین درکار ہوں تو وہ بھی آدمی ان کے سامنے آئیں گے اور ایک بینک کا انتظام چاہا ہو تو اس کی صفات رکھنے والے آدمی ہی چنے جائیں گے۔ اسی طرح اگر اسلامی حکومت کو چلانے کے لیے کارکنوں کی